سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند) — ۱۴۶

تذکرۂ شُعرائے اُردو

مؤلّفہ

میر حسن دہلوی مصنّف مثنوی "بدرِ مُنیر"

مع مقدّمہ نوشتہ

نوّاب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرّحمٰن خاں صاحب شروانی

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

سنہ ۱۹۴۰ع

طبع جدید

ایک ہزار

انجمن کی چند دوسری کتابیں

معلومات سائنس اس کتاب میں سائنس کے نہایت اہم مسائل مثلاً حیاتین، جراثیم، متعدّی امراض، برقی ایجادات، ریڈیم، لاشعاعیں، لاسلکی، دوربین، فلم سازی، نظریۂ اضافیت وغیرہ کو نہایت سلیس اور سلجھی ہوئی زبان میں پیش کیا گیا ہے اور اکابرین سائنس مثلاً گلیلیو، کوپرنکس، نیوٹن، فیرڈے، ایڈیسن، پاسیتو، جے۔سی۔بوس، میڈم کوری، مارکونی اور آئن شٹائن کی کہانی بڑے دلچسپ اور شگفتہ انداز میں بیان کی گئی ہے۔ اس کتاب کی تصویریں حیدرآباد کے مشہور مصوّر عبدالقیوم صاحب نے لیتھو میں ایک خاص طریقے سے تیار کی ہیں۔ یہ تصویریں حسن کاری کا ایک عمدہ نمونہ ہیں جس کی مثال مشکل سے دوسری جگہ ملے گی۔ یہ اردو زبان میں اپنے انداز کی پہلی کتاب ہے۔ سہ رنگا جیکٹ۔ قیمت مجلّد ایک روپیہ بارہ آنے۔ بلاجلد ایک روپیہ آٹھ آنے۔

حیات کیا ہے؟ حیات (جان) کے متعلق علمائے سائنس و علمائے حیاتیات کے خیالات و تجربات کا ایک بیش بہا ذخیرہ انگریزی، جرمنی، فرانسیسی اور دیگر زبانوں میں موجود ہے لیکن جہاں تک اُردو زبان کا تعلق ہے اس میں اس قسم کی کتابیں بہت کم ہیں۔ انجمن نے اس کمی کو محسوس کر کے یہ کتاب تیار کروائی ہے۔ اس میں حیات کی ابتدا اور اس کے ارتقا کو سلیس زبان میں بیان کیا گیا ہے اور وضاحت کے لیے بہت سی رنگین و سادہ تصاویر اور اشکال دی گئی ہیں۔ اُردو خواں حضرات و طلبہ کے لیے بہت مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت مجلّد ایک روپیہ دس آنے۔ بلاجلد ایک روپیہ چھ آنے۔

ارتقا مؤلفہ مولوی مشتاق احمد وجدی صاحب۔ اس میں مسئلہ ارتقا پر سائنس اور فلسفہ دونوں اعتبار سے عالمانہ بحث کی گئی ہے حجم ۵۰۱ صفحات، قیمت مجلّد ایک روپیہ چھ آنے، بلاجلد ایک روپیہ

القمر قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت کے بعد چاند کے متعلق جو جدید انکشافات ہوئے ہیں، ان سب کو جمع کر دیا ہے۔ طرز بیان دلچسپ ہے۔ حجم ۷۲ صفحے۔ قیمت بلاجلد دس آنے۔ مجلّد ایک روپیہ۔

سلسلۂ مطبوعات — ۱۴۶

تذکرۂ شعرائے اُردو

مؤلّفہ

میر حسن دہلوی مصنّفِ مثنوی "بدرِ مُنیر"

بہ تصحیح و تنقید

جناب مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی

شائع کردہ

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

طبع جدید — سنہ ۱۹۴۰ء — ایک ہزار

قیمت مجلّد ایک روپیہ چودہ آنے — بلا جلد ایک روپیہ چھ آنے

خانصاحب عبداللطیف نے "لطیفی پریس لمیٹڈ" دہلی میں چھاپا

اور

منیجر انجمن ترقّی اُردو (ہند) نے دہلی سے شائع کیا

مُقدّمہ

تذکرۂ شعرا مؤلفۂ میر حسنؔ دہلوی

"بدر منیر" نے میر حسن دہلوی کے نام کو آسمانِ شہرت پر مہرِ منیر بنا کر روشن کیا۔ روشنی طبع نے میر صاحب کو یہ مضمون پہلے ہی سجھا دیا تھا۔ مثنوی کی نسبت کہتے ہیں ؎

رہے گا جہاں میں مرا اس سے نام
کہ ہے یادگارِ جہاں یہ کلام

"مثنوی میر حسن" کو جو قبولِ عام نصیب ہوا شاید ہی اُردو کی کسی کتاب کو نصیب ہوا ہو۔ جو پڑھ سکتے تھے، اُنھوں نے پڑھی۔ جو نہیں پڑھ سکتے تھے، اُنھوں نے پڑھوا کر سُنی۔ جاہلوں کا بھی یہ عالم رہا کہ جو دو چار شعر یاد تھے، اُن کو پڑھتے تھے اور سر دُھنتے تھے۔ چاندنی رات میں ماہِ کامل کی روشنی بہت سے ستاروں کو نگاہ سے اوجھل کر دیتی ہے یہی حال "بدر منیر" کی آب و تاب کے سامنے میر حسن کے باقی کلام کا ہوا۔ آب حیات میں آزاد نے لکھا ہے "دیوان اب نہیں ملتا" "تذکرہ" بھی طاق نسیان کی نذر ہو چکا تھا۔ بالآخر وقت آیا کہ کلامِ حسنؔ کا حُسنِ سادہ رونمائے عالم ہو۔ اہلِ ادب کو مژدہ کہ "انجمن ترقی اُردو" کلیات اور تذکرہ دونوں کی اشاعت پر آمادہ ہے۔ اوّل تذکرے کی یاد ہوئی ہے۔

تذکرۂ شعرا یہ تذکرہ میر حسن نے اُس زمانہ میں لکھا ہے جب کہ دلّی کو خیرباد کہہ کر فیض آباد میں سکونت پذیر تھے، چنانچہ خود اپنے حال میں لکھتے ہیں۔ "شروع جوانی

از گردشِ روزگار...... بطرف لکھنؤ و فیض آباد رسیدم" تذکرہ ہذا میں میر صاحب نے جو فہرست اپنی تصانیف کی لکھی ہے، اُس میں "مثنوی رموز العارفین" ہے "گلزارِ ارم" نہیں ہے۔ رموز العارفین کا سالِ تصنیف ۱۱۸۸ھ ہے اور گلزارِ ارم کا ۱۱۹۲ھ۔ رموز العارفین کی نسبت لکھا ہے کہ وہ مشہور ہو چکی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ تذکرہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا گیا اور آج اُس کی تالیف کو ڈیڑھ سو برس کا زمانہ گزر چکا۔ رسمِ قدیم کے مطابق یہ تذکرہ فارسی زبان میں بہ رعایت حروفِ تہجّی لکھا گیا ہے۔ ہر ردیف میں تین دوْر قائم کیے ہیں۔ متقدّمین، متوسّطین، متاخّرین۔ "دوْرِ متقدّمین" فرخ سیر سے پہلے۔ اس دوْر میں زبانِ ریختہ کا رواج زبانِ دکن سے ہوا۔ "دوْرِ متوسّطین" آخر عہدِ فرخ سیر سے ابتدا و عہدِ محمد شاہ تک۔ "متاخّرین" اس کے بعد سے زمانۂ تالیف تذکرہ تک اب سب متقدّمین ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔

یہ تذکرہ شاہد ہے کہ مؤلّف کو عبارت آرائی و رنگیں بیانی میں عمدہ دستگاہ حاصل تھی۔ وہ سادہ و پُر زور طرزِ عبارت جو میر تقی میرؔ کے تذکرہ کی ہے اس میں نہیں۔ میرؔ کی یہ ادبی قوت خانِ آرزو کی تربیت کا ثمرہ تھی۔ ایک مثال سُن لو۔ میر تقی ایک موقع پر لکھتے ہیں۔ "خوش تقریر بمرتبہ ایست کہ در تحریر نگنجد" میر حسنؔ اسی موقع پر کہتے ہیں "خوش تقریر بمرتبۂ ایست کہ در تحریر و تقریر نگنجد" ارباب ذوقِ سلیم نے محسوس کیا ہوگا کہ ایک لفظ کے اضافہ نے زورِ کلام کم کر دیا۔

اس تذکرہ کے زمانۂ تصنیف کی ایک خاص خوبی ہے اور وہ یہ کہ وہ ایسے زمانہ میں تصنیف ہوا ہے کہ دوْرِ سوم ختم اور دوْرِ چہارم شروع ہو رہا تھا۔ اس طرح مؤلّف نے دونوں دور کے شعرا کے چشم دید حالات قلمبند کیے ہیں۔ میرؔ، سوداؔ، خواجہ میر دردؔ اور حضرت میرزا مظہر کو دیکھا، اسی کے ساتھ مصحفیؔ، انشاؔ اور جراْتؔ کو۔ دوْرِ سوم اور دوْرِ چہارم کے طرزِ کلام کا ڈانڈا جہاں ملا ہے، وہ اس تذکرہ کے انتخابی اشعار سے بخوبی واضح ہے۔

خوبی خاص یہ ہے کہ ایک پاکیزہ مذاق اُستاد کا قلم نکتہ سنجی کے ساتھ انصاف کی داد دے رہا ہے۔ اسی لیے اہلِ کمال کے خط و خال اس آئینہ میں ہو بہو ہویدا ہیں۔

اگرچہ عبارت کا معتد بہ حصہ رنگ آمیزی کی نذر ہو جاتا ہے تاہم ہمعصرانہ قیمتی معلومات بھی قلم سے نکلتی جاتی ہیں جس سے شاعر کے اندازِ کلام، طرزِ زندگی اور صورت وشکل پر معنی آفریں روشنی پڑ جاتی ہے۔ مثلاً میر تقی کے حسب ذیل ضروری حالات زیر نظر آجاتے ہیں۔ اُن کا "خان آرزو" کا بھتیجا اور شاگرد ہونا۔ وطن اکبر آباد۔ اس تذکرہ کی تحریر کے وقت میر تقی کا سن ساٹھ برس کا تھا اور دلّی میں مقیم تھے۔ جوان محمد شاہی تھے۔ میر تقی کا "تذکرۂ متقدمین و معاصرین" یادگارِ زمانہ تھا۔ رباعی، غزل، قصیدہ، ہجو، مدح سب پر قدرت ہے۔ گرم بازاری کمال غزل کی وجہ سے تھی، جس کی شان یہ تھی کہ "بسیار بانداز و طرز از و می تراود"۔ میر صاحب کا صاحبِ دماغ ہونا "بسیار صاحب دماغ ست و دماغ اد می زیبد"۔ عبارت آرائی میں یہ فقرہ بھی ہے۔ "شعرش چوں دُرِ خوشاب و انداز سخنش بے حساب"۔

سوداؔ۔ حالات و صفات۔ مولد شاہجہاں آباد۔ تحریر تذکرہ کے وقت سن کا اندازہ ستّر برس کا تھا۔ نوکری پیشہ۔ سرکار نواب شجاع الدولہ میں بسلسلۂ شاعری سرفراز تھے۔ علم موسیقی میں مہارت تھی۔ میر حسن اکثر اُن کی خدمت میں جاتے تھے اور وہ بہت کرم فرماتے تھے۔ خوش خلق، نیک خو، یار باش تھے۔ شاعری کی زندگی اُن کی ذات سے وابستہ تھی۔ طرزِ سخن؛ "میدانِ بیانِ او وسیع۔ طرز معانی او بدیع ... ... در قصیدہ و ہجو ید بیضا دارد۔ قصائدِ عذب دلاویز و بیانِ ہجو بلند۔ نظمش طرب انگیز"۔

سوزؔ۔ حالات و صفات۔ سیّد ضیاء الدین بخاری کے بیٹے۔ قطب عالم گجراتی کے خاندان سے۔ فقیہہ، درویش منش، خوشنویس، دانشمند، فطرت نہایت بلند، علوم تیر اندازی میں ایک رسالہ زوردار لکھا تھا۔ رنگِ زمانہ سے بددل ہوکر گوشہ نشین تھے۔ اشعار اس خوبی سے پڑھتے تھے کہ بیان میں نہیں آسکتے۔ طرزِ سخن "در عہدِ خود از جملہ ادابنداں ممتاز۔ طرزِ ادائیہ ملک اوست"۔

جرأت - حالات وصفات - وطن اصلی شاہجہاں آباد - مقامِ نشو و نما فیض آباد -
میاں حسرت کے شاگرد جوان چیچک رُو - خوش خُلق - نیک" دریں نوجوانی ببسیار حِلم و حیا بسر
می برد" فن موسیقی اور ستار نوازی میں ایک حد تک قدرت طبیعت بہت دردمند اور گداز -
شوقِ شعر حدِ جنوں تک پہنچا ہوا کہ کسی وقت فکرِ سخن سے خالی نہیں - طرزِ سخن" کلامِ نمکین بہ بیانِ
شیریں - گلزارِ معانیش چوں میوۂ آرزو شاخ در شاخ" اس تذکرہ کا نام مؤلف نے نہیں لکھا -

مؤلفِ تذکرہ کے حالات | مسلمانوں کے عہدِ حکومت نے جن شہروں کو نازو نعمت کا مخزن
اور علم و کمال کا معدن بنایا تھا، اُن میں خراسان کا دارالسلطنت ہرات بھی تھا یہی مُردم خیز شہر
میر حسن کے خاندان کا بھی وطن تھا - میر اِمامی وہاں سے ہندوستان میں آئے جو میر حسن کے
پردادا تھے، ہفت قلم تھے اور فاضل متبحر - بلحاظ علم و فضل دلّی میں آکر ہمسروں میں امتیاز
حاصل کیا - شعر بھی کہتے تھے - یہ لکھکر میر حسن کہتے ہیں کہ میری شاعری آبائی ہے نہ آج کی -
ہر چند کہ میر انیس نے اپنے لیے پانچویں پشت مدّاحی کا دعویٰ کیا ہے ع

پانچویں پشت ہے شبّیر کی مدّاحی میں

مگر میر حسن کی شہادت کی بنیاد پر چھٹی پشت تھی - میر نفیس نے کس نفاست سے اس مسئلہ کو
صاف کر دیا ہے ع

شمشیرِ فصاحت پہ ہے یہ ساتواں صیقل

سات پشتیں ملاحظہ ہوں -

۱ - میر امامی
۲ - خواجہ عزیز اللہ
۳ - میر ضاحک
۴ - میر حسن
۵ - میر خلیق
۶ - میر انیس
۷ - میر نفیس

آمدم برسر مطلب - میر حسن کا نام غلام حسن تھا۔ اُن کے والد میر غلام حسین ضاحک نے دلّی میں نشو و نما پایا۔ آخر زمانہ میں فیض آباد میں جاکر سکونت اختیار کی۔ تحریر تذکرہ کے وقت زندہ تھے اور تیس برس سے ترک روزگار کرکے آزادانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ عالم و فاضل تھے، ناظم و ناثر، ہزل دوست، مزاح پسند۔ غزل چالیس۴۰ پچاس۵۰ شعر سے کم نہ ہوتی تھی۔ فن موسیقی میں بھی دخل تھا۔ قد میانہ، رنگ بھورا، ڈاڑھی اوسط، ریش بچہ منڈا ہوا۔ سبز عمامہ بطرز عرب باندھتے تھے۔ بڑا سا جبّہ پہنتے تھے۔ فارسی اور ریختہ دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ قصائد فارسی کی تعریف تذکرۂ شعرائے ہند کے مؤلّف نے کی ہے۔ متین کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

در پیش اگر روزِ اجل آہ نہ ہوتا — قصّہ تھا محبّت کا یہ کوتاہ نہ ہوتا
اُس آن تھمے آنسو جب آن کہ دل ڈوبا — تب جان سے ہم اُٹھے جب دیدۂ نم بیٹھے

رباعی در منقبت

کشّافِ حقائق و نکاتِ توحید — آں راکبِ دوشِ احمدی شاہ شہید
خود معنیِ آیاتِ کلامِ الٰہی ست — تفسیرِ حسینی ست بقرآنِ مجید

تذکرۂ میر حسن میں یہ رباعی اُن کے نام سے درج ہے حالانکہ وہ مولانا لطف اللہ شیرازی کی مشہور رباعی ہے اور فارسی تذکروں میں اُن کے نام سے درج ہے۔

رباعی

افسوس دلا کہ غمگساراں رفتند — سیمیں بدناں و گلعذاراں رفتند
چوں بوئے گُل آمدند بر باد سوار — در خاک چو قطرہائے باراں رفتند

میر حسن دہلی میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی تعلیم پائی۔ عربی سے واقف نہ تھے۔ ابتدا سے شعر و سخن کا شوق تھا۔ اس سلسلے میں حضرت خواجہ میر درد کی خدمت میں رہ کر پختگی حاصل کی۔ میر ضیا کے شاگرد تھے، مگر خود لکھتے ہیں کہ مجھ سے اُن کی طرز کا نباہ نہ ہو سکا۔ اس لیے

میر درد کی طرز کی پیروی کی۔ تلمذ کی بابت آبِ حیات میں لکھا ہے "میرزا رفیع کو بھی غزل دکھائی۔" میر حسن کے بیان سے اُس کی تائید نہیں ہوتی۔ وہ اپنا تلمذ صرف میر ضیا سے ظاہر کرتے ہیں۔ البتہ یہ لکھتے ہیں کہ چوں کہ میں اُن کی طرز نباہ نہ سکا، اس لیے میر، درد، اور سودا کی طرز کی پیروی کی۔ یہاں بھی سودا کی تخصیص نہیں۔ آزاد نے جو خط میر حسن کا قدرت اللہ خاں قاسم کے نام نقل کیا ہے اُس میں بھی یہی لکھا ہے "اصلاح سخن از میر ضیا گرفتہ ام۔" سودا کا نام نہیں۔ آغازِ شباب میں دلی کی تباہی سے پریشان ہو کر اپنے والد کے ساتھ فیض آباد گئے۔ وہاں سے بالآخر لکھنؤ جا کر بود و باش اختیار کر لی۔ اس سفر میں دلی سے چل کر اول چند مہینے دیگ میں رہے، وہاں سے حضرت شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ مکن پور گئے۔ اسی منزل کی کیفیت نے مثنوی گلزارِ ارم کی بہاریں دکھائیں۔ فیض آباد اور لکھنؤ میں نواب سالار جنگ اور اُن کے بیٹے میرزا نوازش علی خاں کی مصاحبت میں رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گزر یہاں بھی تنگی سے ہوتی رہی۔ خود لکھتے ہیں۔ "چنانچہ تا حال بہر نوع گزراں می نمایم۔"

حلیہ۔ ڈاڑھی منڈی ہوئی، رنگ بھورا، قد اچھا بڑا (میر نفیس تک یہ قدوقامت قائم تھا) پُرانی وضع کی پگڑی سر پر (اب سرے سے پگڑی ہی ندارد ہے، پُرانی وضع کون سمجھے گا) اپنے والد کی طرح بڑا سا جُبّہ پہنتے تھے، یہ حلیہ "تذکرۂ شعرائے ہند" میں لکھا ہے۔ آبِ حیات میں اس کے خلاف یوں لکھا ہے "میانہ قد، خوش اندام، گورا رنگ، جملہ قوانین شرافت و آئین خاندان میں اپنے والد کے پابند تھے، اتنا تھا کہ داڑھی منڈاتے تھے، سر پر بانکی ٹوپی۔ تن زیب کا انگرکھا، پھنسی ہوئی آستینیں، کمر سے دوپٹہ بندھا۔" اہلِ نظر فیصلہ کریں کہ کون سا بیان قابلِ قبول ہے۔ "تذکرۂ شعرائے ہند" کی قدامت اور تحقیقات کے موقع کا زیادہ حاصل ہونا غالباً تذکرۂ شعرائے ہند کو زیادہ مستند قرار دے۔

میر حسن کے اخلاق کی بابت "تذکرۂ شعرائے ہند" میں لکھا ہے۔ "وہ ظریف اور خوش خلق آدمی تھا، مگر بیہودہ اور کلام معیوب کبھی زبان سے نہیں نکلتا تھا۔ سوا ازیں شیریں مزاج، خوش خلق پسندیدہ تعلیم یافتہ تھا۔ کسی شخص نے اُس کو بُرا نہیں لکھا۔ اور نہ کچھ الزام لگایا ہے۔"

آخر ماہ ذیحجہ میں علیل ہوئے۔ عشرۂ محرم ۱۲۰۱ھ میں انتقال کیا (یعنی مثنوی "سحرالبیان" کے ختم ہونے کے دو سال بعد) مرزا قاسم علی خاں کے باغچہ کی پشت پر مدفون ہوئے۔ مصحفی نے تاریخ وفات کہی۔

چوں حسن آں بلبلِ خوش داستاں	رُو ازیں گلزارِ رنگ و بو بتافت
بسکہ شیریں بود نطقش مصحفی	شاعرِ شیریں بیاں۔ تاریخ یافت

۱۲۰۱ھ

چار بیٹے تھے اُن میں سے تین محسن، خلیق اور خلق شاعر ہوئے۔ شاید ہی اس کی نظیر تاریخ عالم میں ملے کہ شاعری ایک خاندان میں آٹھ پشت تک مسلسل رہی ہو۔ یہ طرۂ امتیاز میر حسن کے خاندان کی دستار پر کھلا۔ کسبی علوم سات آٹھ پشت تک شاذونادر چلے ہیں چہ جائیکہ شاعری جو وہبی ہے۔ پھر قدرت نے اس فراوانی سے یہ نعمت اس خاندان کو بخشی کہ میر حسن کے تین صاحبزادے شاعر ہوئے اور تین پوتے۔ میر انیس، مونس، انس ایک میر انیس تنہا ایک ملک کے فخر کے لیے کافی ہیں۔

میر حسن کا کلام میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔ اب تک فقیر نے قریب سات آٹھ ہزار کے شعر کہے ہیں۔ ایک ترکیب بند کہا ہے اور ایک مثنوی رموزالعارفین "جو قبول خاطر" و شہرتِ عام حاصل کر چکی ہے۔

آبحیات میں آزاد لکھتے ہیں "دیوان اب نہیں ملتا۔" اسی کے ساتھ قدرت اللہ خاں قاسم کا یہ قول دیوان کی نسبت نقل کیا ہے۔ "انواع سخن سے لبریز ہے" ایک اور موقع پر لکھتے ہیں۔ "آج یہ نوبت ہے کہ پانچ غزلیں بھی پوری نہ ملیں جو کتاب میں درج کرتا۔"

مثنوی گلزار ارم کی نسبت لکھتے ہیں "میں نے یہ مثنوی دلّی کی تباہی سے پہلے دیکھی تھی"۔
تذکرۂ آبحیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "آزاد" کو مثنوی رموز العارفین کی خبر نہ تھی۔
تذکرۂ شعرائے ہند میں منشی کریم الدّین نے میر حسن کی تصانیف کی نسبت عجب خلط مبحث کر دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں "حسن مذکور کی تصنیفات یہ ہیں۔ ایک دیوان اقسام سخن کا جس میں تخمیناً آٹھ ہزار شعر ہیں۔ دوسرا تذکرہ ہندی مصنّفوں کا ریختہ میں لکھا ہے۔ تیسری مثنوی بدرِ منیر۔ اس مثنوی کی برابر کسی سے آج تک اچھّی مثنوی نہیں ہوئی۔ چوتھی سحر البیان۔ یہ سب سے بڑی کتاب میر حسن کی ہے۔ اس میں عورتوں کی پوشاکِ عجیبہ کا حال بیان کیا گیا ہے اور طوائف کا بھی اُس میں ذکر ہے اور مسلمانوں کی رسماتِ شادی کا بھی حال اُس میں مندرج ہے"۔ ظاہر ہے کہ "سحر البیان" مثنوی بدرِ منیر کا نام ہے۔ چنانچہ میر حسن نے مثنوی مذکور کے خاتمہ میں لکھا ہے۔ ع

نئی مثنوی ہے یہ سحر البیاں

منشی صاحب جس مثنوی کو سحر البیان کہتے ہیں وہ گلزار ارم ہے لیکن وہ مثنوی بدرِ منیر سے بڑی نہیں "تذکرہ" ریختہ میں نہیں لکھا بلکہ فارسی میں لکھا ہے۔ رموز العارفین کا پتہ منشی کریم الدّین کو بھی نہیں لگا۔ اور چونکہ ان کا تذکرہ ڈی ٹاسی کے تذکرہ سے ماخوذ ہے اس لیے ماننا چاہیے کہ ڈی ٹاسی بھی اُس سے بے خبر تھا۔ تذکرہ بھی دیکھا نہیں سماعی خبر لکھ دی، ورنہ اُس کی زبان کی بابت ایسی فاحش غلطی نہ ہوتی۔ یہاں ایک دقّت اور ہے۔ آزاد نے آبحیات میں جو خط خود میر حسن کا قدرت اللہ خاں قاسم کے نام کا نقل کیا ہے اُس میں یہ عبارت ہے۔ "تذکرہ در ریختہ ہم نوشتہ"۔ اس عبارت کے معنی خلاف ظاہر یہ لینے ہوں گے۔ "در بیان شعرائے ریختہ نوشتہ"۔ ورنہ یہ تو بعید از قیاس ہے کہ شعرائے ریختہ کے دو تذکرے میر حسن نے لکھے ہوں۔ ایک زبانِ ریختہ میں دوسرا فارسی میں۔ غالباً اسی خط کی عبارت سے منشی کریم الدّین کو لغزش ہوئی۔

خدا کا شکر ہے کہ جو نعمت مؤلف آبحیات کے لیے پردۂ ظلمانہ میں رہی وہ مجھ کو مل گئی۔ لکھنؤ سے کلیاتِ میرحسن کا نسخہ ہاتھ آیا جو ۱۲۵۶ھ کا لکھا ہوا ہے مطلّا اور مُذہّب ہے اور اس اہتمام سے لکھا گیا ہے جس اہتمام سے فارسی شعرا کے دواوین لکھے جاتے تھے نعمت بالائے نعمت یہ ہے کہ صحیح ہے۔ قدرت اللہ خاں قاسم کا قول بھی اس پر صادق ہے۔ انواعِ سخن سے لبریز ہے۔ چار سَو صفحہ کا حجم ہے۔ تقریباً سات ہزار شعر ہیں۔ غزل کے اشعار قریباً چار ہزار ہیں۔ چھوٹی بڑی گیارہ مثنویاں ہیں۔ سات قصیدے ہیں۔ مخمس۔ مسدس۔ مثلث رباعی بھی ہیں۔ وہ ترکیب بند بھی (واسوخت کے نام سے) موجود ہے جس کا ذکر مذکرہ میں میرحسن نے کیا ہے۔ مرثیے نہیں ہیں حالانکہ میرحسن نے مرثیوں کا لکھنا تذکرہ میں لکھا ہے۔ اس مجموعے کی دستیابی سے آزاد کا وہ تاسّف آمیز شکوہ رفع ہو جاتا ہے جو ان کو اخلاف میرحسن سے کلیات مرتّب نہ کرنے کی بابت تھا۔

جوشِ عقیدت سب سے اوّل شاہ عالم بادشاہ کا ذکر لکھا ہے۔ اس ادب کے ساتھ "ذکر اوّل بادشاہ جمجاہ سکندر سپاہ ظلّ اللہ شاہ عالم بادشاہ ... ... خلد اللہ ملکہ" و افاض اللہ بره و احسانہ" " اس ذکر کے بعد تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چند اُس عہد میں سلاطین مغلیہ کے ہاتھ سے سلطنت ظاہری جا چکی تھی مگر دلوں پر حکومت قائم تھی۔

ادبی نکتے جس طرح میر صاحب نے "نکات الشعرا" کو ضمناً جا بجا ادبی نکتے اور فائدے بیان کر کے زینت دی ہے اسی طرح میرحسن نے اپنے تذکرہ کو آراستہ کیا ہے۔ ریختہ کی تعریف "ریختہ اوّل از زبان دکن رواج یافتہ" اس لحاظ سے یہ گرانبہا جنس، شاہجہانی اُردو بازار کی دکانوں کی ملکیت تھی (میرحسن اور میر تقی میر دونوں نے اپنے تذکرہ میں اس زبان کا نام یا ہندی لکھا ہے یا ریختہ۔ اُردو جہاں تک میرا خیال ہے کہیں نہیں لکھا۔ منشی کریم الدین نے اُردو کے ساتھ ہندوستانی بھی لکھا ہے) طرزِ متقدمین

ومتاخرین کا فرق۔ "طرزِ متقدمین بطور ایہام۔ طرزِ متاخرین بزبان حال ادائیے"

میر تقی نے خاکسار کے اس شعر میں ؎

خاکسار اُس کی تو آنکھوں سے گیے مت لگیو

مجھکو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

یہ اصلاح دی تھی "بر متتبع ایں فن پوشیدہ نیست کہ بجائے "بیمار کیا" گرفتار کیا، می بایست"

میر حسن کہتے ہیں "در عقل فقیر چنیں گزرد کہ اگر چشم خود می بود گرفتار مناسب بود۔ چون اینجا چشم معشوق ست بیماری صحت دارد" دیکھو کیسی بات سُجھا گئے۔ راقم کا ایک شعر نقل کیا ہے

کام عاشقوں کا کچھ تجھے منظور ہی نہیں

کہنے کو ہی یہ بات کہ مقدور ہی نہیں

لکھتے ہیں کہ اس شعر میں "عین" (عاشقوں) تقطیع سے گرتا ہی اور یہ عینِ خطا ہی۔ مصرع یوں ہوتا تو بہتر تھا ع

میرا تو کام کچھ تجھے منظور ہی نہیں

معین بداونی کا ایک شعر ہی ؎

خوش ہم عریانی سے اتنے ہیں برنگِ بوئے گل نکلے جاتے ہیں ٹھہرتے نہیں پوشاک سے ہم

میر حسن کہتے ہیں۔ "خوش ہم عریانی ناموزون ست چرا کہ "میم" با "را" چناں چسپیدہ است کہ "عین" چوں چشم غزال از میاں رم کردہ و ایں سخت عیب ست"

سجاد کا شعر ہی ؎

تجھے غیر سے صحبت اب آشنی

اسی دوستی ہم سے ہی دشمنی

میر حسن کہتے ہیں "اسی دوستی۔ زبانِ قدیم ست یعنی برائے ہمیں"۔

راجہ رام نراین موزوں تخلص۔ نواب سراج الدولہ کی طرف سے عظیم آباد کے

صوبہ دار تھے۔ شیخ علی کے شاگرد "آشنا پرست" سیاہ دوست فارسی کا ذوق تھا۔ ریختہ کا صرف ایک شعر کہا جو مشہور ہوگیا۔ اس کا واقعہ خود میرحسن کے الفاظ میں سنو۔ "شعر ریختہ کم گفتہ بلکہ نگفتہ۔ مگر وقتیکہ خبر شہید شدن سراج الدولہ در شہر افتاد ہماں وقت فی البدیہہ ایں شعر میخواند و از خبرداراں خبر می پرسید دگر یست ؎

غزالاں۔ تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی دوانہ مرگیا آخر کو ویرانہ پہ کیا گزری ؟

ہمیں شعر از و یادگار ماند۔" ذرا اس شعر کو مکرر پڑھو اور اس کے درد کا اندازہ کرو اور یہ بھی غور کرو کہ ایک "آشنا پرست" ماتحت کے دل کے واردات کا سچا نقشہ ہے۔ کیا اس کے بعد مجھکو یہ کہنے کی اجازت ملے گی کہ تاریخ کے سیاہ کار بلیک ہول کے واغدار سراج الدولہ ! تیرے دل میں تو محبّت و ہمدردی کا چراغ روشن نظر آتا ہے ! اُن کے اُستاد میر ضیاؔ نے اپنے یہ شعر اُن کو سنائے تھے ؎

تربت ضیاؔ کی دیکھی کل رات ڈیرے میں — آئے نظر مجھے واں شمع و چراغ کتنے
جاکر جو آج دن کو دیکھا میں کر تفحص — اک دل جلے ہے اُس میں حسرت کے داغ کتنے

سلام اللہ خاں تسلیمؔ ایک فارسی گو شاعر نے ترجمہ کرکے یہی مضمون اپنے نام مشہور کردیا ؎

دوشش رفتم بر مزار کشتۂ تسلیم خویش — می نمود از دُور صد شمع و چراغ حسرتے
چوں شدم نزدیک۔ دیدم از تفحص ہا بسے — یک دلے میسوخت با صد چند داغ حسرتے

میرحسن خفا ہیں (اور خفگی بجا ہے) "تسلیم در فارسی ترجمہ کردہ بنام خود شہرت داد۔ ایں ندانست کہ در نظر صورت شناسان معانی تبنّی و فرزند پوشیدہ نمی ماند مثل ہندی مشہور ست "ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں۔ جس کا ہاتھی اُس کا ناؤں"۔ پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تسلیم کے شعر زبان فارسی کی قوّت و صفائی کی بدولت ضیاؔ کے اشعار سے زیادہ تابدار ہیں۔ خصوصاً اس صورت میں کہ ضیاؔ کی زبان بوجہ قدامت ماند پڑ گئی ہے مصرع اوّل میں "کشتۂ تسلیم" نے جان ڈال دی ہے۔

میر حسن صرف دب اُردو کے نقّاد نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ فارسی شعرا کے کلام کی نقادی پر بھی پوری قوت تھی اور ہر ایک کے طرز کا جُدا جُدا اندازہ حاصل تھا چنانچہ اساتذۂ اُردو کے کلام کی طرز کو اساتذۂ فارسی کی طرز سے تشبیہ دیتے جاتے ہیں میر ضیا ”طرزش مانا بطرز مولانا نسبتی“۔ میر تقی ”طرزش مانا بطرز شفائی“۔ خواجہ میر درد ”دیوانش اگرچہ مختصر ست لیکن چوں کلام حافظ سراپا انتخاب“۔ میر درد کا ایک شعر سن لو حافظ کے بہت سے شعر یاد آجائیں گے ؎

ساقیا یاں لگ رہا ہی چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

قائم چاندپوری ”طرزش بہ طرزِ طالب آملی می ماند“۔ زبان کی ٹکسال دلّی تھی۔ قائم مذکور کے حال میں ”متوطن چاندپور ندیہ۔ چوں ازا ابتداے جوانی در شاہجہاں آباد آمدہ بسر برد بنا برآں محاورۂ او درست گشت۔ معین بداؤنی کا ایک مصرع ہی۔ ع

نہ آیا یار دوپہری بھی اب ڈھلی افسوس

میر صاحب لکھتے ہیں ”ایں محاورہ درست نیست۔ مردم شاہجہاں آباد دوپہر ڈھلی میگویند۔ دوپہری مگر مردم بیرونجات“ ایک شعر میں شاعر موصوف نے ”بتِ خانگی“ باندھا ہی۔ میر حسن کہتے ہیں ”بتِ خانگی نامانوس ست۔ فقیر در ہیچ جا نشنیدہ“۔

سرمایۂ مشترک | یہ زمانہ صنعت و حرفت کی ترقّی کا ہی۔ گوناگوں مصنوعات سے نہ صرف بازار بلکہ گھروں کے در و دیوار بھی معمور ہیں۔ اسی سلسلے میں بہت سے مصنوعی مسائل کا انبار ہی جو ہماری زندگی پر مؤثر ہیں۔ انھیں مسئلوں میں سے ایک مسئلہ ملکی زبان کا ہی۔ ایک زبان صرف مسلمانوں کی ہی اُس کا نام اُردو ہی۔ دوسری ہندوؤں کی ہی اُس کو ہندی کہتے ہیں۔ ہندوستان کے چاروں گوشوں کو دیکھا۔ شہر، دیہات، پہاڑ اور جنگل دیکھے مگر زبان کی یہ تقسیم کہیں عمل پذیر نہ دیکھی۔ تذکرۂ میر تقی میر اور تذکرۂ میر حسن کے

مطالعہ سے صاف واضح ہی کہ ریختہ کہو، اُردو کہو، ہندی کہو جو نام چاہو رکھو مگر واقعہ یہ ہی کہ ہندوستان کی عام رائج زبان ہندو اور مسلمان اہل ادب کی محنتِ مشترکہ کا ثمرہ ہی ابتدائے شاعری سے لے کر انتہا تک یہ اشتراکِ محنت عیاں ہی۔ نکات الشعرا میں جہاں متقدمین شعرا میں خان آرزو اور قزلباش اُمیدؔ ہیں وہاں رائے انند رام مخلصؔ اور ٹیک چند بہارؔ بھی ہیں۔ متوسطین میں بندرابن راقمؔ ہیں۔ میر حسن کے تذکرہ میں بھی بہت سے ہندو شعرا کا ذکر ہی۔ جن میں سے بعض جگت اُستاد تھے۔ مثلاً رائے سرب سنگھ دیوانہؔ تخلص۔ اُن کی نسبت لکھا ہی۔ "شاعرِ زبردست فارسی ست۔ شعر بسیار گفتہ است۔ اُستادِ ریختہ گویانِ لکھنؤ۔ چنانچہ میاں حسرت و میر حیدر علی حیران و اکثر دیگر شاگردِ اویند۔ در آنجا مشہور و معروف است۔" حسرتِ مذکور اساتذۂ لکھنؤ میں سے ہیں۔ جرأت کے اُستاد شاگردوں کی یہ کثرت تھی کہ پہچان نہیں سکتے تھے۔ ایک اور معتبر شہادت۔ منشی کریم الدین نے تذکرۂ شعرائے ہند میں (جو ڈی ٹاسی کے تذکرہ سے ماخوذ ہی) طبقۂ دوم۔ اُن شعرا کے ذکر میں لکھا ہی جو مصلحِ اُردو اور مروج اس زبان کے تھے۔ اور اُنھوں نے الفاظِ کریہہ کا استعمال یک قلم زبانِ ریختہ سے موقوف کردیا۔ اس طبقے میں سب سے اول راجہ جسونت سنگھ متخلص بہ پروانہؔ کا ذکر ہی یہ نواب شجاع الدولہ بہادر کے نائب راجہ بنی بہادر کے بیٹے اور رائے سرب سنگھ دیوانہؔ کے شاگرد تھے۔ جرأت کی تاریخ کیا خوب کہی ہی ع

"کہو جنّت نصیب جرأت ہی"

پروانہؔ کے دیوان کی بابت یہ رائے ظاہر کی ہی "دیوان اس شاعر کا دیکھنے میں آیا بہت اچھا۔ پاکیزہ اشعار اُس کے ہیں ....." اشپرنگر بہادر کے پاس وہ دیوان موجود تھا۔

میر حسن نے اپنے تذکرہ میں حسب ذیل ہندو شعرا کا ذکر لکھا ہی۔ رائے پریم ناتھ[1]۔ ٹیک چند بہار[2]۔ سنتوکھ رائے بینوا[3]۔ سیا ناتھ سنگھ[4]۔ لالہ سرب سنگھ دیوانہ[5]۔ گھاسی رام خوشدل[6]۔ بندرابن راقم[7]۔ لالہ ہلاس رائے رنگین[8]۔ لالہ خوشوقت رائے شاداب[9]۔ رائے بھکاری داس[10]

عزیز - فارغ [11] - بدھ سنگھ قلندر [12] - لالہ کاشی ناتھ [13] - انند رام مخلص [14] - راجہ رام نراین موزوں [15]
عجائب رام منشی [16] - لالہ نول رائے وفا [17] - ان حالات کے ہوتے ہوئے مذکورۂ بالا مصنوعی
تفریق کو دیکھکر چارۂ کار یہی ہے کہ ملک اور اہل ملک کے حال پر افسوس کیا جائے ۔

اس عہد کی معاشرت عموماً شعرا کی نسبت یہ خیال ہے کہ وہ ایک بے کار فرقہ ہے جو
خیالی دنیا کی سیر میں مصروف ہے - کلام کی شوخی و رندی سے قیاس کیا جاتا ہے کہ قائل اپنی
حالت کا مرقع کھینچ رہا ہے - واقعات اس خیال کا ساتھ نہیں دیتے - طبقہ شعرا میں کثیر حصّہ
ایسے کاروباری آدمیوں کا تھا جن کا معیار اخلاق بلند تھا اور جو شعر گوئی کو زندہ دلی
کا سامان اور ادب کی خدمت تصوّر کرتے تھے - اسی کے ساتھ اور کمالات انسانی میں قدرت
و کمال پیدا کرتے تھے - ذیل کے شعرا کے اخلاق و مشاغل پر نظر ڈالیے - اُمیّد ہے کہ آپ بھی
میرے ہمنوا ہوں گے - میر اثر "خوش اوقات و نیک سیرت درویشے ست مُوقّر و صاحب
سخنے ست موثر - عالم - فاضل" عاصمی "درعلم تاریخ و شمشیر شناسی و لطیفہ گوئی دستے
بہم رسانده" رائے پریم ناتھ - "خطّاط بے نظیر، کمال دارد ل پذیر - غزل فارسی خوب
می گوید" آگاہ - "بوسیلۂ قصّہ خوانی بسر می بُرد - دریں فن شاگرد میر احمد مرحوم است
کہ بقصّہ خوانی مشہور بود" میر اعلیٰ علی - "خلیق و متواضع" میر شیر علی افسوس - "داروغۂ
توپ خانۂ عالیجاه جوانے ست ظاہر و باطن آراستہ بحلم و حیا پیراستہ" بیدار - "بزیور حلم و حیا
آراستہ" حشمت - "سپاہی پیشہ ... فہمیدہ و سنجیدہ - متواضع و مؤدّب" رنگین "سپاہی
پیشہ - خوش اوقات و نیک ذات - جوان محمد شاہی - خط نستعلیق خوب می نویسد" مہربان خاں
رند (اُس عہد کے اُمرا کا ایک نمونہ) نواب غالب جنگ بہادر والیِ فرخ آباد کے وزیر
"مجلسے رنگین و بزمے ارم تزئین داشت" ہر صادر و وارد کی فراخ حوصلگی سے خدمت
کرتے تھے - اہل سخن اور ہر فن کے اہل کمال سے ربط تھا - موسیقی اور ہندی شاعری
میں (جو کبتوں سے عبارت ہے) مشّاق تھے - مرتبۂ امارت اتنا بلند تھا کہ خود اُمرا اُن کی

صحبت میں تھے۔ میر سوز اور سودا کے شاگرد تھے۔ موسیقی میں بہت سے راگ تصنیف کیے تھے۔ فن تیر اندازی میں بھی میر سوز کے شاگرد تھے اور اس فن میں امتیاز حاصل کیا تھا۔ شمشیر شناسی، ادب شناسی اور مردم شناسی بھی میر موصوف کی صحبت میں حاصل کی تھی۔ دیکھو ادب شناسی اور انسان کی قدردانی بھی اُس زمانہ میں فن تھے جو اُستادوں سے حاصل کیے جاتے تھے۔ اس بیان سے خود میر سوز کے کمالات کی نیرنگی معلوم ہوتی ہے۔ میر مظہر علی "پاکیزہ سرشت و نیک شعار۔ جوانے ست بعلم و عمل آراستہ و بصلاح و تقویٰ پیراستہ"۔ سجّاد "موصوف باوصافِ حمیدہ۔ مخلوق باخلاقِ سنجیدہ ... ... در لطیفہ گویاں .... طاق۔ در ہر امور کہ دخل کردہ بکمال رسانیدہ۔ علم طب ہم حاصل نمودہ ... طلسمات و انشا و خوشنویسی و شعر فہمی بمراتب اعلیٰ رسانیدہ"۔ شوق۔ "مرد سپاہی پیشہ۔ صاحب دیوان۔ از شاگردان سراج الدین علی خاں آرزو۔ مدتے در سرکارِ نوابِ عماد الملک غازی الدین خاں بوسیلۂ سپہ گری بسر بردہ"۔ شاعر۔ "جوانے ست بجمالِ صلاحیت آراستہ و بہ علم و عمل پیراستہ۔ اہل دل منصف۔ متواضع مؤدب۔ بزرگ و بزرگ زادہ"۔ نواب عماد الملک غازی الدین خاں (ایک اور امیر) "بر جمیع علوم قادر و در فنون سخن ماہر۔ از وزرائے ہندوستان ... بود ..... ہفت قلم و ہفت زبان"۔ فغاں۔ "خان ظریف طبع و خوش اختلاط۔ باہر کس خوش طبعی داشت ...... لطائف و ظرائف او مشہور ست"۔ گریاں۔ "جوانے ست شائستہ ..... سپاہی پیشہ"۔ وحشت۔ "سید زادۂ خوش اوقات و نیک صفات۔ جوانِ وضع دار و در فن سپہ گری اُستوار"۔ لالہ نول رائے وفا۔ "از تذکرۂ محمد قائم چناں ظاہر ست کہ جوانے ست نوخاستہ۔ بزیورِ علم و عمل آراستہ .. ... صاحب علم و حیا۔ لطافت مزاج از گل زیادہ .. ... برادرِ خوردش راجہ گلاب رائے دیوان مدار المہام امیر الدولہ نواب نجیب خاں مرحوم بود۔ لیکن ایں عزیز مصروف اکتساب و غریق مطالعۂ کتاب۔

طلب ہر کمال دامن گیر حال۔ طبع دردمند داشت۔"

یہ نہ خیال کرنا کہ میر حسن کے یہاں حُسنِ بیان و حُسنِ ظن کا دفتر کُھلا ہوا ہے اور ہر شخص سندِ تعریف سے سرفراز ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ وہی لکھا ہے جو خود دیکھا یا دوستانِ حقیقت داں سے سُنا۔ چنانچہ دیباچہ میں لکھ دیا ہے "پس از دریافتِ حالِ خیر مآلِ صاحب سخن، شمئہ کہ از دوستانِ حقیقت داں مسموع نمودہ درذیلِ اشعار ہر یک نوشت۔" ایسے شعرا بھی ہیں جن کی اخلاقی حالت معلوم نہ ہوئی اُن کی نسبت کچھ نہیں لکھا۔ مثلاً مصحفی اُن کے کلام کی فصاحت اور بلاغت کی تعریف کی ہے۔ مگر اخلاقی حالت چوں کہ معلوم نہ تھی اس لیے صرف اس قدر لکھا ہے۔ "از تخلص معلوم می شود مرد صالح ست۔"

مذکورۂ بالا اقتباس اہل انصاف کو اس امر کا معترف کرنے میں کامیاب ہوگا کہ شعرائے ماضی نکوہیدہ حال نہ تھے۔ بلکہ علم و اخلاق سے آراستہ انسان تھے۔ کیا اس سوال کا موقع ہے کہ آج کل کے مدعیانِ کمال کہاں تک علم و ادب کی خدمت کر رہے ہیں؟

بزرگان دین کی توجہ ادبِ اُردو پر

عام خیال یہ ہے کہ بزرگانِ دین و علما نے ادب اُردو کی جانب توجہ نہیں فرمائی۔ اس خیال کو واقعات سے مطابق کیجیے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُردو ادب نے شروع سے حضرات اولیاے کرام کی آغوشِ شفقت میں تربیت پائی ہے۔ ریختہ کے اُستاد اوّل (بقول میر حسن) ولی دکنی ہیں۔ میر تقی میرؔ اور میر حسن دونوں کی شہادت ہے کہ دلّی میں آکر حضرت شاہ گلشن قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر رہے اور فیض حاصل کیا۔ ریختہ میں فارسی کے مضامین رنگین استعمال کرنے کا مشورہ حضرت ہی نے دیا۔ میر حسن کی اصل عبارت "ولی ..... از خاک گجرات ..... در وقتِ عالمگیر بہ ہندوستانِ جنّت نشان آمدہ۔ در خدمت شاہ گلشن قدس سرہٗ استفادہ حاصل نمود۔ از توجہ آں بزرگوار مقبول اعلیٰ و ادنیٰ گردید۔"

اُردو شاعری کے تیسرے دوْر کے ارکان چہارگانہ میں سے دو رُکن وہ عالی مرتبہ

بزرگ ہیں جن کی تعلیم سے ہزاروں انسان زندگی کے مقصد سے واقف اور شاہدِ مقصود کے حصول میں کامیاب ہوئے۔ یعنی حضرت خواجہ میر درد اور حضرت میرزا مظہر جان جاناں قدس سرہما۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ یہ تینوں حضرات نقشبندی سلسلے کے ہیں۔ اس طرح اُردو ادب کا نقش اوّل و ثالث حضرات نقشبندیہ کی توجہ کا منت پذیر ہے۔ آزاد آبِ حیات میں لکھتے ہیں:۔
"اپنے اُستادوں اور بزرگوں سے یہی سُنا کہ مرزا جانِ جاناں، سودا، میر، خواجہ میر درد۔ یہ چار شخص تھے جنھوں نے زبانِ اُردو کو خراد اُتارا ہے" آخر الذکر دونوں حضرات نے گوناگوں اسلوبوں سے ادب اُردو کو ترقی بخشی۔ خود اُستادانہ کلام کہا۔ اپنے فیض اثر سے اُس کو مقبول بنایا۔ شاگردوں کی تربیت کی۔ حضرت خواجہ میر درد کو دیکھو۔ خود قادر الکلام اُستاد ہیں۔ چھوٹے بھائی اثر ہیں۔ صاحبزادہ الم۔ قائم چاندپوری اور بھکاری داس عزیز زمرۂ تلامذہ میں ہیں۔ میر حسن نے حضرت ہی کی خدمت میں ذوقِ سخن کی پختگی حاصل کی۔ حضرت میرزا صاحب خود اُستادِ فن۔ یقین و حزیں۔ زمرۂ تلامذہ میں۔ ان حضرات کے علاوہ الہ آباد کے دائرے بھی اس ذوق سے پُرصدا تھے۔ حضرت شاہ اجمل سجادہ نشین حضرت شاہ خوب اللہ اور اُن کے برادر بزرگوار شاہ غلام الدین مصیبت بھی شاعرانِ اُردو میں شامل ہیں۔

ایک لطیف بحث | میر تقی میر نے اپنے کلام کا انتخاب نکات الشعراء میں درج کیا ہے۔ میر صاحب کا کلام۔ اُس پر اُن کا انتخاب، سونے پر سہاگہ۔ مگر آفریں میر حسن کے انتخاب کو کہ میر کے کلام کا انتخاب خود میر سے بہتر کیا۔ مشتے نمونہ از خروارے۔ اشعار ذیل میر حسن کے انتخاب میں ہیں۔ میر صاحب کے انتخاب میں نہیں ؎

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا

بیتاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا
جیتے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا

لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اُٹھے
ہے خیر۔ میر صاحب۔ کچھ تم نے خواب دیکھا

وصل میں رنگ اُڑ گیا میرا   کیا جدائی کو منہ دکھاؤں گا

ان اشعار کی بابت یہ کہا جا سکتا ہے کہ چوں کہ ان اشعار کے ہم طرح اشعار میرؔ کے تذکرہ میں نہیں ہیں اس لیے ممکن ہے کہ ترتیب تذکرہ کے بعد کہے ہوں اس لیے انتخاب میں نہ آئے ہوں۔ معرکہ یہ ہے کہ جن غزلوں کے اشعار منتخب کر کے خود میر صاحب نے لکھے ہیں اُن ہی غزلوں سے بعض ایسے نادر اشعار میر حسن نے انتخاب کر لیے ہیں جو خود میرؔ کے انتخاب سے زیادہ نادر ہیں۔ اور یہ ایک انسانی کمزوری کا پہلو ہے کہ بعض اوقات خود اپنے کمال پر وہ قلم پھیر دیتا ہے۔ تذکروں میں لکھا ہے کہ زلالی خوانساری کی معرکۃ الآرا مثنوی "محمود ایاز" کا مسودہ دیکھا گیا تو اُس میں بعض ایسے نادر اشعار زلالی نے کاٹ دیے تھے جو فارسی ادب کے لیے مایۂ ناز ہیں۔ مثلاً شب تاریک کی تشبیہ میں یہ بے نظیر شعر ؎

ستارہ می نمودے درمیانہ
چو چشم گربہ در تاریک خانہ

ایسے متعدد اشعار اہلِ نظر احباب نے مثنوی مذکور میں بعد کو اضافہ کر دیے ہیں۔ خلاصۂ کلام نمونۂ کلامِ مذکور ملاحظہ ہو۔ ایک غزل ہے۔ دیدار دیکھنا۔ گلزار دیکھنا

اِس غزل کے یہ اشعار میرؔ نے انتخاب کیے ہیں ؎

آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر یار دیکھنا   عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا
ہوتا نہ چار چشم دل اُس ظلم پیشہ سے   ہشیار۔ زینہار۔ خبردار دیکھنا

میر حسن اسی غزل کا یہ شعر انتخاب کرتے ہیں ؎

صیّاد دل ہے داغِ جدائی سے رشکِ باغ   تجھ کو بھی ہو نصیب۔ یہ گلزار دیکھنا

دوسری طرح۔ روتا رہے گا۔ سوتا رہے گا۔ اس غزل کے یہ شعر انتخاب میرؔ میں ہیں ؎

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا   تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
تو یوں گالیاں غیر کو شوق سے دے   ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہے گا

میر حسن کے انتخاب میں یہ شعر ہے ؎

ہیں وہ رونے والا چلا ہوں جہاں سے
جیسے ابر ہر سال روتا رہے گا

ایک تیسری طرح ہے۔ یار افسوس۔ ہزار افسوس۔ انتخابِ میر ؎

مر گیا میں ملا نہ یار افسوس
آہ افسوس۔ صد ہزار افسوس

یوں گنواتا ہے دل کوئی مجھ کو
جی آتا ہے بار بار افسوس

انتخابِ میر حسن ؎

رخصتِ سیرِ باغ ہمیں نہ ہوئی
یوں ہی جاتی رہی بہار افسوس

ایک چوتھی طرح ہے وفائے بلبل۔ جائے بلبل۔ انتخابِ میر ؎

گل کی جفا بھی دیکھی۔ دیکھی وفائے بلبل
یک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل

انتخابِ میر حسن ؎

کی سیر جذبِ الفت گلچیں نے کل چمن میں
توڑا تھا شاخِ گل کو نکلی صدائے بلبل

یہ شعر ایک دیوان پر بھاری ہے۔ میر صاحب کا اس کو منتخب نہ کرنا سراپا حیرت ہے۔

میر حسن کے اس حسنِ انتخاب نے یقین ہے کہ طبائع کو اُن کے انتخاب کا مشتاق کر دیا ہوگا۔ اس لیے دل چاہتا ہے کہ اور انتخاب بھی ناظرینِ مقدمہ کی ضیافتِ طبع کے لیے یہاں لکھ دوں۔

میر حسن نے اپنے تذکرہ میں زندہ و مُردہ دونوں کو غایتِ شفقت کے ساتھ دعائے خیر سے یاد کیا ہے اور دیباچہ میں غرضِ تالیفِ تذکرہ بھی یہی لکھی ہے کہ اس کو پڑھکر شاید کوئی مجھ کو دعائے خیر سے یاد کرے۔ لہذا خاتمۂ مقدمہ پر دعا کرتا ہوں۔ ناظرین آمین کہیں۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَجَاوِزْ عَنْ سَیِّاٰتِہٖ

انتخابِ اشعار

آبرو

دور خاموش بیٹھ رہتا ہوں — اِس طرح حال دل کا کہتا ہوں
دل کب آوارگی کو بھولا ہے — خاک گر ہو گیا بگولا ہے
شوق سے جس گھر میں ہو تو جلوہ گر — آئینے ہو جائیں دیواروں میں در

اثر

بس رفع اب خیالِ مے و جام ہو گیا — ساقی۔ بیک نگاہ مرا کام ہو گیا
دردِ دل چھوڑ جائیے سو کہاں — اپنے باہر تو یاں گزر ہی نہیں
کر دیا کچھ سے کچھ ترے غم نے — اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں
اثر کیجیے کیا۔ کدھر جائیے — مگر آپ ہی سے گزر جائیے
بے وفا تیری کچھ نہیں تقصیر — مجھ کو میری وفا ہی راس نہیں
یوں خدا کی خدائی برحق ہے — پر اثر کی ہمیں تو آس نہیں
عاشقی اور عشق کی باتیں — سب جہاں سے اثر کے ساتھ گئیں

اسد

جیوں تیوں اسد کو لائے تھے اُس کی گلی سے ہم — خانہ خراب۔ راہ میں پر پھر مچل گیا

آزاد

پوچھتے کیا ہو کہ بیداد کروں یا نہ کروں — یہ تو فرماؤ کہ فریاد کروں یا نہ کروں
وعدۂ وصل تو کرتے ہو مگر سچ کہیو — دل کو اس وعدہ سے میں شاد کروں یا نہ کروں

آثمی

مثالِ آئینہ ہم نے سبھی نقش جہاں دیکھا — جہاں دیکھا بہر صورت تجھے قالب میں جاں دیکھا

قیامت کی عقوبت ساری ہجرِ یار میں گزری	وہاں تھا دیکھنا جو کچھ سو سب ہم نے یہاں دیکھا

انشا

ہوئے ہیں خاکِ سرِ راہ اُس کے ہم انشا	بڑا غضب ہی جو یہ بھی فلک نہ دیکھ سکے

افسوس

اُس کے اُٹھتے ہی جی پہ آن بنی	دیکھیے آگے آگے کیا ہوگا

بیاں

اب ہجر میں کہتا ہی کہ تھا وصل میں آرام	نالاں ہی بیاں میں نے تو دیکھا تجھے جب بھی

پیو شراب جوانو کہ موسمِ گُل ہی	ہمیں بھی یاد وہ عہدِ شباب آتا ہی

جاتا ہی یار کچھ تو بیاں مُنہ سے بول لے	ای بے نصیب، مانعِ گفتار کون ہی

ہووےگا ذوقِ حسرتِ دیدار میں خلل	شیریں گزر نہ کیجیو فرہاد کی طرف

رباعی

سو طرح سے یہ عشق لبھاتا ہی مجھے	ہر چیز میں آ جلوہ دکھاتا ہی مجھے

کس ماہ کا یہ عکس پڑا ہی یا رب	ہر ماہ میں یوسف نظر آتا ہی مجھے

رباعی

دنیا سے بیاں چلا ہوں روتے روتے	گزری شبِ عمر اپنی سوتے سوتے

ظلمات میں تھا آبِ بقا۔ پر افسوس	روشن یہ ہوا صبح کے ہوتے ہوتے

شاہ عظیم اللہ بے تاب

دل چھین لیا میرا بنارس کے بتوں نے	اِس وقت میں تو ای مرے اللہ کہاں ہی

بسمل

ان کی مسند کی کیا کروں تقریر	نقش ہی روئے خاک پر تحریر

تاباں

عجب احوال ہی تاباں کا تیرے	کہ رونا رات دن اور کچھ نہ کہنا

سیّد محمد تقی (عرف میر گھاسی)

تو ہو اور باغ ہو اور زمزمہ کرنا بلبل
تری فریاد سے جیتا ہوں نہ مرنا بلبل

میاں قلندر بخش جرأت

آنے کی خبر ہی اس کے لیکن
آتا نہیں اعتبار دل کو

نالہ و آہ و فغاں میرا ہی دم بھرتے ہیں
آپ کا جان کے سب مجھ پہ کرم کرتے ہیں

ہی عین ہجر ہی میں میسر وصالِ دوست
اب کچھ خیال دل میں نہیں جز خیالِ دوست

بات میں کس کی سنوں آہ کہ اے مرغِ چمن
شور میں اپنے ہی نالوں کے سدا رہتا ہوں

اے ستم ایجاد کب تک یہ ستم دیکھا کریں
تو کرے غیروں سے باتیں اور ہم دیکھا کریں

کچھ تو نکلے آرزو دشنام دے تلوار کھینچ
چشمِ حسرت سے کہاں تک دمبدم دیکھا کریں

چین اس دل کو نہ اک آن ترے بن آیا
دن گیا رات ہوئی رات گئی دن آیا

حاتم

حاتمِ بیکس کا تجھ بن کون ہی
کون ہوگا جو نہ ہوگا تو مرا

حزیں

ویراں ہوا ہی باغ خزاں سے یہاں تلک
چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں

حسن

تھی ہمیں سیر کوئی دن اسی میخانے کی
اب خبر ہی نہ صراحی کی نہ پیمانے کی

تیغِ ابرو نے تو مارا ہی تھا جو زلف نہ ہو
غیر زنجیر خبر کون لے دیوانے کی

اے حسن آپ کو سمجھے گا تو کیا بس چپ رہ
سرِّ حق ہی یہ نہیں بات ترے پانے کی

حیراں

دلِ ستم زدہ کا آج پوچھتے ہو حال
غمِ فراق سے کب کا ہوا بہشت نصیب

حسرت

کہے وہ اپنے منہ سے قتلِ حسرت کو کیا میں نے
مرے مرنے کی عالم میں خبر یوں ہو تو بہتر ہو

قطعہ

تم جو کہتے ہو کہ وہ حسرت کو / آہ و فریاد یاں کیا نہ کرے

آپ کا اس میں کیا بگڑتا ہے / دردِ دل کی کوئی دوا نہ کرے

مؤلّف تذکرہ - میر حسن متخلص بہ حسنؔ

عشق کب تک آگ سینے میں مرے بھڑکائے گا / راکھ تو میں ہو چکا کیا خاک اب سلگائے گا

تو گرفتاری کے باعث مضطرب صیّاد ہوں / لگتے لگتے جی قفس میں بھی مرا لگ جائے گا

قیامت مجھ پہ شب اُس کا ترحّم اور تظلّم تھا / کبھی تھیں گالیاں مُنہ پر کبھی لب پر تبسّم تھا

ایسی ہی آہ باتیں اُس بے وفا نے چھیڑیں / روتے ہی روتے جس میں روزِ وصال گزرا

اُس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا / جیسے کوئی بھولے ہوئے پھرتا ہے کچھ اپنا

چھوڑدے کوئی کسی کے لیے جس طرح سے کچھ / ہم نے منّت میں تری کون و مکاں چھوڑ دیا

کرتے تو قتل مجھ کو کیا ہے پر اب حسنؔ / کیا کیا نہ اپنے جی سے وہ باتیں بنائے گا

جز اشکِ بلبل اب نہیں گل شاخسار پر / کیا اوس پڑ گئی ہے چمن میں بہار پر

اب جو چھوٹے بھی ہم قفس سے تو کیا / ہو چکی واں بہار ہی آخر

مردمِ چشم نے پلکوں کی چڑھا سنگینیں / ایک عالم کو نظر بند کیا پھرتے ہیں

ہزار حیف کچھ اپنی ہمیں خبر نہ ہوئی / تمام عمر لگی پر مہم یہ سر نہ ہوئی

شبِ فراق میں رو رو کے مر گئے آخر / یہ رات جیسی تھی ویسی رہی سحر نہ ہوئی

جان و دل ہیں اُداس سے میرے / اُٹھ گیا کون پاس سے میرے

جب قفس میں تھے تو تھی یادِ چمن ہم کو حسنؔ / اب چمن میں ہیں تو پھر یادِ قفس آتی ہے

کیا ہنسے اب کوئی اور کیا رو سکے / دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے

کہنے کی ہیں یہ باتیں کس بن نہیں گزرتی / پر ایک جان تو ہے جس بن نہیں گزرتی

کچھ ہو نہ ہو وے ہے تیرا خیال ہر دم / اِس بن نہیں گزرتی اُس بن نہیں گزرتی

رہے جس میں خطرہ سدا نیستی کا ۔۔۔ بس ای زندگی ایسی ہستی سے گزرے

رباعی

دُنیاداری میں اور نہ دینداری میں ۔۔۔ چاہت میں کسی کی ہیں نہ بیزاری میں
حیرت کدۂ دہر میں تصویر کی طرح ۔۔۔ سویا کرتے ہیں عین بیداری میں

پہنچے نہ حسنِ منزلِ مقصود کو ہم۔ اور ۔۔۔ آخر ہوئے سب زیست کے ایام سفر میں

کرم اللہ خاں درد

اگر وہ بُت کسی صورت سے میرا رام ہو جائے ۔۔۔ تو یہ جوں اس عقیدت سے کہ کفر اسلام ہو جائے
تری ترچھی نگاہوں نے رکھا ہے نیم بسمل کر ۔۔۔ اگر بھر کر نظر دیکھے تو میرا کام ہو جائے
تحمل آتشِ غم میں دلِ بیتاب کیا جانے ۔۔۔ ٹھہرنا ایک دم بھی آگ پر سیماب کیا جانے
کنارے سے کنارہ کب ملا ہے بحر کا یارو ۔۔۔ پلک سے لگنے کی لذّت دیدۂ پُرآب کیا جانے

حضرت خواجہ میر درد

خوابِ عدم سے چونکے تھے ہم تیرے واسطے ۔۔۔ آخر کو جاگ جاگ کے ناچار سو گئے
بارے مجھے بتا تو سہی کیا سبب ہوا ۔۔۔ پھر مجھ پہ مہربان ہوا تو غضب ہوا
کی تو تھی تاثیر آہِ آتشیں نے اس کو بھی ۔۔۔ جب تلک پہنچے ہی پہنچے خاک کا یاں ڈھیر تھا
مدرسہ یا دیر یا کعبہ تھا یا بت خانہ تھا ۔۔۔ ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا
وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا ۔۔۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا
ہو گیا مہماں سرائے کثرتِ موہوم آہ ۔۔۔ وہ دلِ خانہ کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا
جان سے ہو گئے بدن خالی ۔۔۔ جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا
نالہ فریاد آہ اور زاری ۔۔۔ آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا
اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی ۔۔۔ ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا
تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا ۔۔۔ برابر ہے دُنیا کو دیکھا نہ دیکھا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجوم یاس دل گھبرا گیا

تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے جز جفا
پر وہ کیا کچھ تھا کہ دل کو بھا گیا

کسی سے کیا بیاں کیجیے اِس اپنے حال ابتر کا
دل اُس کے ہاتھ دے بیٹھے جسے جانا نہ پہچانا

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ کچھ طاعت کی خاطر کم نہ تھے کرّوبیاں

ہم کس ہوس کی تجھ سے فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

مٹ جائیں ایک دم میں یہ کثرت نمائیاں
گر آئینے کے سامنے ہم ایک ہُو کریں

تیرے سوا نہیں کوئی دونوں جہان میں
موجود ہم جو ہیں بھی تو اپنے گمان میں

کیا فرق داغ و گل میں اگر گُل میں بو نہ ہو
کس کام کا وہ دل ہے کہ جس دل میں تو نہ ہو

اپنے بندوں پہ جو کچھ چاہو سو بیداد کرو
پر نہ آجائے کبھی جی میں کہ آزاد کرو

اِس ہستیِ خراب سے کیا کام تھا ہمیں
ای نشّۂ ظہور یہ تیری ترنگ ہے

تمنّا ہے تیری اگر ہے تمنّا
تری آرزو ہے اگر آرزو ہے

روندے ہے نقش پا کی طرح خلق یاں مجھے
ای عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

نہ وہ نالوں کی شورش ہے نہ وہ آہوں کی ہے دھونی
ہوا کیا درد کو پیارے گلی کیوں آج ہے سونی

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن
میں نے پوچھا تو کہا۔خیر یہ مذکور نہ تھا

رباعی

کچھ لائے نہ تھے کہ کھو گئے ہم
تھے آپ ہی ایک سو گئے ہم
جوں آئینہ جس پہ یاں نظر کی
ساتھ اپنے دو چار ہو گئے ہم

رباعی

ای درد یہ درد جی سے کھونا معلوم
جوں لالہ جگر سے داغ دھونا معلوم
گلزارِ جہاں ہزار پھولے لیکن
میرے جی کا شگفتہ ہونا معلوم

رباعی

پیری چلی اور گئی جوانی اپنی — ای درد کہاں ہی زندگانی اپنی
کل اور کوئی بیاں کرے گا اس کو — کہتے ہیں ہم آپ اب کہانی اپنی

درخشاں

تھی درائے ناقۂ لیلیٰ کی یہ ہر دم صدا — آہ مجنوں پاشکستہ رہ گیا محمل سے دور

رُسوا

رُسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے — ایسی نگاہِ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے
وصل میں بے خود رہے اور ہجر میں بے تاب ہو — اس دوانے دل کو رُسوا کس طرح سمجھائیے
وہ کون سی زمیں ہی جو اشکوں سے نم نہیں — رُسوا بھی اس زمانہ میں مجنوں سے کم نہیں
دیگرے را در گرفتاری شریکِ ما مکن — مدعا گر شہرتِ حسن ست یک رُسوا بس ست

رند

سینے سے داغِ عشق مٹایا نہ جائے گا — ہم سے تو یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

راقم

پہنچا نہ آہ درد کو میرے کوئی طبیب — یارب عجب طرح کا کچھ آزار ہی مجھے
سنتے ہیں ہم کہ ہوتی ہی جگ میں دوام صبح — ہو گی کبھی ای چرخ ہماری بھی شام صبح

قطعہ

ای باغباں نہیں ترے گلشن سے کچھ غرض — ہم کو قسم جو توڑیں ترے برگ و بر کہیں
اتنا ہی چاہتے ہیں کہ ہم اور عندلیب — آپس میں دردِ دل کہیں ٹک بیٹھکر کہیں
کہے کیا دردِ دل بلبل گلوں سے — اُڑا دیتے ہیں اُس کی بات ہنسکر

رضا

دنیا میں کوئی تجھ سا ستمگار نہیں ہی — بے رحم و جفا پیشہ و خونخوار نہیں ہی

زار

چھوٹ جاویں غم سے ہر دم کے جو نکلے دم کہیں — خاک ہے یہ زندگی جو تم کہیں اور ہم کہیں
ایک دن آگے ہی دُنیا سے اُٹھانا ہم کو — شبِ فرقت تو الٰہی نہ دکھانا ہم کو
ہمیں تو فرش سے اور تکیۂ مخمل سے بہتر ہے — گلی میں اُس کی پڑ رہنا سرہانے ہاتھ کو دھرے

سراج

نہیں ہے تاب مجھے تیرے سامنے جانا — کہاں سراج کہاں آفتابِ عالم تاب
اُس بن مجھ آنسوؤں کے شماروں کی کیا کمی — جس رات چاند نہیں ہے ستاروں کی کیا کمی
شعلہ خو جب سے نظر آتا نہیں — لوٹتا ہے تپ سے انگاروں پہ دل
وہ ظالم مجھکو جلتا دیکھکر اتنا نہیں کہتا — کہ کیا ثابت قدم ہے کیوں نہ ہو آخر سراج اپنا

سعادت

واللہ جو سرِ لوح ترا نام نہ ہوتا — ہرگز کسی آغاز کا انجام نہ ہوتا

سجّاد

جان و دل سب قبول ہے جانا — پر گلی میں تری مجھے آنا
اس فصلِ گل میں جوششِ جنوں کا ہوا ہے قہر — جنگل میں آ بسا ہے نکل کر تمام شہر
اس زمانے میں دوستی کا رنگ — آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے

سودا

سودا کا تو نے حال نہ دیکھا کہ کیا ہوا — آئینہ لے کے آپ کو دیکھے ہے تو ہنوز
غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں — جلوہ گر یار مرا ورنہ کہاں ہے کہ نہیں
فکرِ معاش ذکرِ بتاں یادِ رفتگاں — اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے
گر ہو شراب و خلوت و معشوقِ خوب رُو — زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے
عشرت سے دو جہاں کی یہ دل ہاتھ دھو سکے — تیرے قدم کو چھوڑ سکے یہ نہ ہو سکے

نادک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہی مرغ قبلہ نما آشیانے میں

منڈا اگر خط تم اپنے حق میں کیوں کانٹوں کو بوتے ہو
یہ عارض گل نہ ہووے عبث سبزہ بھی کھوتے ہو

صورت میں تو کہتا نہیں ایسا کوئی کب ہی
اک دھج ہی کہ وہ قہر ہی آفت ہی غضب ہی

پوچھے ہی پھول پھل کی خبر اب تو عندلیب
ٹوٹے جھڑے خزاں ہوئی پھولے پھلے گئے

گل پھینکے ہی عالم کی طرف بلکہ ثمر بھی
ای خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

نہ تلطف نہ مروّت نہ محبّت نہ وفا
سادگی دیکھ کے اس پر بھی لگا جاتا ہوں

محمّد میر سوز

یار یوں دور جا بسے اللہ
کیا زمانے کا انقلاب ہوا

سوز کچھ منہ بنائے آتا ہی
آج مجرے کا پھر جواب ہوا

اہل ایماں سوز کو کہتے ہیں کافر ہو گیا
آہ یارب رازِ دل ان پر بھی ظاہر ہو گیا

بغیر از عاشقی کچھ کام مجھ سے ہو نہیں سکتا
تڑپنے کے سوا آرام مجھ سے ہو نہیں سکتا

مثلِ نے ہر استخواں میں درد کی آواز ہی
کچھ نہیں معلوم یارب سوز ہی یا ساز ہی

شاعر

اپنے مطلب کی کہے جائیں گے ہم
گرچہ سو بار نہیں کیجیے گا

ضیا

کل کی رسوائی تجھے کیا کم نہ تھی ای ننگِ خلق
اُس کے کوچہ میں ضیا تو آج پھر جانے لگا

مجھ سا بندہ نہیں خدائی میں
ہاتھ سے ای صنم نہ کھو مجھکو

آہستہ پاؤں رکھیو ای بوئے گل چمن پر
سوتے ہیں اس زمیں میں نازک دماغ کتنے

اک تبسم میں کیا خلق کو ساری تسخیر
مسکرانا ہی ترا یا کہ کوئی افسوں ہی

کون سے زخم کا کھلا ٹانکا
آج پھر دل میں درد ہوتا ہی

کبھی جا گل کو دیکھے ہیں کبھی دیکھے ہیں نرگس کو
خدا جانے یہ چشم اپنے پھرے ہیں ڈھونڈتے کس کو

ہم نہ ثمر نہ ہم نہال ہوئے — اُگتے ہی ہم تو پائمال ہوئے
دل کے جلنے پر نہ کی رقت کسی نے رحم سے — خود بخود جل بل یہ انگارا دہک کر رہ گیا
کعبہ میں چھپ رہا ہی یا دیر میں نہاں ہی — خانہ خراب جلدی تو بول اُٹھ کہاں ہی
کیا کہا قاصد ضیاؔ سنتے ہی جس کے مرگیا — بات تھی کچھ یاس کی یا ہجر کا پیغام تھا

ظہورؔ

چشم گریاں حسن سے معمور ہی — چاندنی برسات کی مشہور ہی

مرزا عسکری

بات اب امتحان پر آئی — قصہ کوتاہ جان پر آئی

عشقؔ

کہنے کو اِدھر اُدھر گئے ہم — تھے تیری طرف جدھر گئے ہم
تھا کعبہ و دیر سے کسے کام — مقصود تھا وہ جدھر گئے ہم

فراقؔ

اسیروں کی قسم تجکو صبا سچ کہ کہ گلشن میں — کوئی اُن ہمنواؤں سے ہمیں بھی یاد کرتا ہی

فقیرؔ

زندگی موجِ آب ہی گویا — دم کا آنا حباب ہی گویا

فغاںؔ

دل بستگی قفس سے یہاں تک ہوئی مجھے — گویا کبھی چمن میں مرا آشیاں نہ تھا
یہ امتحاں نہ کر ای میرے مہربان عزیز — جہاں میں کوئی تجھ سے رکھے گا جان عزیز
فغاںؔ کو وصل میں آرام کیا ہو — جدائی کا تصور بندھ رہا ہی

فدویؔ

فدویؔ مرا ہی کام ہی روز اُٹھ کے جس طرح — رکھتا ہوں تھام تھام دلِ بے قرار کو

فارغ

اشک آنکھوں سے جو نکلا سو وہ گوہر نکلا
بعد مدت کے مری چشم کا جوہر نکلا

افصح

کر یاد تجھے جدھر گئے ہم
ہم تو نہ رہے کدھر گئے ہم

سرمۂ چشم جہاں ہیں ہونا
خاکساری کی کرامت دیکھی

قائم

ان دنوں چرخ پر نہیں یہ مہر
گو دیں کا نگڑی لیے ہے سپہر

دن کی کٹتی ہے دھوپ میں اوقات
کالے کمبل میں رات کاٹے رات

دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا
آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

ہر دم آنے سے میں بھی نادم ہوں
کیا کہوں پر رہا نہیں جاتا

یہ کہیو تو قاصد کہ ہے پیغام کسی کا
پر دیکھیو لینا نہ کہیں نام کسی کا

ہم نے ہر طرح ترے ہجر میں دل شاد کیا
ہچکی گر آئی تو یہ سمجھے کہ ہمیں یاد کیا

کوہ اور دشت میں بھی ہم نہ رہے آسودہ
ماتم قیس کیا یا غمِ فرہاد کیا

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ ہی من گیا

خوب نکلے ہم اُس کے کوچہ سے
ورنہ آئے تھے اک عذاب میں رات

آہ ای پیر چرخ قائم نام
یاں جو رہتا تھا اک جواں ہے یاد

بے شغل نہ زندگی بسر کر
گر اشک نہیں تو آہ سر کر

کچھ طرفہ مرض ہے زندگی بھی
اِس سے جو کوئی جیا تو مر کر

وہ محو ہوں کہ مثالِ حباب آئینہ
جگر سے اشک نکل تھم رہا ہے آنکھوں میں

خوش رہ ای دل اگر تو شاد نہیں
یاں کی شادی پہ اعتماد نہیں

میں کہا۔ عہد کیا گیا تھا رات
ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں

ناز و ادا کہیں، کہیں عجز و نیاز ہے
کس کس طرح سے یار مرا جلوہ ساز ہے

حسرتِ دل کو مری سمجھے وہی خستہ جسے
یار نے آکے دمِ بازپسیں دیکھا ہے

گو کہیں یار - بلاتا ہے وہ اب آتا ہے
پر اُسے میں تو سمجھتا ہوں وہ کب آتا ہے

شام ہوتی نہیں اک دل پہ بلا ہوتی ہے
صبح ہوتی نہیں اک جی پہ غضب آتا ہے

مر جائیے کسی سے پر الفت نہ کیجیے
جی دیجیے تو دیجیے، پر دل نہ دیجیے

شب گریہ سے وابستہ مری دل شکنی تھی
جو بوند بھی آنسو کی سو ہیرے کی کنی تھی

مردنِ دشوار ہیں یہ جان بے تقصیر ہے
حسرتِ دل سو طرف سے اس کی دامنگیر ہے

فلک رُلائے تو ہے ہم کو لیک یہ ڈر ہے
کہ بلبلا سا کہیں آپ ہی بہا نہ پھرے

مجھ سا کوئی جہان میں آشفتہ سر نہیں
ہے یوں تو زلفِ یار بھی پہ اس قدر نہیں

قائم ہیں عندلیبِ خوش آہنگ تھا ولے
زاغ و زغن کے ساتھ کیا ہم قفس مجھے

آج اے گریہ خبر لے مرے دیوانے کی
کچھ رُکا جاتا ہے دل گرد سے ویرانے کی

آج کی رات جو اُس گل کا میسر ہو وصال
شمعِ روشن میں کروں خاک پہ پروانے کی

قدرت

اہلِ عدم کو رمزِ فنا کا تھا کب شعور
سرمشقِ رفتگاں مرا لوحِ مزار تھا

تڑپوں ہوں خاک و خوں میں پڑا جس کے وار سے
قدرت میں کیا کہوں یہ وہی شہسوار تھا

کس کی نیرنگی پہ شمع پردۂ فانوس ہے
جو شرر دل سے اُٹھا سو جلوۂ طاؤس ہے

جوں نقشِ قدم ہیں ترے وہ خاک نشیں ہم
تا مٹ نہ چکیں آپ سے چھوڑیں نہ زمیں ہم

سینہ اُس کا ہے دل اُس کا ہے جگر اُس کا ہے
تیر بیداد جدھر رو کرے گھر اُس کا ہے

قربان

یوں بندِ قبا کھل گئے جو آن میں گل کے
کیا پھونک دیا تو نے صبا کان میں گل کے

کیا کچھ دلِ بلبل پہ کرے دیکھیے یہ عشق
سو چاک کیے جس نے گریبان میں گل کے

رباعی

کافر

کیا پھرتی ہی میکدے میں مٹکی مٹکی
زاہد عابد سے دور بھٹکی بھٹکی
قاضی کا نہ ڈر نہ محتسب کا کافر
یہ دخترِ رز بھی جب سے اٹکی اٹکی

کلیم

آتی ہی دل یہ قلقلِ مینا سے اب شکست
وہ دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا

گماں

مدت سے ہو رہا تھا مرا داغ داغ دل
اس گل کے دیکھتے ہی ہوا باغ باغ دل
فصلِ گل سے پھر ہوا اب گرم بازارِ چمن
مشتِ پر لے کر ہوئی بلبل خریدارِ چمن
مجھے تو زیست بھی دشوار ہو گئی ہی اب
خدا کرے کہ گماں ۔ دل مرا سنبھل جائے
قتل کر مجکو مری نعش پہ بولا قاتل
ہائے یارو یہ گماں تھا؟ مجھے معلوم نہ تھا

گریاں

دیکھے تو جسے نگاہ بھر کر
مر جاوے وہیں وہ آہ بھر کر
سبب روحی یہ پروانے کی جی کو داغ کرتی ہی
کہ دوش شمع پر رکھتا نہیں بارِ کفن اپنا

مضمون

ہم نے کیا کیا نہ ہجر میں محبوب کیا
صبرِ ایوبؑ کیا گریۂ یعقوبؑ کیا

میر مدد اللہ رند

اشک آنکھ سے دل ہاتھ سے جی تن سے چلا جائے
اے وائے مصیبت کوئی کس کس کو سنبھالے

منعم

بھولی نہیں ہی مجھکو بتوں کی ادا ہنوز
دل کے نگیں پہ نقش ہی نامِ خدا ہنوز
تصویر اس کی کھینچ کے ناز و ادا کے ساتھ
نازاں ہی اپنے آپ پہ دستِ قضا ہنوز

محمد تقی میرؔ

کیا دن تھے وہ کہ یاں بھی دلِ آرمیدہ تھا
رو آشیانِ طائرِ رنگِ پریدہ تھا

قاصد جو واں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا
بیچارہ گریہ ناک و گریباں دریدہ تھا

ہم اسیروں کو بھلا گیا جو بہار آئی نسیم
عمر گزری کہ وہ گلزار کا جانا ہی گیا

جی گیا میرؔ کا اس لیت و لعل میں لیکن
نہ گیا ظلم ہی تجھ سے نہ بہانا ہی گیا

کہاں آتے میسر مجھ کو تجھ سے خود نما اتنے
یہ حسنِ اتفاق آئینہ تیرے روبرو ٹوٹا

کہا میں نے کتنا ہے گُل کا ثبات
کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا

صبا دل ہے داغِ جدائی سے رشکِ باغ
تجھکو بھی ہو نصیب یہ گلزار دیکھنا

میں وہ رونے والا چلا ہوں جہاں سے
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

بیتاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا
جیتے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا

لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اُٹھے
ہے خیر میرؔ صاحب! کچھ تم نے خواب دیکھا

گزرا بنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا
خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا

وصل میں رنگ اُڑ گیا میرا
کیا جدائی کو مُنہ دکھاؤں گا

کھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اس کی میرؔ
سمندِ ناز کو اِک اور تازیانہ ہوا

مانند شمع آتشِ غم سے پگھل گیا
بزمِ جہاں میں روتے ہی روتے میں گل گیا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

یہ چھیڑ دیکھ ہنس کے رخِ زرد پر مرے
کہتا ہے میرؔ رنگ تو کچھ اب نکھر چلا

رخصتِ سیرِ باغ ہمیں نہ ہوئی
یوں ہی جاتی رہی بہار افسوس

گُل کی جفا بھی دیکھی دیکھی وفائے بلبل
اک مشتِ پَر پڑے تھے گلشن میں جائے بلبل

کی سیرِ جذبِ اُلفت گلچیں نے کل چمن میں
توڑا تھا شاخِ گل کو نکلی صدائے بلبل

ہم تو اسیرِ کنجِ قفس ہو کے مر چلے
ای اشتیاقِ سیرِ چمن تیری کیا خبر

مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میرؔ کی شب کو
مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو

ہوگا کسی دیوار کے سایہ میں پڑا میرؔ
کیا ربط محبت سے اُس آرام طلب کو

مرتے ہیں تیری نرگسِ بیمار دیکھکر
جاتے ہیں جی سے کس قدر آزار دیکھکر

جاتا ہی آسماں لیے کوچہ سے یار کے
آتا ہی جی بھرا در و دیوار دیکھکر

رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

آتا ہی جی میں حال بد اپنا بھلا کہوں
پھر آپ ہی آپ سوچ کے کہتا ہوں کیا کہوں

نازِ چمن وہی ہی بلبل سے گو خزاں ہی
ٹہنی جو زرد بھی ہی سو شاخِ زعفراں ہی

از خویش رفتہ اکثر رہتا ہی میرؔ اُس بن
کہتے ہو بات کس سے وہ آپ میں کہاں ہی

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے
اس طرح کے رونے کو کہاں سے جگر آوے

کوئی کانٹا سرِ راہ کا ہماری خاک پر بس ہی
گل و گلزار کیا درکار ہی گورِ غریباں کو

کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

دمِ نزع دشوار دی جان اُس نے
مگر میرؔ کو آرزو تھی کسی کی

مر گیا کوہکن اسی غم سے
آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہی

کتنا خلافِ وعدہ ہوا ہوگا وہ کہ یاں
نومیدی اور اُمید مساوات ہو گئی

وہ کیا چیز ہی آہ جس کے لیے
ہر اک چیز سے دل اُٹھا کر چلے

دکھائی دیے یوں کہ بیخود کیا
ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے

کوئی نا اُمیدانہ کرتے نگاہ
سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے

بے بسی سے تو تری بزم میں ہم بہرے بنے
نیک و بد کوئی کہے بیٹھے سنا کرتے ہیں

اُس کے کوچے میں نہ کر شورِ قیامت کا ذکر
ایسے ہنگامے تو یاں روز ہوا کرتے ہیں

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں
یاں کبھی سرو و گل کے سائے تھے

ڈوبے اُچھلے ہے آفتاب ہنوز
کبھی دیکھا تھا تجھکو دریا پر

ان دنوں یاروں کی نظروں سے نہاں رہتے ہو
خوش رہو میرؔ مری جان جہاں رہتے ہو

رباعی

ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے
خونابہ کشی مدام کی ہے ہم نے

یہ مہلتِ کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر
مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

منّت

منّتؔ ایسے کو دل دیا تو نے
اے مری جان کیا کیا تو نے

محبؔ

عارض اُس کے تھے عرق سے یوں سحر بھیگے ہوئے
جس طرح شبنم سے ہو گلبرگِ تر بھیگے ہوئے

اشک سے مژگاں ہے نم تجھ تک پہنچتی نہیں نگاہ
مانعِ پرواز ہیں طائر کے پر بھیگے ہوئے

ممتاز

ڈروں میں کس لیے رنجش سے پیار میں کیا تھا
میں اب خزاں کو جو روؤں بہار میں کیا تھا

جفائے یار نے کس طرح کر دیا مایوس
اور اپنی خاطرِ اُمیدوار میں کیا تھا

ترے ہی واسطے آئے عدم سے ہم یاں تک
وگرنہ ہستیِ ناپائدار میں کیا تھا

عشق میں عرضِ تمنّا مانعِ دیدار ہے
میرا ہی دستِ دعا آئینہ پر مرے دیوار ہے

یاد اُس شوخ کی اس دل میں بھری رہتی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ اس گھر میں پری رہتی ہے

محترم

محترم کیا بیاں کروں تجھ سے — اِس دلِ داغدار کی صورت

مستمند

نزع تک وصل کی ہی یار اُمید — ہی مثل ایک دم ہزار اُمید

مائل

کہتا نہ تھا کہ بانہ آ ہر دم کی اس ہنسی سے — آخر گیا نہ ظالم اِک بے گناہ جی سے

مصحفی

کوئی خوابیدہ ہم سے جا لگتے ہیں — نہ اتنی سعی ای بانگِ جرس کر
جہاں کا گل بنے وہ شوخ یارب — مجھے تو اس چمن کا خار و خس کر
وقفہ ای پیک نگاہ دیدۂ تر ہی در پیش — دن ہیں برسات کے اور رہ میں خطر ہی در پیش
دلِ حیراں کی مرے دیکھیے صورت کیا ہو — اب تو واں آئنہ ہی آٹھ پہر ہی در پیش
ہی نہاں داغِ جگر زخمِ نمایاں کے تلے — جس طرح لالہ کہیں ہو گلِ خنداں کے تلے
آشیاں بندی کی تکلیف نہ کر ہم کو ہوس — گر رہیں گے کسی دیوارِ گلستاں کے تلے

مجذوب

چھوٹے اگر قفس سے تو خاموش عندلیب — صیّاد نے سُنا یہ ترانہ تو ہم رہے
عجب قسمت ہی اپنے دل کی بازارِ محبّت میں — جو کوئی صبح اُس کو لے گیا تو شام لے آیا

ناجی

اُس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں
عارضی میری زندگانی ہی

ولیؔ

پھر میری خبر لینے وہ صیّاد نہ آیا
شاید کہ اُسے حال مرا یاد نہ آیا

صنم کے لعل پر وقت تکلّم
رگِ یاقوت ہی موجِ تبسّم

زندگی جامِ عیش ہی لیکن
فائدہ کیا اگر مدام نہیں

عجب کچھ لطف رکھتا ہی شبِ خلوت میں مہرو سے
سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

اے جانِ ولیؔ وعدۂ دیدار کو اپنے
ڈرتا ہوں مبادا کہ فراموش کرے تو

ہی حسن ترا ہمیشہ یکساں
جنّت سے بہار کیوں کے جائے

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہی اُس کو
کرتی ہی نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی

میر ابوالحسن وحشت

لگتا ہی مجھکو آج یہ سارا جہاں خراب
شاید کہ مر گیا ہی کوئی خانماں خراب

وفاؔ

حسنِ عمل پہ اپنے نہ بھول اس قدر کہ شیخ
واں کے معاملے کی کسی کو خبر نہیں

دکھ نہ دے اس قدر وفاؔ کے تئیں
آخرش وہ بھی جان رکھتا ہی

بس کہ اپنے انقلابِ بخت سے ڈرتے ہیں ہم
بسترِ گل پر بھی لرزاں ہی قدم دھرتے ہیں ہم

کل کا وعدہ کر لیا ہی اُس نے ای محرم تو کیا
یاں تو بیتابی سے دل کی آج ہی مرتے ہیں ہم

نہ کشتی پار ہی بہ کر گئی اپنی نہ دار آئی
ہوئے ہیں غرقِ دریا اُس گھڑی جب عین دھار آئی

میر بہادر علی وحشت

شب روز وصل کو روئیے کہ عجب وہ لیل و نہار تھا
کبھی ہم سے یار کو لُطف تھا کبھی ناز تھا کبھی پیار تھا

یکرنگ

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہی
میرا صبر و قرار جاتا ہی

خیال چشم و ابرو کرکے تیرا — کوئی مسجد گیا کوئی خرابات

زخمی برنگ گل ہیں شہیدانِ کربلا — گلزار کی نمط ہی بیابانِ کربلا

اندھیری ہی جہاں ہیں کہ اب شامیوں کے ہاتھ — ہی سر بریدہ شمع شبستانِ کربلا

یار

جائے سنگِ لوحِ تربت نصب کیجو آئینہ — تا کوئی جانے کہ یہ حسرت کشِ دیدار تھا

آفریں اے دستِ گستاخِ محبت۔ آفریں — یہ گریباں ایک مدت سے گلے کا ہار تھا

١٦ر نومبر ١٩٢١ء
حیدر آباد (دکن)

محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی

نوٹ:۔ (١) طبع جدید میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے نسخے سے مطابقت کر کے تصحیح کی گئی ہی۔

(٢) بعض اشعار کے ساتھ ن، م یا نم لکھا گیا ہی۔ ن سے مراد یہ ہی کہ یہ شعر "نکات الشعرا" میں موجود ہی، م کا اشارہ اس بات کی طرف ہی کہ یہ شعر "مخزن نکات" میں موجود ہی اور نم اس بات کی علامت ہی کہ یہ شعر "نکات الشعرا" اور "مخزن نکات" دونوں میں موجود ہی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرۂ میر حسن

سخن سنجانِ مضمون پرور را حمدِ قادرے کہ زبانِ لالِ قلم را از سرمۂ دودہ ہم چشم منقارِ بلبلاں نمودہ اند، محال، و نکتہ پردازانِ معنیٰ گستر را ثنائے صانعے کہ حسنِ شاہدِ مضمون را در آئینۂ الفاظ جلوۂ عروسی دادہ، بہ نظرِ صاحب نظراں در آوردہ اند، وہم ست و خیال۔ سبحان اللہ، مشبّہ را ہوسِ منزّہ در سر آید، لاحول ولا قوۃ الّا باللہ، چہ حمدے کہ سزاوارِ محمدتِ اوست بہ زبانِ محبوبِ خود فرمودہ، الحمد للہ ربّ العٰلمین، الرّحمٰن الرّحیم، مٰلک یوم الدّین، و غریقِ بحرِ معصیت از زبانِ زیاں کار نعتِ معجز بیانے کہ شادابیِ کلامش سبعۂ معلقہ را از عرقِ خجالت فصحائے بطحیٰ را شستہ بہ چہ رو گویاند، محض جرات ست و مجال، چہ لغتے کہ در خورِ لیاقتِ اوست محبِّ او فرمودہ، وما ارسلنٰک الّا رحمۃً للعٰلمین، ایّاک نعبد و ایّاک نستعین، و صیائے او کہ ہر یک صراط المستقیم اند روندگانِ طریقِ ہدایت را و خضرِ راہ اند گم گشتگانِ بادیۂ ضلالت را در منقبتِ ایشاں

از خود چہ انشا کند غیر ازیں مناجات کہ اِھدنا الصّراط المستقیم، صراط الّذین انعمت علیہم، غیر المغضوب علیہم ولا الضّالّین - آمین۔

امّا بعد، ایں پروردۂ آغوشِ رنج و محن، اسیرِ دار الحزن، میر غلام حسن ابنِ میر غلام حسین، بن میر عزیز اللہ را تمنّائے آں شد کہ تذکرۂ سخن آفرینانِ ہندی زباں را کہ چمن چمن گل ہائے رنگیں معانی و گلشن گلشن نازک خیالی در گریبانِ دیواں ہا ریختہ اند، دستہ بندِ صفحۂ اوراق نماید، تا ہر صاحب نظرے از تماشائے آں بہ حمدِ صانعِ حقیقی ذاکر شود کہ مصنوعِ او یک عروس را بہ ہزاراں ہزار بوئے معانی پیچیدہ۔ اگر عاشقانہ است، بیاباں بیاباں وحشت در دست و گر مجنونانہ است جفا جفا غمزہ بہ اوست - اگر بزمیہ است محفل محفل طنّازی ست، و گر رزمیہ است میداں میداں جاں بازی ست۔ اگر تعریفِ خوش خرام ست قمری سروِ قالِ شاں خندہ بر کبکِ کوہسار دارد، و گر تعریفِ خوں آشام دمِ او چشمک بر برقِ خاطف می زند۔ غرض ازیں جا ثابت می شود معنی الحمد کہ جمیع محمدت محمودِ حقیقی ست۔ وما توفیقی اِلّا باللہ، علیہ توکّلت والیہ مآب -

پس از دریافتِ حالِ خیر مآلِ ہر صاحب سخن تتمّہ کہ از دوستانِ حقیقت داں مسموع نمودہ، در ذیلِ اشعارِ ہر یک نوشت، و مطابقِ حروفِ تہجّی نامِ ہر یک را ضبط نمود، تا جویائے را تردّد نہ افتد، و دعائے خیر در حقِ خلف و سلف نماید۔ مدّعائے فقیر از ذکرِ جمعِ کثیر ہمیں ست و بس - شاید بہ طفیلِ ایں بزرگاں کسے را توفیق در حقِّ ایں جامع آید۔

وباللہِ التّوفیق وعلیہ التّکلان -

ذکرِ اوّل

(۱) **آفتاب**: بادشاہِ جم جاہ، سکندر سپاہ ظلّ اللہ، شاہ عالم بادشاہ۔ باوجودِ شغل جہاں بانی و فرماں روائی گاہ گاہ بہ حسب اتّفاق زبانِ الہام بیان را بہ گفتنِ رباعی و بیتے کہ عبارت از فارسی و ریختہ نیز باشد گل فشانی می نماید، و آفتاب تخلّصِ او دریں زماں اظہر من الشّمس ست۔ خلّد اللہ ملکہٗ وافاض اللہ برّہٗ و احسانہٗ من غزل:

صبح تو جام سے گزرتی ہے　　شب دل آرام سے گزرتی ہے

عاقبت کی خبر خدا جانے　　اب تو آرام سے گزرتی ہے

حرف (ا)

متقدّمین

باید دانست کہ ریختہ اوّل از زبانِ دکن رواج یافتہ۔

(۲) **آزاد**: فقیر اللہ، آزاد تخلص از حیدر آباد بود۔ در صغرِ سن یتیم شد، اہلِ محلّہ عزیز می داشتند، چوں بہ حدِّ بلوغ رسید عشق گل رُخے ورزیدہ، مانندِ عندلیب نالاں بہ آہ و فغاں بہ سر می نمود، و بہ رنگِ صبا سراسیمہ می گشت، یک جا قرار نہ می گرفت، چناں چہ ہم راہِ فراقی، دکنی در شاہ جہاں آباد آمدہ بود۔

طبع دردمندے داشت و بسیار بہ صفا حرف می زد۔ خدایش بیامرزد۔ ازوست:

نم کوئی کسی ہی فن میں مجھ ساتھ بر نہ آیا — پر جس سے یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

(۳) **احمد**: احمد گجراتی از قدیم ست۔ دیگر احوالش معلوم نیست۔ ازوست:

ن ہوئے دیدار کے طالب خودی سے خود گزر نکلے
نہ پائی راہ دانش میں خروشاں بے خبر نکلے

(۴) **افضل**: محمد افضل، افضل تخلص از قدیم ست۔ کدام ہندو بچہ، گوپال نامی بود کہ برو عاشق شدہ، حسبِ حالِ خود بارہ ماسا، عرف بکٹ کہانی گفتہ کہ اکثر کھتریاں و گاینان مشتاق او می باشند۔ نصفے فارسی و نصفے ہندی دارد، لیکن قبولیّت دادِ الٰہی ست، بر دل ہا اثر می کند از آں جملہ است:

م پڑی ہر گل میں میرے پیم پھانسی — مرن اپنا ہوا اور لوگوں کو ہانسی
مسافر سے جنھوں نے دل لگایا — انھوں نے سب جنم روتے گنوایا

(۵) **اوجی**: اوجی تخلّص از پیرزادہ ہاے حیدرآباد بود۔ اوّل در شعر و شاعری آخر بہ عبادت گزرانید۔ غفر اللہ لہٗ:

م درپن سیتی نگاہ کو مائل نکو کرو — یہ دُکھ اپس کے واسطے حاصل نکو کرو

(۶) **احمد**: احمد گجراتی دیگر، در زبان سنسکرت و بھاکھا می گویند کہ تصانیف بسیار دارد۔ چوں معاصرِ شاہ ولیؔ اللہ، ولی بود، دو سہ ریختہ نیز گفتہ۔ خدایش بیامرزد:

م شب جھوٹے وعدوں پر جو ترے ہم بہک گئے
کوئی لاکھ بار گھر سے اُٹھے در تلک گئے

م پوچھی تھی کل بُتاں سے کہیں دل کی میں خبر
سو آج لا کے سر سے وہ میرے پٹک گئے

م احمد بتا میں کیا کروں اب راہِ عشق میں
سر پر تو سانجھ پڑ گئی اور پانو تھک گئے

(۷) **امجد**: امجد تخلص نیز شخصے از قدیم ست۔ اکثر قوّالاں ایں غزلِ او را می خوانند:

سُنتا تھا جسے کعبہ و بت خانہ میں آخر
امجد میں اُسے حضرتِ انسان میں دیکھا

متوسّطین

(اواخرِ فرخ سیر و ابتدائے سلطنتِ محمد شاہ بادشاہ)

(۸) **آرزو**: خانِ مغفرت نشان، سرگروہِ سخن سنجاں، استادِ اُستادانِ ہندوستانِ جنّت نشاں، چراغِ دودمانِ گفتگو، سراج الدین علی خاں آرزو بعد امیر خسرو دہلوی چنیں صاحبِ کمال پُر گو و خوش گو بہ مسامعِ عالمیان نہ رسیدہ۔ ہفت دیوان دارد کہ ہر یکے پہلو بہ نظیری و فغانی می زند، و دیگر چند تصنیفات دارد۔ فکرِ صائب او تزلزل در ارکانِ مضامینِ مبتذل انداختہ۔ شاعرِ فارسی و عالم فاضل۔ شہرۂ آفاق، در سخن فہمی طاق۔ اُستادانِ ریختہ نیز شاگردِ اویند۔ برائے تفنّنِ طبع دو سہ ریختہ خود ہم فرمودہ۔ نوّر اللہ مرقدہٗ:

ن جان کچھ تجھ پہ اعتماد نہیں
زندگانی کا کیا بھروسا ہے

نم مے خانے بیچ جا کر شیشے تمام توڑے
زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے

نم رکھے سی پارۂ گُل کھول آگے عندلیبوں کے
چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

ن آتا ہے صبح اُٹھ کر تیری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشیدِ خاوری کو

(۹) **انسان**: اسد یار خاں، المتخلص بہ انسان، مردے بود بہ کمالِ انسانیت و قابلیت۔ دراں زماں بہ پایۂ امارت رسیدہ، بسیار بہ کرّ و فرمعاش می نمود۔

خدا ایشں بیامرزد :

ن نہ دیکھی اک جھلک بھی آن کر تن بیچ اندھوں نے
اگرچہ ہر بُنِ مُو سے بدن سارا شبکہ ہے

نم زمیں اور آسماں اور مہر و مہ سب تجھ میں ہیں انساں
نظر بھر دیکھ مشتِ خاک میں کیا کیا جھمکا ہے

سودا خیالِ خام کا سر سے گزر گیا تل باندھتے تھے جس میں وہ کملی نہیں رہی

باید دانست کہ سخن سنجانِ آں زماں در پے صنعتِ ایہام می بودند و تلاشِ لفظِ تازہ می نمودند۔ چوں طرزِ تازہ بود، خوشش می آمد۔ لیکن، اکثرے ازیں بحر گوہرِ شہوار بردند و بعضے بہ سببِ تلاشِ لفظ خزف ریزہ بہ کف آوردند۔ چار و ناچار برائے یادگار قلمی می نماید۔ معذور باید داشت۔

(۱۰) **محمّد اشرف** : محمّد اشرف ہم عصرِ میاں آبرو شخصے بود :

پی پل میں نیم خواب ہو ڈر بڑدے گالیاں اس غم سے خاک عاشقاں سیسوں پہ ڈالیاں

(۱۱) **میرزا اکبر قلی** : میرزا اکبر قلی اکبر آبادی :

جا کہہ نسیمِ گُل سے سرما کا خوف مت کر بلبل کے بال و پر سے تو سی بنا دوشالا

(۱۲) **افگار** : افگار تخلّص :

چاہیے گر بُت کو پوجو دل کو بُت خانہ کرو رام ہے سرجن تمھارا گھٹ میں پہچانا کرو

(۱۳) **آزاد** : خواجہ زین العابدین، آزاد تخلّص۔ جوانِ محمّد شاہی بود۔ از وست :

جبھی بلبل نے چھوڑے شعلۂ آواز کے جھکے
تبھی گلشن کے سارے جل اُٹھے گُل اور کنوّل دہکے

(۱۴) **آبرو** : آبرو، غنچۂ گلزارِ گفتگو، از شاگردانِ سراج الدّین علی خاں، آرزو
میاں نجم الدّین، عرف شاہ مبارک، المتخلّص بہ آبرو، نبیرۂ حضرت محمّد غوث گوالیاری

نوّراللہ مرقدہٗ - از ابتدائے جوانی مشقِ سخن می کرد - شاعر خوش گوے
در وقتِ خود بود - خدائیش بیامرزد :

نم دل تو دیکھو آدمِ بے باک کا عشق سے پُتلا بھرا ہی خاک کا
ن کچھ ٹھہرتی نہیں کہ کیا ہوگی اِس دلِ بے قرار کی صورت
ن کریں جو بندگی ہوئیں گنہ گار بُتاں کی کچھ نرالی ہی خدائی
بوسہ لباں سے دینے کہا کہ کے پھر گیا پیالہ بھرا شراب کا افسوس گر گیا نم
قول آبرو کا تھا کہ نہ جاؤں گا اُس گلی ہو کر کے بے قرار دیکھو آج پھر گیا نم
مشتاقِ عذر خواہی نہیں آبرو تو کیا ہی یہ روٹھ روٹھ چلنا چل چل کے پھر ٹھٹھکنا نم
دور خاموش بیٹھ رہتا ہوں اس طرح حال دل کا کہتا ہوں نم
اُٹھ چیت کیوں جنوں سیتی خاطر نچنت کی آئی بہار تجھ کو خبر ہی بسنت کی نم
لٹک چلنا سجن کا بھولتا اب تک نہیں مجھ کو طرح وہ پانو رکھنے کی مری آنکھوں میں پھرتی ہی نم
آبرو کے قتل کو حاضر ہؤا کس کر کمر خون کرنے کو چلا عاشق پہ تہمت باندھ کر ن
کیوں ملامت اِس قدر کرتے ہو بے حاصل ہی یہ لگ چکا اب چھوٹنا مشکل ہی اس کا دل ہی یہ نم
کہتا ہوں میں پکار، سُنو کان دھر سجن جو اور سے ملو گے تو دیکھو گے ہم نہیں نم
میاں کے لوگ کہتے ہیں کمر ہی کہاں ہی؟ کس طرح کی ہی؟ کدھر ہی؟ نم
زلف کی شان ٹک اوپر دیکھو کہ گویا عرش پہ لٹکتی ہی نم
کیا ہؤا گو کہ مر گیا فرہاد روح تیشہ سے سر پٹکتی ہی ن
پھرتے تھے دشت دشت دوانے کدھر گئے وی عاشقی کے آہ زمانے کدھر گئے م
نہ چھوڑے گا پیارے جی کسی کا تمھارا ہنس کے یہ کہنا اجی کا
زندگی ہی سراب کی سی طرح باؤ بندی حباب کی سی طرح نم
کون چاہے گا گھر بسے تجھ کو مجھ سے خانہ خراب کی سی طرح نم

تب سیتی دل کو بے قراری ہے — جب سے ملنے کا کر گیا ہے قرار
جلتا ہے اب تلک ترے مکھڑے کے رشک سے — ہر چند ہو گیا ہے چمن کا چراغ گُل
نالہ ہمارے دل کے غم کا گواہ بس ہے — دینے کے تئیں شہادت انگشتِ آہ بس ہے
دل کب آوارگی کو بھولا ہے — خاک گر ہو گیا بگولا ہے نم
شوق سے جس گھر میں ہو تو جلوہ گر — آئینے ہو جائیں دیواروں میں دل

(۱۵) **اشتیاق** : شاہ ولی اللہ درویشے بود بہ کمالِ خوبی و اخلاق، المتخلّص بہ اشتیاق، از اولادِ مجددِ الفِ ثانی۔ نبیرۂ شاہ محمد گل۔ مولد او سرہند بود۔ در کوٹلۂ فیروز شاہ کہ در شاہ جہان آباد مشہور است، مسکن داشت۔ از جملۂ استادانِ ایہام بند بود۔ الحق کہ بسے خوش فکر و خوش تلاش۔ از وست:

نم چھوڑ کر تم کو ہمیں اور سے جو لاگ لگی — نہیں یہ مہندی ترے تلووں سے ہے آگ لگی
نم بُتاں جو ہجر کی باتیں ہمیں سُناتے ہیں — کچھ اِن کا دوس نہیں یہ خدا کی باتیں ہیں
م دو بالا ہو گی مخموری عبث آنکھوں کو ملتا ہے — پیالہ اور بھی پی لے سجن یہ دَور چلتا ہے

وقتے کہ نوّاب روشن الدولہ مغفور از شاہ جہان آباد تا درگاہِ قطب صاحب کہ عرصۂ ہفت کروہ خواہد بود، چراغاں کردہ بود دراں باب گفتہ:

ایسا مُرید کیوں نہ دو عالم میں نسترے — پیروں کی راہ میں جو کروروں دیا کرے

(۱۶) **احسن** : میاں احسن اللہ، احسن تخلّص۔ در ہماں عصر بود بہ کمالِ خوبی۔ طبعش بسیار مائلِ ایہام بود۔ خدا ایش بیامرزد۔ از وست:

نم یہی مضمونِ خط ہے احسن اللہ — کہ حسنِ خوب رویاں عارضی ہے
م لام نستعلیق کا ہے اُس بُتِ خوش خط کی زلف — ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اِس لام کے

(۱۷) **احسن** : علی احسن خاں، خانِ سامانِ عمدۃ الملک، امیر خاں۔ احسن تخلّص خدا ایش بیامرزد۔ از وست:

مدّت ہوئی ہے دل کو وہ دل بر کے ساتھ ہے
دل تو ہمارے ہاتھ نہیں اُس کے ہاتھ ہے

(۱۸) **الف خاں** : الف خاں، اصلش افغان بود۔ بہ لباس فقیری بسر می بُرد۔ خدایش بیامرزد۔ از وست :

پہلے قدم میں عشق کے میرا تو جی گیا
مجنوں یہ چند روز بھلا کیوں کے جی گیا

(۱۹) **افغاں** : ہنگن خاں، متخلّص بہ افغاں، رونہٗ سرکار امۃ الحبیب بود۔ موافقِ نام و نسبِ خود می گفت :

خسرو سے ملی شیریں جب شیر و شکر ہو کر
پتّھر سے پٹک سر کو فرہاد بہت رویا

(۲۰) **امیر خاں** : نوّاب امیر خاں، از امرائے عظام و ظرفائے عالی مقام، نوّاب عمدۃ الملک۔ خوش طبع و شیریں کلام از مقرّبانِ درگاہِ فردوس آرام گاہ بود۔ لطائف و ظرائف او مشہور و معروف ست۔ گاہ گاہ اشہبِ فکر را بہ حسبِ اتّفاق در میدانِ نظم نیز جولاں می نمود۔ نمک حرامے او را بہ مشورۂ دشمنانش سرِ سواری اندرونِ قلعۂ شاہ جہاں آباد شہید کرد۔ غفر اللہ لہٗ۔ از وست :

ٹک تو فرصت دے کہ رخصت ہو چلیں صیّاد ہم
مدّتوں اس باغ کے سایے میں تھے آباد ہم

میں بلائی بھیڑ ہیں یہ مجھ سے نادانی ہوئی
دخترِ رز بزم میں آ شرم سے پانی ہوئی

(۲۱) **افگار** : سیّدِ عالی نسب، والا حسب، غنچۂ گلشنِ افکار، میر جیون المتخلّص بہ افگار، از شاہ جہاں آباد ست۔ بیشتر فکرِ منقبت می کرد۔ از مدتے برائے زیارتِ مشہدِ مقدس رفت، از بس کہ عقیدۂ درست داشت بر مزارِ مقدّس بہ قرآں خوانی جا یافت۔ نقل ست روزے خادمِ آں جا مثلِ دیگر فقرا از لنگر خانہ بہ میرِ موصوف شلّہ تقسیم کردہ بود، در خواب بشارت یافت کہ ایں عزیز از برائے ما از ہند آمدہ است۔ ایں را از اطعمۂ خاص می دادہ باشند۔ خوشا بہ حالِ شخصے کہ امامِ زماں سفارش او نماید۔ یک شعر دریں ولا

ازاں جا گفتہ فرستادہ است۔ الحق کہ مضمونِ تازہ یافتہ است۔ خدایش سلامت دارد:

علی کا بیاہ ایسا جگمگا تھا شبِ معراج جس کا رتجگا تھا

فقیر حسنِ مطلع رسانیدہ، اگر قبول افتد زہے طالع:

دو شعلہ طور کا جو تھا سو اس رات مثالِ شمع تختوں پہ لگا تھا

(۲۲) **امّید**: قزل باش خاں، اُمید تخلّص، مردے بود ولایت زا، چناں چہ دیوان فارسی از و مشہور ست۔ بسیار خوش معاش و یار باش بود۔ با مردمِ ہندوستان بسیار اختلاط ہا داشت و از صحبتِ ایں مردم علی الرّغمِ قومِ خود خوش بود۔ خدایش بیامرزد۔ از وست:

در و دیوار سے اب صحبت ہے یار بِن گھر میں عجب صحبت ہے تم

متأخّرین

(۲۳) **اثر**: از فصحاے نام دار و صلحاے کامگار، خوش اوقات و نیک سیر، عرف محمد میر، المتخلّص بہ اثر۔ درویشے ست مؤقّر و صاحب سخنے ست مؤثّر۔ عالم و فاضل، رتبۂ قدرش بہ غایت بلند، گوہرِ صدرش نہایت ارجمند، برادرِ خورد خواجہ میر درد، دام افضالہٗ، و شرح رسالہ دارد او را مسمّیٰ بہ توارد بہ کمال قوّت و زور نوشتہ۔ در خدمتِ برادرِ بزرگوارِ خود گوشہ نشینی اختیار کردہ، و قدم بر جادۂ بزرگانِ خود نہادہ، بہ سر می برد۔ حق تعالیٰ سلامت دارد:

بس رفع اب خیالِ مَے و جام ہو گیا ساقی بہ یک نگاہ مرا کام ہو گیا
میرے تئیں تو کام نہ تھا کچھ تو ہے آہ پر دل کے ساتھ مفت میں بدنام ہو گیا

کچھ اِن روزوں دل اپنا سخت بے آرام رہتا ہے
اِسی حالت میں لے کر صبح سے تا شام رہتا ہے

کلیجا پک گیا ہیں کیا کہوں اس دل کے ہاتھوں سے
ہمیشہ کچھ نہ کچھ اس ہیں خیالِ خام رہتا ہی
بیاں ہیں کیا کروں اب اس سے آگے اپنی ناکامی
ترے یہ طور اور مجھ کو تجھی سے کام رہتا ہی

تجھ سوا کوئی جلوہ گر ہی نہیں — پر ہمیں آہ کچھ خبر ہی نہیں
دردِ دل چھوڑ جائیے سو کہاں — اپنے باہر تو یاں گزر ہی نہیں
تیری اُمّید چھٹ نہیں اُمّید — تیرے در کے سوائے در ہی نہیں
حال میرا نہ پوچھیے مجھ سے — بات میری تو معتبر ہی نہیں
کر دیا کچھ سے کچھ ترے غم نے — اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

جو سزا دیجے ہی بجا مجھ کو — تم سے کرنی نہ تھی وفا مجھ کو
وہی میں ہوں اثر وہی دل ہی — اب خدا جانے کیا ہوا مجھ کو

کیا کیجے اختیار نہیں دل کی چاہ میں — ہیں سب وگرنہ تیری یہ باتیں نگاہ میں
ایسے کے خیر خواہ ہوئے ہم کہ جس کو آہ — بدخواہ ہی میں فرق نہ کچھ خیر خواہ میں

اثرؔ کیجیے کیا کدھر جائیے — مگر آپ ہی سے گزر جائیے
کبھو دوستی ہی کبھو دشمنی — تری کون سی بات پر جائیے

بس ہو یارب یہ امتحان کہیں — یا نکل جائے اب یہ جان کہیں
وائے غفلت کہ ایک ہی دم میں — ہیں کہیں اور کاروان کہیں
صرفِ غم ہم نے نوجوانی کی — واہ کیا خوب زندگانی کی
بے وفا تجھ سے کچھ گلہ ہی نہیں — تو تو گویا کہ آشنا ہی نہیں
یا خدا پاس یا بُتاں کے پاس — دل کبھی اپنا یاں رہا ہی نہیں
دل سے جو چاہیے سو باندھیے بات — میں نے واللہ کچھ کہا ہی نہیں

ہم ہیں بے دل دل اپنے پاس نہیں — آہ اس کا بھی تجھ کو پاس نہیں
پوچھ مت حالِ دل مرا مجھ سے — مضطرب ہوں مجھے حواس نہیں
بے وفا تیری کچھ نہیں تقصیر — مجھ کو میری وفا ہی راس نہیں
یوں خدا کی خدائی برحق ہے — پر اثرؔ کی ہمیں تو آس نہیں
میں کہاں تو کہاں یہ کہتے ہیں — کہ یہ آپس میں دونوں رہتے ہیں
عاشقی اور عشق کی باتیں — سب جہاں سے اثرؔ کے ساتھ گئیں
آہ کے ساتھ جی نکل نہ گیا — آہ اے آہ یہ خلل نہ گیا

۲۴) **الم** : منبعِ اشفاق وکرم میاں صاحب میرؔ، المتخلّص بہ المؔ، بزرگ و بزرگ زادۂ عالی نسبؔ والاحسب، خلفِ حضرتِ خواجہ میر دردؔ۔ چندے بہ فیض آباد تشریف آوردہ بود، الحال در دہلی باز در خدمتِ پدرِ بزرگوارِ خود استقامت دارد۔ گاہ گاہے فکرِ دو سہ بیت ہم می نماید۔ خدایش سلامت دارد۔ از وست :

نہ دل کو قرار بے قراری کے سبب — نہ چشم کو خواب اشک باری کے سبب
واقف نہ تھے ہم توان بلاؤں سے کبھی — یہ کچھ دیکھا سو تیری یاری کے سبب

۲۵) **اجمل** : محمد اجملؔ، اجملؔ تخلّص الہ آبادی ست۔ از فرزندانِ شاہ خوب اللہ بہ کمالِ فضیلت و آدمیت تحصیل علم و تربیت در خدمت برادرِ بزرگوارِ خود شاہ غلام قطب الدین، المتخلّص بہ مصیبؔ یافتہ۔ شاعرِ فارسی ست۔ چند کتاب تصنیف نمودہ۔ بندہ با وی دو سہ ملاقات کردہ و کلامش شنیدہ۔ الحق کہ کمیتِ فکرش در عین جولانی و رشتۂ سخنش چوں زلفِ گل رخاں طولانی۔ گاہ گاہ ریختہ ہم می گوید۔ چوں محاورۂ ایں زباں جدا ست، خود از کم مشقیِ خود اظہارِ عجز دارد۔ بسیار منصف مزاج ست۔ الحال مسند نشینِ حضرتِ شاہ خوب اللہ اوست۔ حق تعالیٰ بسیار سلامت دارد۔ از وست :

هو گیا خونِ ناب آنکھوں میں ‏ ‏ تھا جہاں تک کہ آب آنکھوں میں
شبِ فرقت میں تیری اے ظالم ‏ ‏ ہو گیا خواب خواب آنکھوں میں

شاد تھا دل سب طرف سے بر میں جب جانانہ تھا
ہائے کیسی رات تھی جس رات وہ ہم خانہ تھا
ہو گیا تھا کہتے کہتے اِن دنوں میں ہوشیار
پھر جو کل دیکھا میں اجمل کو وہی دیوانہ تھا

(۲۶) امیر : خانِ عالی شان، محمد یار خاں، المتخلّص بہ امیرؔ ولد علی محمد خاں رُہیلہ۔ بسیار خلیق و جوہر شناس۔ طبع موزوں دارد۔ از محمد قائم مشورۂ شعر دارد۔ خدا قائم دارد۔ از وست :

اِس مُنہ سے الٰہ کچھ نہ نکلا ‏ ‏ جز نالہ و آہ کچھ نہ نکلا
دیکھی جو میں سر نوشت اپنی ‏ ‏ جز روزِ سیاہ کچھ نہ نکلا

(۲۷) اسد : میر اسد علی، اسد تخلّص، سیّدِ عالی نسب در کمالِ وجاہت، از شاگردانِ میرزا رفیع سودا۔ اصل از شاہ جہاں آباد ست۔ الحال از سبب پریشانیِ روزگار طرفِ مرشد آباد رفتہ۔ خدا ایش سلامت دارد۔ ہجوِ گنجفہ خوب گفتہ، و بسے دُر ہائے معانی سفتہ۔ طبعِ رسائے دارد۔ از وست :

کس جنگ جو کی صبح کو باتیں نکالیاں ‏ ‏ باہم صبا چمن میں الجھتی ہیں ڈالیاں
جوں توں اسد کو لائے تھے اُس کی گلی سے ہم ‏ ‏ خانہ خراب راہ میں پر پھر مچل گیا

(۲۸) آزاد : میر ظفر علی آزاد تخلّص، دردمند و عاشق مزاج۔ اصل دی شاہ جہاں آباد ست، در مرشد آباد مقیم ست۔ بیشتر فکرِ فارسی می نماید۔ نقل ست کہ یکے از کنیزانِ بینا بیگم، نزاکت نام بر او عاشق شد۔ ہر چند کہ عدمِ ملاقات بود، لیکن نہاں نہاں ازاں شعلۂ آتشِ داغ در دل داشت۔ از اثرِ آہش

طرفِ ثانی را نیز گرمی بہم رسید۔ روزے صاحبۂ او پرسید کہ "چرا چنیں حال داری؟"
آں زن مردانہ گفت "ہر چہ خواہی بکن، بر فلانے عاشقم" صاحبہ در غضب شدہ
بہ زیرِ چوب کشید و قید کرد، میر ندکور ایں خبر شنیدہ بسیار گریست و گفت:

'معشوق ز رسوائیِّ من خانہ نشیں شد — ایں بود سزائے نگہِ بے ادبِ ما'

غرض کہ سخنِ میر خالی از نزاکت نیست۔ سلامت باشد:

پوچھتے کیا ہو کہ بیداد کروں یا نہ کروں — یہ تو فرماؤ کہ فریاد کروں یا نہ کروں
وعدۂ وصل تو کرتے ہو مگر سچ کہیو — دل کو اس وعدے سے میں شاد کروں یا نہ کروں
خانہ اک دم کے لیے سیل پہ مانندِ حباب — متحیّر ہوں کہ بنیاد کروں یا نہ کروں
مرغِ دل تیری جدائی سے پڑا تڑپے ہے — اس کو کیا حکم ہے آزاد کروں یا نہ کروں

(۲۹) **امین**: خواجہ امین الدین، امیں تخلّص، ساکن مرشد آباد است۔ دگر احوالش
معلوم نیست۔ سلامت باشد۔ از وست:

عمر کٹنے کو کٹی پہ کیا ہی خواری میں کٹی — دن کٹا فریاد میں اور رات زاری میں کٹی

(۳۰) **اظہر**: میر غلام علی، اظہر تخلّص، متوطّن شاہ جہاں آباد، از شاگردانِ میر شمس الدین،
فقیر۔ طالب علم در فنِ شاعری مربوط، دیوان فارسی پُر مضامین دارد۔ الحال
مائلِ ریختہ نیز گردیدہ۔ چوں سر رشتۂ سخن معلوم ست، خوب خواہد گفت۔ طبعش
دقّت پسند افتادہ است۔ خدا ایش سلامت دارد۔ از وست:

ساقی بہار آئی میرا ایاغ خالی — انصاف بھی ہے ظالم مت کر دماغ خالی
اب تو ہر اک سے طلب کرنے لگے جا ہ نئی — ہے یہ آئینِ وفا میں تمھیں سے راہ نئی
نہیں یہ مردمکِ چشم ساتھ آنسو کے — نکل کے داغِ جگر جم رہا ہے آنکھوں میں

(۳۱) **آثمی**: آبِ جویبارِ شرافت و سروِ بوستانِ سیادت، گلِ گلزارِ ہاشمی،
میر برہان الدین آثمی، شاعرِ ریختہ گو و مرثیہ گو بود۔ متوطّن شاہ جہاں آباد، در

بہادر بُرّہ استقامت داشت۔ در علمِ تاریخ و شمشیر شناسی و لطیفہ گوئی دستے بہم رسانیدہ بود۔ از چندے بہ رحمتِ الٰہی پیوست۔ خدا ایش بیامرزد:

چمن کے تخت پر جس دن شہِ گل کا تجمّل تھا ق ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی اور شور تھا غل تھا
خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں بتاتا باغباں رو رو یہاں غنچہ یہاں گل تھا
مثالِ آئینہ ہم نے سبھی نقشِ جہاں دیکھا جہاں دیکھا بہر صورت تجھے قالب میں جاں دیکھا
قیامت کی عقوبت ساری ہجرِ یار میں گزری وہاں تھا دیکھنا جو کچھ سو سب ہم نے یہاں دیکھا
نشے نے مے کشوں کے کیا فلک پر سر اُٹھایا ہے کہ بادل بھی سیہ مست ہو چمن پر جھوم آیا ہے
مجھے تھا دھیان زلفوں کا جو وہ خورشید رُو آیا خدا نے غم کی راتوں میں خوشی کا دن دکھایا ہے

(۳۲) **میر امانی**: میر امانی ولد میر آثمی۔ جوانے بود بہ کمالِ خوبیِ طبعِ موزونے داشت۔ با فقیر بسیار آشنا بود۔ بیشتر فکرِ مرثیہ می نمود۔ ازیں جا بہ سبب پریشانی روزگار بہ طرف مرشد آباد رفت۔ نقلِ وفاتِ او عجیب و غریب ست۔ روزے در خانۂ شخصے مجلسِ امام مقرّر بود، میر مذکور بہ عادتِ خود بر منبر رفتہ، مرثیہ برخواند۔ نصفے نہ خواندہ بود کہ بر مردم رقّت رُو داد۔ چناں چہ خود ہم گریست و پشت بر دیوارِ منبر دادہ، مانندِ تصویر ساکت گردید۔ مردم گمان بردند کہ حالا بندِ دیگر خواہد خواند۔ چوں خاموشی بہ طول انجامید، اکثر اشخاص برخاستہ دیدند کہ جاں بہ آفریں سپرد۔ خوشا بہ حالِ کسے کہ در غمِ امام علیہ السّلام جاں بہ حق تسلیم کرد۔ مشقِ شعرش بہ پختگی نہ رسیدہ، از بس کہ مصروفِ مرثیہ بود۔ خدا ایش بیامرزد:

شور بر کوہ و بام کرتا ہے دل بڑی دھوم دھام کرتا ہے
نہ تو سنتا ہے وہ امانی حال نہ تو قصّہ تمام کرتا ہے

(۳۳) **رائے پریم ناتھ**: رائے پریم ناتھ، خلف رائے کشن ناتھ از قوم کھتری ست۔ قائمؔ در تذکرۂ خود نوشتہ کہ ظاہر حالش چوں طبع خویش موزوں و

موزونیِ طبعش از خوبیِ ظاہر افزوں۔ خطاطِ بے نظیر و کماں دار دل پذیر۔ غزل فارسی بسیار بہ خوبی می گوید۔ گاہ گاہے فکرِ ریختہ ہم می کند۔ از وست:

ان بولنا سجن کا میٹھا لگے ہے دل کو خاموشی اُن لبوں کی گپ چپ کی ہے مٹھائی م

(۳۴) **آشنا**: آشنا تخلص شخصے شنیدہ ام۔ بہ فقیر آشنا نیست۔ از کلامش معلوم می شود کہ فی الجملہ آشنائی با سخن دارد۔ معلوم نہ شد کہ کجاست۔ ہر جا کہ باشد سلامت باشد۔ از وست:

م جو کوئی چشمِ تر نہیں رکھتا دردِ دل سے خبر نہیں رکھتا
م کس طرح دل میں جا کروں اُس کے نالہ میرا اثر نہیں رکھتا
م کبھو تو مہرباں ہو ہم پہ اے بت کہ آخر ہم بھی ہیں بندے خدا کے
م آشنا کیا بنے گی آخر کو تجھ سے خانہ خراب کی صورت
آشنا وہ نہ ہوئے گا میرا یاد رکھیو تو عاشقوں کی بات

(۳۵) **خواجہ اکرم**: خواجہ اکرم مردے خوبے بود در شاہ جہاں آباد۔ معلوم نیست کہ الحال کجاست۔ در گفتن تاریخ خیلے مہارت داشت۔ ہر حرفے و سخنے کہ می گفت و اندکے تامل می کرد، تاریخ بر می آمد۔ خدا ایش بیامرزد۔ از وست:

م اک بار مرے دیر میں زاہد اگر آئے میں جانوں جو مسجد کی طرف پھر نظر آئے

(۳۶) **احسن**: میرزا احسن علی، چراغِ بزمِ سخن، مظہرِ اخلاق حسن، میرزا احسن علی، المتخلص بہ احسن۔ اخترِ فکرش در اوج، و خضرِ طبعش پرموج۔ جوانے ست خوش خلق و نیک خو۔ اصل از عرب ست، نشو و نما دریں جا یافتہ از متوسلانِ محمد یونس خاں۔ اوائل استفادہ از میر ضیا حاصل کردہ، الحال شعرِ خود را پیشِ میرزا رفیع می گزراند۔ قصیدہ و غزل خوب می گوید۔ بہ وسیلۂ شاعری در سرکارِ نواب شجاع الدولہ سرفراز ست۔ طالب علم ست، و دو سہ خط ہم خوب می نویسد۔

خدا بہ سلامت دارد - از دست :

خاکِ چمن میں کس کی ملی آرزوے دل — جو غنچہ یاں کھلے ہے تو آتی ہے بوے دل

جو دل اُدھر گیا سو وہ ماٹی میں مل گیا — تیری گلی میں خاک کریں جستجوے دل

ہے مجھ میں رمق دیدہ تجھے تا نگراں ہے — جوں شمع مرا تارِ نگہ رشتۂ جاں ہے

کیوں کر نہ کروں نالہ و فریاد میں احسن — مانندِ جرس دل مرا لب ریزِ فغاں ہے

یارو وہ صنم کیوں کے کرے کام خدا کا — رام اُس کا خدا ہے وہ نہیں رام خدا کا

صبح کا نکلا وہ گھر سے جب نہ آیا شام کو — تنگ پایا جی یہ میں کیا عرصۂ آرام کو

سر اپنے کو جوں لے گئے ہم اُس کے قدم تک — پہنچا دیا ٹھوکر نے وہیں ملکِ عدم تک

لطف سے کیجے اِدھر بھی تو نگاہے گاہے — شاد ہر لحظہ نہیں کرتے تو گاہے گاہے

دل بھرے اپنے کو کس طرح سے کیجے خالی — اُس کی غیرت نے نہ دی رخصتِ آہے گاہے

اب تو غمّازوں نے وہ بات بھی کھو دی یارو — گھیر کر بیٹھتے تھے جو سرِ راہے گاہے

محروم ہم ہوں محرم اسرار ہو کوئی — خلوت میں ہو کوئی پسِ دیوار ہو کوئی

راتوں کو اُس کے کوچے میں جاتا تو ہوں ولے — دھڑکے ہے دل پڑا کہ نہ بیدار ہو کوئی

عشق کی آتش جلے ہے یوں دلِ مایوس میں — جس طرح شعلہ ہو روشن شمع کا فانوس میں

سجدہ گہ ہے خاکِ احسن اب تو ساری خلق کی — جان دی تھی اُس نے کس کی حسرتِ پابوس میں

پہنچی جس وقت مجھے اُس کے خبر آنے کی — سُدھ رہی مجھ کو نہ اپنے کی نہ بیگانے کی

تم تو دل مانگو ہو یاں جان تلک حاضر ہے — بات ہے یہ بھی کوئی آپ کے فرمانے کی

دل کو نہ رکھوں سینے میں تو کیا کروں احسن — جس جنس کا خواہاں نہ ہو ناچار بغل میں

خواب میں جوں روح تن سے غم سے یوں میں خستہ ہوں — گو دل وارستہ ہوں پر جا بجا میں بستہ ہوں

دل ہو دیدار سے مایوس تو مسرور نہ ہو — چشم میں روشنیِ طور سے بھی نور نہ ہو

کس طرح سے ملے آپس میں لبِ زخمِ جگر — یہ تو وہ در ہے کہ تجھ بن کبھی معمور نہ ہو

بزم میں اُس کی جو ہوتی ہی کبھی سرگوشی
دل دھڑکتا ہی کہ میرا کہیں مذکور نہ ہو

ہجر میں کیوں کر نہ ہوئے آہ و زاری بیشتر
ہی قرار اس دل میں کم اور بے قراری بیشتر

روزِ ہجراں ہی میں تنہا کچھ نہیں روتے ہیں ہم
وصل کی راتیں کٹیں یوں ہیں ہماری بیشتر

نہ رویا مرتے مرتے تک بھی تیرے خوف سے احسن
گئی سب خاک میں افسوس اُس کی حسرتِ گریہ

کل طلب میں مے کی یوں ہم یار مُنہ کھولے رہے
نزع میں پانی کو جوں بیمار مُنہ کھولے رہے

دل کو خواہش ہی یہ کس کے تیر کی یارب کہ اب
شکلِ پیکاں ہوکے جوں سوفار مُنہ کھولے رہے

سخت مشکل ہی دو خوگر مُنہ پہ رکھنے سے نقاب
اور چاہیں چشم یہ دل دار مُنہ کھولے رہے

ق
جامِ مے ساقی کے آگے لائے جوں مجلس کے بیچ
غیروں کو بہم دیے اور یار مُنہ کھولے رہے

اکثروں نے پی اور اکثر قطرے کو ترسا کیے
لڑھ گئے دو چار اور دو چار مُنہ کھولے رہے

خونِ احسن کا نہ چاٹے جب تلک کب ہو نیام
اژدہے کی طرح وہ تلوار مُنہ کھولے رہے

ہاتھ سے تیرے اے فلک جان و جگر کباب ہی
عیش جو کل نصیب تھا آج خیال و خواب ہی

چہرے سے اُس کے منفعل روے زمیں پہ ماہ رو
جلوے کو اُس کے دیکھ کر چرخ میں آفتاب ہی

زخم لگائے سیکڑوں کرنے لگا شمار وہ
جو ہوئی سو ہوئی دلا اب تو سرِ حساب ہی

بل بے ترا جگر دلا ہوئے ہی سنمکھ اُس کے تو
تیغِ نگہ سے جس کی اب زہرۂ برق آب ہی

کیجیے ٹک یہ چشمِ خود سیرِ دلِ پُر آبلہ
یار اِس ایک شیشے میں سیکڑوں ہی حباب ہی

ق
خونِ جگر سے روز و شب کیجیے رقم کہاں تلک
نامۂ شوق کی مرے شرح تو اک کتاب ہی

اس لیے کرکے مختصر تھوڑا سا کچھ لکھا تھا میں
ہی یہ لکھا نصیب کا اِس پہ بھی یہ عتاب ہی

نامہ پٹاک کے ہاتھ سے آئینہ دیکھنے لگا
اِس سے یہ ہم پہ کھل گیا صاف نہیں جواب ہی

یاد سے احسن اِن دنوں کن نے ہمیں بھلا دیا
سینے میں دل کو اپنے کچھ خود بہ خود اضطراب ہی

دھمکائیے جا اُن کو جو مرگ سے ڈرتے ہیں
ہم ہیں ترے پروانے جی دینے پہ مرتے ہیں

تم غیر کے ہاتھوں سے واں جام چڑھاتے ہو
یاں حلق میں لوہو کے سو گھونٹ اُترتے ہیں

ہو دست بہ سر ظالم کب لیں ہیں مرا مجرا — سو ناز سے ہاتھ اپنا ٹک سینے پہ دھرتے ہیں
چھٹتا ہی کوئی نالہ ہم سے دمِ آخر تک — دم جب تئیں ہی دم ہیں دم آپ کا بھرتے ہیں
کھلتے ہیں اسیروں کے صد عقدۂ غم دل سے — تجھ مکھڑے پہ زلفوں کے جب بال بکھرتے ہیں
پھر فصلِ بہار آئی جو ہوئے سو ہو احسن — مُغ پاس گِرو ہم بھی دستار کو دھرتے ہیں
کہا جو میں نے کہ رُخ کو ترے قمر نہ لگا — بگڑ کے بولا کہ چل بے اِدھر نظر نہ لگا
رہی جو تن میں مرے جان اک رمق باقی — لگا کے زخم کہا حیف کارگر نہ لگا
جب اُس کے آگے تھک جاتا ہوں میں احوال کہہ کہہ کے — تو کہتا ہی نہیں سمجھا میں پھر کہیو زرارہ کے
اسی مُنہ سے تمہیں دعوائے مے خواری ہی ای حسن — ہوا ظرف آپ کا معلوم دو ہی جام میں بہکے
ہوس لے آئی تھی اُس جنگ جو کے پاس مجھے — نگہ لڑی تو رہے پھر نہ کچھ حواس مجھے

(۳۷) انشا : میر انشاء اللہ از خوبانِ جہاں و خوش فکرانِ زماں، سخن آگاہ، میر انشاء اللہ، طبع تازہ و ذوق بے اندازہ، شرابِ معانی و ذوقِ جوانی فرح بخش و مسرت افزاست۔ خلفِ حکیم الحکما، میر ماشاء اللہ دام افضالہ۔ انشا تخلص می نماید۔ جوانےست خوش ظاہر و خوش طبع۔ با قبلہ گاہی دوستِ دلی ست۔ نو مشق ست، اکثر طرزِ او بہ طرزِ میر سوز می ماند۔ اصلِ وی از نجف ست و مولدِ او بہ طرفِ بنگالہ۔ خدایش سلامت دارد۔ از دست :

گالی سہی جفا سہی چینِ جبیں سہی — یہ سب سہی پہ ایک نہیں کی نہیں سہی
منظور ہم کو دل کا لگانا ہی جب ہوا — کیا آپ کا اجارہ ہی اِس میں کہیں سہی
گر نازنیں کہے کہنے سے مانو ہو کچھ بُرا — میری طرف تو دیکھو میں ہی نازنیں سہی

بندہ اُسے جب نظر پڑا ہی — بولا ہی چل اُٹھ کدھر پڑا ہی
نالہ ہی تجھے تو کھینچ لایا — رونے کا ابھی اثر پڑا ہی
یوں سب سے نہ مل کہا تو بولا — تیرا ہی تو مجھ کو ڈر پڑا ہی

جی سے میں اپنی جان کے صدقے — یعنی اُس نوجوان کے صدقے
کھا قسم جھوٹ بولے ہی کتنا — چُپ ہو، چُپ بس قرآن کے صدقے
ہوئے ہیں خاکِ سرِ راہ اُس کی ہم انشا — بڑا غضب ہی جو یہ بھی فلک نہ دیکھ سکے

(۳۸) **آگاہ** : نور خاں، جوانے ست از شاگردانِ شاہ واقف، آگاہ تخلّص می کند۔ چندے از میر ضیا نیز اصلاح گرفتہ است، بہ وسیلۂ قصّہ خوانی بہ سر می برد۔ دریں فن شاگردِ میر احمد مرحوم ست کہ بہ قصّہ خوانی مشہور بود۔ غرض جوانِ خوش ظاہر ست۔ خدایش سلامت دارد۔ از وست :

مُنہ دیکھو اپنا۔ سیکھو ابھی رسم چاہ کی — باتیں بنا بنا کے نہ کیجے تباہ کی
بے اختیار سیکڑوں دستار گر پڑیں — جب میرے کج کلاہ نے ٹک کج کلاہ کی
عبادت گاہ ہی محرابِ کعبہ ہر مسلماں کی — ہماری سجدہ گہ محراب ہی اپنے گریباں کی

بر غزل میاں حسرت بہ مشورۂ شاہ واقف گفتہ :

جان پائیں جو تجھے ایک نظر دیکھیں تو — تو بھی پردے سے نکل نورِ بصر دیکھیں تو

'دیکھیں'، در مصرعِ ثانی بعضے می گویند کہ چست نیست۔ البتّہ جائے تامّل ست۔

حلقۂ چشم میں کیوں آج ہی دم پا بہ رکاب — ہی کہاں کا ہمیں درپیش سفر دیکھیں تو
نہیں ممکن کہ ملیں مفت یہ بُت عاشق سے — ق — اپنے کوچے میں بھی گر خاک بہ سر دیکھیں تو
دزر اگر بر سرِ فولاد نہی نرم شود، — آپ سے آتے ہیں گر ہاتھ میں زر دیکھیں تو

(۳۹) **اعلیٰ علی** : آشنائے خفی و جلی، میر اعلیٰ علی از ساداتِ عالی شان، سپہر مکاں، ابنِ میر ولایت اللہ خاں نوّر اللہ مرقدہٗ۔ مردے ست خلیق و متواضع۔ در مخمّس نمودنِ غزل دستے بہم رسانیدہ است۔ تضمینِ خوب دارد۔ منقبت و مرثیہ نیز می گوید و معجزات ہم از فکرِ او در منقبت مشہور ست۔ چناں چہ اکثر گدایانِ نقشبنداں می خوانند۔ مولدِ او در شاہ جہاں آباد ست۔ وطنِ آباد و اجداد

بہ طرفِ توراں زمین ست۔ حق تعالیٰ سلامت دارد۔ ایں چند بیت ازاں بزرگوار ست:

کیا ہی تیری آنکھوں نے نہ کچھ مجھ پہ ستم خالی
ہوئے ہیں جان سے نرگس کے قالب یک قلم خالی

چمکنا برق کا مینہ کا برسنا کیا کرے دیکھیں
نہ ہنسنے سے وہ چپ رہتا ہی رونے سے نہ ہم خالی

بتو! اللہ کی سوں دل مرا جب تک نہ حاضر ہو
نظر آتا ہی آنکھوں میں مری دیر و حرم خالی

لگائیں منہ نہ ہرگز دیکھکر بے کیفیت اس کو
فلک گردوں رہیں اپنے ہمیں دے جامِ جم خالی

کوئی مانی کے صدقے ہو کوئی بہزاد کے صدقے
تری صورت لکھی جس نے ہم اُس اُستاد کے صدقے

توڑ بت زاہد نے کیوں مسجد یہ بت خانہ کیا
تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

نہ چھوڑا میں جھنجھلا کے تارِ گریباں
رہے تا نہ گردن میں بارِ گریباں

جو ہاتھ اُس کے بندِ قبا کھولتے تھے
سو مشغول ہیں اب بہ کارِ گریباں

ہر فعل میں ہم چست کہ چالاک ہوئے
یاد خترِ رز کے ساتھ بے باک ہوئے

موقوف ہی زیست تک یہ سب کچھ زاہد
جب خاک ہوئے تو سب طرح پاک ہوئے

(۴۰) **افسوس**: میر شیر علی، المتخلّص بہ افسوس، ابنِ میر علی مظفر خاں، داروغۂ توپ خانۂ عالی جاہ، از شاگردانِ میر حیدر علی، حیراں۔ در بنگالہ بسیار ثروت داشت، الحال در سرکارِ نواب سالار جنگ بہادر سرفراز ست۔ جوانے ست ظاہر و باطن آراستہ، بہ حلم و حیا پیراستہ۔ ذہنِ سلیم و طبعِ فہیم دارد۔ چندے از میر سوز نیز فائدہ برداشت۔ با فقیر از سببِ ہم نشینی صحبتِ شعرا اکثر ملاقات می شود۔ ہر سخنے کہ می گویم از راہِ منصفی درست می داند۔ فکرِ اوائل را تمام شستہ، الحال شستہ و رُفتہ می گوید۔ وطنِ بزرگانش نارنول ست۔ جوانِ رنگین ست۔ سلامت باشد۔ از وست:

جب تلک نہ عشق یارو نہ دلِ ناکام تھا
اپنے تئیں کیا چین تھا اور دل کو کیا آرام تھا

بخشیو مجھ کو تجھے ٹوکا ہی میں نے بھول کر
دزدِ دل تیری بلا سے وہ ترا ہم نام تھا

وہ بے وفا تو مجھ سے ٹک ایک آج مل گیا | پر اپنے اختیار سے افسوس دل گیا
اُس قصّے کو تو ہم دم کاہے کو سُناتا ہے | وہ بھولی ہوئی باتیں کیوں یاد دلاتا ہے
کوئی دل سے مرے پوچھے جیسا ہے وہ ای ناصح | گو تجھ کو نہ خوش آیا پر مجھ کو تو بھاتا ہے
کہا میرا مطلق نہیں مانتا ہے | تو جیسا ستاتا ہے جی جانتا ہے
جس کو تیر نگہ لگا ہوگا | ایک دم میں وہ مر گیا ہوگا
اُس کے اُٹھتے ہی جی پہ آن بنی | دیکھیے آگے آگے کیا ہوگا
ایک میں ہی نہیں اُس کوچے میں جو جاتے ہیں | واں کے ہو رہتے ہیں گھر اپنے سے وہ جاتے ہیں
کوچۂ یار میں رہتے تو نہیں اب لیکن | بھولے بھٹکے کبھی اُس راہ سے ہو جاتے ہیں
بزم میں اُس کے نہ ہنستے ہیں نہ رو سکتے ہیں | چُپکے بیٹھے ہوئے ایک ایک کا منہ تکتے ہیں
اُس شعلہ وش کو دیکھ کے بے تاب ہو گیا | یارو یہ تھا تو دل ہی پہ سیماب ہو گیا
پھر ہجر ہے وہی، وہی دن ہے پہاڑ سا | وصلِ صنم تو رات کو اک خواب ہو گیا
صبح نت کرتا ہے یہ دل اشک باری بیشتر | ہو سحر کو خانۂ ماتم میں زاری بیشتر
دل تری بھی آشنائی کا نہیں کچھ اعتبار | بے وفاؤں سے رہی ہے تجھ کو یاری بیشتر

(۱۴۱) **میر ابوالحسن**: میر ابوالحسن، ولد میر عبداللہ، از اولادِ بندہ نواز گیسو دراز چوں قبلہ گاہِ ایں فقیر از نبیسہ ہاے بندہ نواز اند، بنا بریں یک رشتہ داری ماہم باوی ست۔ مولدش شہرِ کہنہ کہ در شاہ جہاں آباد مشہور ست در محلّہ لال پلنگ۔ از فیضِ صحبت خانِ عالی شان، جان عالم خاں صاحب گاہ گاہے شعرے و بیتے موزوں می نماید۔ حق تعالیٰ سلامت دارد۔ ایں قطعہ کہ بہ نگارش می آید الحق کہ مضمونِ تازہ یافتہ است۔ از وست:

ساکنانِ فلک نے کچھ تنہا | ق | شہرت اُس حسن کی نہیں ڈالی
مہ نہ بوجھو ہجومِ انجم سے | | پھرتی ہے آسمان پر تھالی

(۴۲) **انتظار** : علی نقی خاں المتخلّص بہ انتظار، بہ طرف عظیم آباد استقامت دارد۔ از احوالش معلوم نیست۔ سلمہ اللہ تعالیٰ :

صدف مشتاق ہیں دریا میں ای نیسان گوہر کے
یہ میرے چشم تر پھینکیں ہیں بھربھر خوان گوہر کے

(۴۳) **اٹکّریس** : شخصے بود در وقتِ فردوس آرام گاہ عجیب و غریب، ہر کس کہ پیشِ او شعر می خواند خواہ بیت خواہ رباعی، دہرہ ہندی، فارسی و عربی موافق الفاظ ہاے او فی البدیہ بے معنی موزوں می کرد۔ ہیچ فکر و تامّل نمی کرد۔ چوں می گفتند کہ باز بخواں، نمی توانست خواند مگر بہ طور دیگر۔ نقل ست روزے یک جاے صحبتِ رقص، زنے رقص می کرد۔ شخصے گفت زود بریں زن چیزے بگو، در جلدی گفت :

کود رے کود اگر چھل کو بجھانا ہی تجھے
پہ چّی ہو بیٹھ ......

(۴۴) **آشوب** : آشوب تخلّص۔ شخصے ست چیچک رو دراز قد، قدم در مسخرگی گزاشتہ است۔ پوچ و بے معنی و ناموزوں می گوید۔ مردماں خندہ می کنند بلکہ چیز ہاے چندی می گویند، چوں گوشش کرست، خود ہم می خندد و مردم را بہ خندہ می آرد۔ از وست :

در عشق ترے چیوڑے یہ ست مچا مچ
یہ پھر کی وو دنّا یہ غنچ و غنچا غنچ

(۴۵) **اولی** : میر اولاد علی، اولیٰ تخلّص، جوانے ست ہندوستان زا۔ بزرگانش از سادات بارہا اند۔ طبع موزوں دارد۔ سلامت باشد۔ از وست :

بتاں ہر چند بہلاتے ہیں میرے دل کو پر اولیٰ
ادا کس طرح مجھ کو اُس پری رخسار کی بھولے

(۴۶) **محمّد اشرف** : محمّد اشرف شخصے ست از مردم مرشد آباد، بہ داروغگیِ اخبار ز فرنگی جان برشٹو صاحب سرفراز ست، طبعِ موزونے دارد، یک بٹیر نامہ گفتہ است۔ کمتر ہندی و بیشتر فارسی می گوید، خدا ایش سلامت دارد :

آ بیٹھو تو دو باتیں کریں تم سے میاں ہم — پھر دیکھیے اک دم میں کہاں تم ہو کہاں ہم

(۷۴) **اعظم** : محمد اعظم، اعظم تخلص عطار پسرے بود۔ در دوازدہ سالگی شعر می گفت، و مشق سخن از بندہ مولف کتاب می کرد۔ چوں بہ قضائے الٰہی پدرش وفات یافت، غیر یتیمی مونس و ہمدمش نہ ماند، فقیر از راہِ دل سوزی چند سخن نصیحتانہ گفت، بارے از گفتنِ بندہ بر دکانِ پدرِ خود کہ فکرِ معاش اولیٰ ست، مشتغل گردید۔ ازاں جا کہ عمرش قریب دوازدہ سال بود بعضے ناہموارں اورا در زنکہ بازی انداختہ، در اندک مدت قرض دار و پریشاں ساختند۔ بے چارہ مال و اموال ہمہ بر باد دادہ از ترسِ قرض داراں شہر بہ شہر پریشان می گشت۔ دریں صورت مشقِ سخن صورت نہ بست، والا طبعش موزونیتِ تمام داشت، خوب می گفت، لیکن مقدور چنیں نہ بود، چوں بعد مدتے نوکری در سرکارِ نواب آصف الدولہ بہادر در ذیل ترک سواراں بہم رسانیدہ، بہ یک ناگاہ از عارضۂ ہیضہ شروعِ روزگار از جہانِ ناپایدار عنانِ مرکب بے اختیار بہ سمتِ عدم انداخت۔ خدایش بیامرزد، ایں دو سہ شعر جستہ جستہ از وست :

بجلی کی سمجھیو نہ یہ شمشیر فلک پر — ہی شعلۂ دل کی مرے تحریر فلک پر
ہی قد کے سبب عالمِ بالا پہ تری زلف — رکھتی ہی دماغ اپنا یہ زنجیر فلک پر

دل کے لیے جی اداس کیجیے — یا یار کے غم کا پاس کیجیے
ہی ایک دل اور ہزار سودا — کس کس کی طرف قیاس کیجیے

پیدا ہوئے جب سے آہ و زاری میں رہے — بجلی کی مثال بے قراری میں رہے
ہو خانہ خراب ایسے کافر دل کا — ہم جس کے سبب ہمیشہ خواری میں رہے

رکھتے نہیں دل میں جو بتاں چاہ کسی کی — لو تم سے لگائے نہ اب اللہ کسی کی

حرف (ب)

متقدّمین

(۴۸) **بے چارہ**: بے چارہ تخلص شخصے بود از مردم دکن پیش از عالم گیر۔ خدا ایشش بیامرزد۔ از وست:

ن پی سے جدا ہونا نہ تھا چاہا خدا کا یوں ہُوا — جز صبر کچھ چارہ نہیں بے چارہ ہو رہنا پڑا

(۴۹) **بیدل**: میرزا عبدالقادر بیدلؔ شاعرِ زبردست و صاحب طرزِ فارسی۔ تعریف او در تذکرہائے فارسی مسطور ست۔ بندہ را چہ یارا کہ شمّہ از احوالِ آں عارف باللہ رقم نماید۔ دو شعرِ ہندی ازاں بزرگوار شنیدہ شد، تیمّناً نوشتہ می شود۔ نوّر اللہ مرقدہٗ:

نم مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم ہیں — اس تخمِ بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں

ہم جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا — پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

(۵۰) **بسمل**: بسمل تخلص شخصے بود۔ احوالش خوب معلوم نیست لیکن ایں قدر می دانم کہ از متقدّمین ست۔ از وست:

نم لہو پی رہ گیا بسمل وگرنہ — مِلاتا اپنے تئیں وہ خاک و خوں میں

متوسّطین

(۵۱) **بے رنگ**: دلاور خاں شخصے بود از شاگردانِ میاں یک رنگؔ، در عہد محمّد شاہ غفر اللہ لہٗ۔ اوّل ہم رنگ تخلّص داشت بعد ازاں بے رنگ نمود۔ خدا ایشش بیامرزد۔ از وست:

نم خط مرا اُس نگار نے نہ پڑھا کیا لکھا تھا کہ یار نے نہ پڑھا

(۵۲) **بے تاب** : محمّد اسمٰعیل بے تاب تخلّص درویش دردمندے بود شاگردِ میاں یک رنگ۔ از پشتِ اسپ افتاد، بیماری دست داد، آخر جاں بہ حق تسلیم شد۔ خدایش بیامرزد:

نم نہ ہوتا اگر کسی کے آشنا دل تو کیا آرام سے رہتا مرا دل
نہ جانوں کس پری رو کی نظر ہوئی ابھی تو تھا بھلا چنگا مرا دل

(۵۳) **بے نوا** : بے نوا تخلّص در اوائلِ سلطنتِ محمّد شاہ در شاہ جہاں آباد آمد ظریف الطبع بود۔ ساکنِ قصبۂ سنام۔ روزے در یک جاے با میاں آبرو ملاقات کردہ۔ اوشاں کم التفات کردند۔ گفت کہ "ای میاں آبرو، مگر شما تین چشم شدن نہ می دانید" چوں اوشاں یک چشم نہ داشتند، ایں لطیفہ بسیار مناسب افتاد۔ مردماں بہ خندہ آمدند۔ غرض عجب ظریفے بود۔ خدایش بیامرزد۔ از وست:

تم ہو بوس و کنار کی صورت ہم ہیں امّیدوار کی صورت
م بے نوا ہوں زکوٰۃ حسن کی دے او میاں مال دار کی صورت

(۵۴) **بہار** : از مستعدّانِ روزگار بود، لالا ٹیک چند، المتخلّص بہ بہار شاعرِ فارسی بود۔ از اصطلاحاتِ فارسی بسیار خبر داشت۔ از یارانِ سراج الدّین علی خاں صاحب بود۔ تصانیف بسیارے داشت۔ ایں چند بیت از وست:

نم وہی اک ریسماں ہے جس کو ہم تم تار کہتے ہیں کہیں تسبیح کا رشتہ، کہیں زنّار کہتے ہیں
ن سبھی کرتے ہیں دعویٰ خون کا قسمت ہے دیکھیں تو صفِ محشر میں ہوگا کس کے دامن ہاتھ قاتل کا
نم نہیں معلوم کیا حکمت ہے شیخ اس آفرینش پر ہمیں ایسا خراباتی کیا تجھ کو منا جاتی
ن محبّت کی قلمرو میں جو جائے گا تو دیکھے گا کوئی آرے تلے چیرا کسی کو کوہ پر پٹکا

(۵۵) **بیاں** : میاں بیاں، شاعرِ عذب البیاں از خوش گویانِ زماں، خواجہ

احسن اللہ، المتخلص بہ بیاں از تلامذۂ میرزا مظہر جانِ جاناں - مولدش شاہجہان آباد - الحال معلوم نیست کہ کجاست - چرخ نامہ ازو مشہور است - بسیار خوب گفتہ - رباعیات دل پذیر دارد - کلامش چوں تبسمِ گل رخاں نمکیں و بیانش چوں قندِ دل بران شیریں - بندہ از فکرِ او بسیار محظوظ است - ہر جا کہ باشد سلامت باشد - ازوست:

م وہ بھی کیا دن تھے کہ ہم آغوش ہم سے یار تھا — در کے باہر مدعی جوں صورتِ دیوار تھا
اس تجاہل پر پڑا میں پچھتا ہوں گور میں — ق وہ کہ جس کی چشم کا میں عمر بھر بیمار تھا
دیکھ کر تابوت کو تیمارداروں سے مرے — پوچھنے لاگا کہ اس مُردے کو کیا آزار تھا

عالم کو تاج و گوہر و تخت و لوا دیا — بتلا تو ای فلک کہ مجھے تو نے کیا دیا
نہ دیں سے اطلاع نہ دنیا کی کچھ خبر — اس عشق نے غرض ہمیں سب کچھ بھلا دیا
ایسے ہی میرے بخت جو ماتے تھے نیند کے — خوابِ عدم سے کاہے کو مجھ کو جگا دیا

کس قدر تجھ سے دل خفا ہوگا — کہ ترا شکوہ سر کیا ہوگا
جنگ پر جس کی لوگ لڑتے ہیں — صلح میں اُس کی کیا مزہ ہوگا

کوئی کسی کا بیاں آشنا نہیں دیکھا — سوائے اِس کے اِن آنکھوں نے کیا نہیں دیکھا
م یہ لوگ منع جو کرتے ہیں عشق سے مجھ کو — اِنھوں نے یار کو دیکھا ہی یا نہیں دیکھا

سیرت کے ہم غلام ہیں صورت ہوئی تو کیا — سرخ و سفید ماٹی کی مورت ہوئی تو کیا

رو کر اُسے میں کہا مرتا ہی یہ بیمار آج — مسکرا کر وہ لگا کہنے کہ اِس کا کیا علاج

مری بساط تمہارے آگے یار ہی موجود — دلِ شکستہ و جانِ نزار ہی موجود
ہمارا ضعفِ بصارت ہی مانعِ دیدار — وگرنہ سامنے آنکھوں کے یار ہی موجود
اِدھر تو دیکھوں ہوں منہ اپنا اُدھر رخِ یار — بیاں یہ طرفہ خزان و بہار ہی موجود

اک بار فوج غم کی پڑی مجھ پہ ٹوٹ کر — لے گئی قرار و صبر و دل و ہوش لوٹ کر
لیتا اگر ہی دل کو تو لے بھی اِسے کہیں — سینے میں اب تلک تو رکھا مار کوٹ کر

کر آپ کو اس قدر فراموش — ہو یاد سے پاؤ سر فراموش
گو سب نے مجھے بھُلا دیا ہے — پر تو، تو نہ کر مجھے فراموش
کیا ایسے سے دردِ دل کو کہیے — ادھر تو سُنا اُدھر فراموش
جہاں رؤوں تمنّا میں تری ای شمع رو پیارے — اُگیں اُس گل زمیں میں حشر تک جوں لالہ انگارے
قمارِ عشق کی بازی بھی کچھ دنیا سے باہر ہے — اُسے کہتے ہیں جیتا جو کوئی یاں نقدِ دل ہارے
آنسوؤں تک پوچھنے کی غیر کے تدبیر ہے — مجھ سے اتنا بھی نہیں کہتا کہ کیوں دل گیر ہے
چرخ کی برہم زنی سے یہ تعجّب ہے بیاں — لیلی و مجنوں کی یک جا اب تلک تصویر ہے
شبِ فراق کی دہشت سے جان جاتی ہے — یہی ہے صبح سے دھڑکا کہ رات آتی ہے
کیا ہے عجز نے میرے اُسے بیاں مغرور — مری وفا اُسے جور و جفا سکھاتی ہے
میں سچ کہوں تری کافرادا نے مارا ہے — دگرنہ وضع تری یا کِس کو بھاتی ہے
جا کہیے کوئے یار میں کوئی — مر گیا انتظار میں کوئی
وہ بھی کیا رات تھی کہ سوتا تھا — سر رکھے اس کنار میں کوئی
م جادو تھی کہ سحر تھی بلا تھی — ظالم یہ تری نگاہ کیا تھی
م کیدھر ہے کہاں ہے خوش دلی تو — ہم سے بھی کبھی تو آشنا تھی
م مارا ہے بیاں کو جس نے ای شوخ — کیا جانیے کون سی ادا تھی
رسوا ابھی سے کرتی ہے ای چشمِ تر مجھے — آنا ہے اُس کی بزم میں بارِ دگر مجھے
آیا ہوں اُس گلی میں ابھی دم نہیں لیا — پھر لے چلا ہے یہ دلِ وحشی اُدھر مجھے
کنجِ قفس سوا مری قسمت میں جا نہ تھی — تو کیوں دیے فلک نے بیاں بال و پر مجھے
تھا حکمِ شرعِ عشق کہ ہرگز نہ رو بیاں — ق — گو ضبطِ گریہ سے نہ ترے جی کو کل پڑے
بھر عمر ہم نے ضبط کیا لیک وقتِ نزع — بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل پڑے
مت آئیو ای وعدہ فراموش تو اب بھی — جس طرح کٹا روز گزر جائے گی شب بھی

آخر تو شکایت سے مجھے منع کرے ہی
سی دیکھیو ٹک ہاتھ سے اپنے مرے لب بھی

اب ہجر میں کہتا ہی کہ تھا وصل میں آرام
نالاں ہی بیاں میں نے تو دیکھا تجھے جب بھی

جھگڑتے تجھ سے تو پیارے حجاب آتا ہی
وگرنہ بات کا تیری جواب آتا ہی

پیو شراب جوانو کہ موسم گل ہی
ہمیں بھی یاد وہ عہدِ شباب آتا ہی

تیغ چڑھ اُس کی سان پر آئی
دیکھیں کس کس کی جان پر آئی

کیجیے عرض حال کو کچھ ہو
نہیں رہتی زبان پر آئی

غیر کے آگے دل کی بات بیاں
آہ میری زبان پر آئی

اپنے دل سے بھی عداوت ہو گئی ہی اب مجھے
دشمنِ جانی ہی میرا جو کوئی چاہے تجھے

اُس سرو قد کا مجھ سا خریدار کون ہی؟
آزادگی کا اپنی گرفتار کون ہی؟

جاتا ہی یار کچھ تو بیاں منہ سے بول نے
ای بے نصیب مانعِ گفتار کون ہی؟

م ہو تو بھی چرخ اُس ستم ایجاد کی طرف
کافی ہی پاس اس دلِ ناشاد کی طرف

جانے دے مجھ کو ای ہوسِ سیرِ گلستاں
اب اِس چمن سے اپنے غم آباد کی طرف

ہوئے گا ذوقِ حسرتِ دیدار میں خلل
شیریں گزر نہ کیجیو فرہاد کی طرف

تمنا بادشاہی کی کسی سفلے کو ہوئے گی
مرے دل میں خدائی کا بھی خطرہ ہو تو کافر ہوں

یارو تمھاری دوستی سے یہ بعید ہی
میں یار سے بعید ہوں کیسی یہ عید ہی

کوئی جز قیس دوانا نہ ہوا لیلیٰ کا
میں ترے عہد میں دیکھوں ہوں جدھر مجنوں ہی

عالم میں گو کہ عشق نے رسوا کیا مجھے
لیکن تجھے تو شہرۂ آفاق کر دیا

م جس وقت کہ بیدار وہ ہوتا ہئیگا
ر عالم کی غضب سے جان کھوتا ہئیگا

م غنچوں سے صبا کہیو کہ آہستہ کھلیں
زانو پہ مرے وہ شوخ سوتا ہئیگا

اب تم سے کہوں جو کچھ ہی دل میں میرے
ر سب تم سے کہوں جو کچھ ہی دل میں میرے

پہلے کہہ لو کہ میں نہ مانوں گا برا
تب تم سے کہوں جو کچھ ہی دل میں میرے

مت کہیو بیاں جام اجل پیتا ہی
یا اُس کے لیے کوئی کفن سیتا ہی

یارو مرے حال کو جو پوچھے وہ شوخ
اتنا کہیو کہ اب تلک جیتا ہی

کیا زلف میں اُس شوخ کی ہی دبکی صبح
یا شام سے ہوتی ہی کسی شب کی صبح

ٹک زلف کو میں ہاتھ لگایا کہ ادھر
ہم سایہ پکارا کہ ہوئی کب کی صبح

سو طرح سے یہ عشق لبھاتا ہی مجھے
ہر چیز میں آ جلوہ دکھاتا ہی مجھے

کس ماہ کا یہ عکس پڑا ہی یارب
ہر چاہ میں یوسف نظر آتا ہی مجھے

دنیا سے بیاں چلا ہوں روتے روتے
گزری سب عمر اپنی روتے روتے

ظلمات میں تھا آبِ بقا پر افسوس
روشن یہ ہوا صبح کے ہوتے ہوتے

کہتا ہوں جناب حق میں ڈرتے ڈرتے
مدّت گزری دعا ہی کرتے کرتے

ہی اُس کو یہ قدرت کہ بیاں سا محروم
منہ یار کا دیکھ لیوے مرتے مرتے

(۵۶) **بے تاب**: سنتو کھ رائے المتخلّص بہ بے تاب۔ از تذکرۂ قائم معلوم شد کہ کم دماغ و خلوت دوست بود۔ معلوم نیست کہ الحال کجاست۔ دراں زماں زورِ طبعش روز بہ روز مانندِ ہلال در ترقّی بود، و ربطِ کلام را خوب می فہمید۔ خدا ایش زندہ دارد۔ از وست:

نہ رہے باغِ جہاں میں کبھی آرام سے ہم
پھنس گئے قیدِ قفس میں جو چھُٹے دام سے ہم

اپنے مذہب میں ہی اک شرط طریقِ اخلاص
کچھ غرض کفر سے رکھتے ہیں نہ اسلام سے ہم

محبّت کی بھی کچھ ہوتی ہیں کیا ای ہم نشیں راہیں
کہ خوباں یوں ہیں کھو دیں ہم اُن کو اس طرح چاہیں

اِدھر نالہ کیا اودھر وہ مضطر ہو چلا آیا
عجب دن تھے وہ جب روزوں میں رکھتی تھیں اثر آہیں

سبزے پہ اُس کے خط کے نہ مارا گیا میں ایک
اِس گُل زمیں میں کھیت ہزاروں جواں رہے

جی میں ہی اُس کی بات میں اب پھر نہ بولیے
لیکن کسی طرح جو یہ کافر زباں رہے

محبّت اب تلک رکھتی ہی یہ تاثیر مجنوں کی
کہ بن لیلیٰ کہیں کھنچتی نہیں تصویر مجنوں کی

ہیں کیا خلل نہ اٹھائے فلک کے کینے سے — کسی کو کام نہ ڈالے خدا کمینے سے
تو اپنا دل سا مرا دل نہ سمجھیو بے رحم — کہ سنگِ سخت کو کیا نسبت آبگینے سے
م عشق میں گاہے وصل گہ تشویش ہی — نت نیا یاں ماجرا درپیش ہی
م خدا کسی کو گرفتار زلف کا نہ کرے — نصیب میں کسی کافر کے یہ بلا نہ کرے
م یاں آکے ہم اپنے مدعا کو بھولے — ہل مل غیروں سے آشنا کو بھولے
م دنیا کی تلاش میں گنوائی سب عمر — اِس مس کی طلب میں کیمیا کو بھولے

(۵۷) **بیدار** : میاں محمد علی المتخلص بہ بیدار، جوانِ محمد شاہی ست، از شاگردان مرتضیٰ قلی بیگ کہ شاعرِ فارسی گو بود، و فراق تخلص می نمود۔ قریب چہار دہ سال شدہ باشد کہ فقیر او را در لباس درویشی در شاہجہاں آباد دیدہ بود۔ طبع در و مند داشت۔ باریک و منحنی، بہ زیورِ حلم و حیا آراستہ۔ معلوم نیست کہ الحال کجاست۔ از وست:

نم صفا الماس و گوہر سے فزوں ہی تیرے دنداں کو — کیا تجھ لب نے ہم رنگِ خجالت لعل و مرجاں کو
دیکھ تجھ کاکلِ مشکیں کی ادائیں شانہ — دونوں ہاتھوں سیتی لیتا ہی بلائیں شانہ
چھوڑ کر کوے بتاں جاتا تو ہی کعبے کو — جلد پھر یو تجھے بیدار خدا کو سونپا

متاخرین

(۵۸) **بے تاب** : فاضل باکمال و عالم بے مثال، فضیلت مآب، شاہ علیم اللہ اللہ آبادی، المتخلص بہ بے تاب، حالا درخانۂ او مشاعرہ می شود۔ شاعرِ فارسی ست۔ از برائے خاطر ریختہ گویاں گاہ گاہے دو سہ بیت می گوید۔ از کلامش دریافت خواہد شد، بسا بزرگ ست۔ دام افضالہ:

دل چھین لیا میرا بنارس کے بتوں نے — اِس وقت میں تو ای مرے اللہ کہاں ہی
جب قرصِ مہ کا آئینہ لاتی ہی چاندنی — صورت کسی کی یاد دلاتی ہی چاندنی

نگیں کی طرز یہ کیا سخت مجھ کو بھاتی ہے — کہ ایک نام کی خاطر جگر کھداتی ہے

(۵۹) بقا: غنچۂ بوستانِ وفا، سروِ موزونِ باغِ صفا، شیخ بقاء اللہ المتخلّص به بقا، ابنِ حافظ لطف اللہ که در لکھنؤ مشهوراند۔ جوانے ست به کمالِ خوبی، خوش فکر و خوش اندیشه، در شعرِ فارسی از شاگردانِ میرزا فاخر مکیں سلّمه اللہ تعالیٰ، لیکن شوقِ ریختہ نیز دارد۔ با فقیر صحبت ہا گرم داشته است۔ خدا سلامت دارد:

یاد میں تڑپے ہے دل کس ابروِ خم دار کی — آج کچھ ناخن بہ دل ہے آہ اس بیمار کی
کیا تجھ کو لکھوں خط حرکت ہاتھ سے گم ہے — خامہ بھی مرے ہاتھ میں انگشتِ ششم ہے
کل دستِ محتسب سے جوں توں مجھے چھڑایا — شیشے نے میری خاطر اپنا گلا بندھایا
یہ گل اندام جو صرفے سے ٹک اک ناز کریں — کام لیں زلف سے کاکل کو پس انداز کریں
دیکھیے منصبِ مجنوں یہ یہ لیلیٰ صفتاں — خاک میں ہم کو ملا کس کو سرافراز کریں

(۶۰) بسمل: بسمل تخلّص، گدا علی بیگ سپاہی پیشہ۔ جوانے ست آبلہ رو، نیک خو، در فیض آباد استقامت دارد۔ دیمک نامہ از و مشهور ست۔ خدایش سلامت دارد۔ از وست:

نہ مثلِ غنچۂ گل جمع کر کے سیم و زر لے جا — اگر آنا ہے اس باغِ جہاں میں کچھ ثمر لے جا
بھلے دل اگر دونوں جہاں دیتا نہ دیتا ہیں — یہ اب یوں ہیں لیے جاتا ہے تو اے مفت بر لے جا

از دیمک نامہ

جب کہ دیمک کی فوج چلتی ہے — زلزلے سے زمیں دہلتی ہے
وہم دیمک سے یار و اب کے سال — ہیں ستارے بھی آسماں کو زوال
در و دیوار و گلشن و محفل — ہیں گے دیمک کی خاک سے کہگل

در ہجو شخصے گفتہ دراں مقدمہ می گوید:

ہیں گے اک مہربانِ عالی شاں ‏ ‏ ‏ سُنیے اب ماجرے کا اُن کے بیاں
کہیں دیمک نے یہ کیا ہے خلل ‏ ‏ ‏ جیسے کچھ اُن کے گھر ہیں دیکو محل
دیکھے دست بقچے کی اگر صورت ‏ ‏ ‏ تو نظر آئے خاک کی مورت
مشروع محمودی بافتوں کے تھان ‏ ‏ ‏ کتریں ہیں اس قدر بہم یک سال
کہیے گر اُن کے نقش کی تمثیل ‏ ‏ ‏ بنے یک جلد کا غذی قندیل
اُن کی مسند کی کیا کروں تقریر ‏ ‏ ‏ نقش ہے روے خاک پر تحریر
چاندنی کو اگرچہ سمجھو آب ‏ ‏ ‏ پر جو معلوم ہو تو نکلے سراب
تھا جو قالیچہ مثلِ گلِ لالہ ‏ ‏ ‏ اِس سے بہتر ہے مکڑی کا جالا
یہ ستم ہے کہ ایک بھی پوشاک ‏ ‏ ‏ نہیں ثابت وہ پہنیں گے کیا خاک

در تعدی دیمک می گوید :

دیکھ لو تم بھی اتنا کرکے سراغ ‏ ‏ ‏ مہ کے سینے میں دیمکوں کا داغ
ذرے کے دام میں نہیں خورشید ‏ ‏ ‏ دیمکوں نے اُسے کیا ہے چھید
آگے اب اس سے کیا کہے بسمل ‏ ‏ ‏ جیسی دیمک سے اُن یہ ہے مشکل
ڈرے دیمک سے وہ جو پہنے شال ‏ ‏ ‏ یاں تو اب کس کے . . . . .
لنگلے زیر و لنگلے بالا ‏ ‏ ‏ نے غمِ دُزد و نے غمِ کالا

حرف (پ)

متوسطین

(۶۱) **پیام** : شرفِ الدین علی خاں، پیام۔ شاعرِ فارسی بود، صاحبِ دیوان،

در عہدِ محمد شاہ غفراللہ لہٗ۔ ریختہ نیز بہ طورِ ایہام کہ رائج آں وقت بود می گفت۔
اصل از اکبرآباد ست، از مدّتے وفات یافت۔ او تعالیٰ رحمت کناد۔ از وست:

نم بات منصور کی فضولی ہے ورنہ عاشق کی آہ سولی ہے
نم دلّی کے کج کلاہ لڑکوں نے ق کام عشّاق کا تمام کیا
نم کوئی عاشق نظر نہیں آتا ٹوپی والوں نے قتلِ عام کیا

(۶۲) **شاہ پنچھا**: شاہ پنچھا فقیرے بود در شاہ جہاں آباد۔ کاغذ و قلم ہمراہ داشت، ہر جا کہ می نشست می گفت و می نوشت، ہم فارسی و ہم ہندی:

دل مرا گردِ لبِ یار کے منڈلاتا ہے یہ شکر خورا شکر چھوڑ کہاں جاتا ہے

حرف (ت)

متقدّمین

(۶۳) **تجرّد**: میر عبداللہ، تجرّد تخلّص، از شاگردانِ سیّد عبدالواسع ست۔ قدیم ست، احوالش معلوم نیست۔ از وست:

نم تجھ رو میں لطف ہے سو ملک کو خبر نہیں خورشید کیا ہے اُس کے فلک کو خبر نہیں

(۶۴) **تانا شاہ**: ابوالحسن تانا شاہ رحمۃ اللہ از بادشاہانِ دکن بودؔ و در کمال عیاشی عمر شریف بہ سر می برد، ایں مطلع ازیں شنیدہ شدہ، بہ زبانِ دکن گفتہ:

م کس دھر کہوں کاں جاؤں میں مجھ دل پہ پہل بجھراٹ ہے
اک بات کیے ہوں گے سجن یاں جیو بارہ باٹ ہے

متوسّطین

(۶۵) تمکین : میاں صلاح الدّین، المتخلّص بہ تمکیں درویشے بود در وقت فردوس آرام گاہ، بہ کسے کار نہ داشت، بہ ہر نوع اوقات بہ سر می برد۔ ایں مطلع از و بہ گوش خوردہ :

نم حسن اور عشق کو جس روز کہ ایجاد کیا — مجھ کو دیوانہ کیا تجھ کو پری زاد کیا

(۶۶) تاباں : میاں عبدالحی، المتخلّص بہ تاباں در وقت محمّد شاہ بادشاہ مشہور و معروف ست۔ در وقتِ خویش نظیرے نہ داشت۔ سیّد زادہ بود بہ کمال حسن و وجاہت، تمام عالم فریفتۂ حسنِ او بود، بلکہ گرم بازاریِ ریختہ از اں شعلہ رُو دو بالا شد۔ اکثر اشخاص ایں فن را وسیلہ ساختہ، دخیلِ صحبتِ او می شدند۔ شاعرِ با مزہ و رنگیں طبع بود۔ چہرۂ کلامش با حسنِ یوسفی و احسن القصصِ بیانش باگرمیِ عشقِ یعقوبی۔ عاشقِ معشوق مزاج، بہ یک طفلے، سلیمان نام تعشّق داشت۔ چوں ہفت ہشت روز از حیات او باقی ماند، توبہ کرد، از بس کہ بہ سبب کثرتِ استعمال شراب مزاج او شدہ بود، از گزاشتنِ او از خود گزشت۔ از شاگردانِ میرزا محمّد علی حشمت۔ غرض آفتابِ تابانِ عمر او در شروعِ شبِ جوانی پنہاں گردید۔ خدایش بیامرزد :

ن اخگر کو چھپا راکھ ہیں میں دیکھ کے سمجھا — ن تاباں تو تہِ خاک بھی جلتا ہی رہے گا

جب یار مرا بگڑا خط آنے سے ای تاباں — تب حسن کو میں اُس کے کر یاد بہت رویا

دیکھ اُس کو خواب میں جب آنکھ کھل جاتی ہے صبح — کیا کہوں کیسی قیامت مجھ او پر لاتی ہے صبح

نم پاس تو سوتا ہے چنچل پر گلے لگتا نہیں — منّتیں کرتے ہی ساری رات ہو جاتی ہے صبح

خزاں تک تو رہنے دے صیّاد ہم کو — کہاں یہ چمن اور کہاں آشیانہ

ترے غم سے نسیاں ہی یاں تک تو مجھ کو
اِدھر بات کہنا اُدھر بھول جانا

آشنا ہو چکا ہوں میں سب کا
جس کو دیکھا سوا پنے مطلب کا

لیا تھا دوستی سے جس نے جی آہ
وہ اب دشمن ہوا ہی میرے جی کا

نہیں اک لمحہ بے تابی سے فرصت
الٰہی دل لگا تھا کس گھڑی کا

ہمیشہ رات کو غیروں کے رہنا
پھر آ کر صبح کو یوں ہم سے کہنا

جو یار آیا تو میں دوں گا دکھائی
تم ای آنکھو کہیں مت پھوٹ بہنا

عجب احوال ہی تاباں کا تیرے
کہ رونا رات دن اور کچھ نہ کہنا

تمھارے ہجر میں رہتا ہی ہم کو غم میاں صاحب
خدا جانے جییں گے یا مریں گے ہم میاں صاحب

مرا بس ہو تو ہرگز خط نہ آنے دوں ترے لیکن
لکھا قسمت کا کوئی بھی مٹا سکتا ہی کیا قدرت

ہاتھ میں اُس کے ہاتھ تھا ہیہات
دل مرا گم ہوا ہی ہاتھوں ہاتھ

غیر کے ہاتھ میں اُس شوخ کا داماں ہی آج
میں ہوں اور ہاتھ ہی اور میرا گریباں ہی آج

ہم کو تم بن ایک دم ای جان جینا ہی محال
تم تو ہوتے ہو جدا لیکن ہمارا کیا علاج

تجھ کو غرض نہیں ہی کسی آشنا سے شوخ
کوئی مرے کوئی جیے تیری بلا سے شوخ

بتاں کے عشق میں میں کیونکہ ہوں شاد
کہ اُن کو دیکھ آتا ہی خدا یاد

لے دل کی خبر چشم مرے یار کی کیوں کر
بیمار عیادت کرے بیمار کی کیوں کر

آشنا تو مجھ سے ایسا ہی کہ جیسا چاہیے
پر جو کچھ جی چاہتا ہی ہاے وہ ہوتا نہیں

مرتے ہیں آرزو میں اِس وقت آن پہنچو
ٹک تم کو دیکھ لیں ہم جلدی سے جان پہنچو

تو بھلی بات سے بھی میری خفا ہوتا ہی
آہ یہ چاہنا ایسا ہی بُرا ہوتا ہی

عاشق نے وقتِ مرگ کہا یار سے یہی
سمجھوں گا تجھ سے حشر کے دن دیکھ تو سہی

تاباں نے تجھ کو دیکھتے ہی اپنا جی دیا
سننے نہ پایا تیری نہ اپنی ہی کچھ کہی

کیا میں فرض کہ محشر کے تئیں مجھے بخشیں
جو تو نہ ہوئے تو فردوس بھی جہنم ہی

ن ترے پاس عاشق کی عزت کہاں ہی
تجھے بے مروت مروت کہاں ہی

نم بیاں کیا کروں ناتوانی میں اپنی
مجھے بات کہنے کی طاقت کہاں ہی

ن گئے نالے تجھے برباد مانندِ جرس حیف
اثر دیکھا تری فریاد میں دل ہم نے بس حیف

م ترے ابرو کو نہ چھوڑے گا مرا دل ہرگز
گوشت ناخن سے بھلا کوئی جدا ہوتا ہی

ن تو مے پی اس قدر ظالم کہ تجھ کو کیف کم ہوئے
ترا بے ہوش ہو جانا ہمارا ہوش کھوتا ہی

بتاں کے شہرِ پرساں میں کب کوئی داد کو پہنچے
مگر یاں اپنے بندوں کی خدا فریاد کو پہنچے

ہزاروں بار صاحب ہوش کی تدبیر پھرتی ہی
ولیکن حق تعالیٰ کی نہیں تقدیر پھرتی ہی

سلیماں کیا ہوا گر تو نظر آتا نہیں مجھ کو
مری آنکھوں کی پتلی میں تری تصویر پھرتی ہی

کہتے ہیں اثر ہے گا گریے میں یہ ہیں باتیں
اک دن بھی نہ یار آیا روتے ہی کٹیں راتیں

کر یاد تری ظالم روتا ہوں میں ہر ساعت
غصے کا وہ ٹھکرانا اور پیار کی وہ لاتیں

ہونٹوں پہ تیرے ظالم مسی کی یہ دھڑی ہی
یا اُن کے تئیں کسی نے نل نل کیا ہی نیلا

ن ہوتا ہوں ترا جو اشتیاقی ساقی
د بے خود ہو پکارتا ہوں ساقی ساقی

ن ہی مجھ کو خمارِ شب کا لا صبح ہوئی
شیشے میں جو کچھ کہ مے ہو باقی ساقی

(۶۷) محمد تقی : سیدِ نجیب الطرفین از مرثیہ گویانِ حضرت ابا عبداللہ الحسین، سید محمد تقی، عرف میر گھاسی۔ فقیر او را نہ دیدہ، لیکن اکثر اوصافِ آں بزرگوار شنیدہ، مولدش شاہ جہاں آباد، الحال بہ طرفِ فرخ آباد استقامت دارد، گاہ گاہے فکرِ شعر ہم می کند۔ از وست:

نم تو ہو اور باغ ہو اور زمزمہ کرنا بلبل
تیری فریاد سے جیتا ہوں نہ مرنا بلبل

ترے عتاب سے کس دن یہ رنگِ رُو نہ اڑا
کہ مرغِ روح مرا اُس کے دُو بہ دُو نہ اڑا

مرے ادب نے رکھا مجھ کو یاں تلک محروم
کہ بعدِ قتل بھی دامن طرف لہو نہ اڑا

تجھ ہجر میں ای لشکرِ خوباں کے شاہ
سینے پہ مرے غم سے ہی یہ حالت آہ
جیسے رکتی ہی پُل پہ دریا کے بھیڑ
پیچھے کو نہ پھر سکے نہ آگے کو راہ

حرف (ث)

متوسّطین

(۶۸) **ثاقب** : دریں فصل از متوسّطین ثاقب تخلّص مردے درویش گزشتہ است، از شاگردانِ میاں آبرو۔ در اواخر شعرِ خود پیش خان آرزو می گزرانید۔ از وست:

ثاقب کی نعش اوپر قاتل نے آکے پوچھا
یہ کون مرگیا ہی کس کا ہی یہ جنازہ

(۶۹) **ثابت** : شجاعت اللہ خاں، از شاگردانِ میاں حسرت ست۔ ثابت تخلّص دارد۔ از متاخرین ست۔ نبیسۂ نوّاب شیر افگن خاں، نبیرۂ نوّاب دل دلیر خاں۔ اصلِ ایشاں پانی پت کہ قصبہ است متصل شاہ جہاں آباد۔ پیشتر گاہ گاہے فکرِ شعر داشت، الحال، از مدّتے راغب بہ ایں کار نہ می شود۔ خدایش سلامت دارد:

یہ سچ کہو کہ کیا کس نے بدگماں تم کو
غبار میری طرف سے ہی ای بتاں تم کو
ہم آپ جانتے سو اُس سے عرض کر لیتے
ہمارا حال نہ کہنا تھا دوستاں تم کو

میں ہوا کل جو یار سے رخصت
نہ ہوا اختیار سے رخصت
مثلِ بلبل کے مرگیا **ثابت**
ہوتے ہی گل عذار سے رخصت

کیا ہی بے اختیار روتا ہوں
جس گھڑی مجھ کو یاد آتے ہو
آتے ہو دن میں تم تو کئی بار اس طرف
پر دیکھتے نہیں کبھی ای یار اس طرف

(۷۰) **رتیناتھ سنگھ** : رتیناتھ سنگھ، محرّرِ دل پزیر و مورّخِ بے نظیر، صاحب کمال، بہ سنِ ہفتاد سال، از معتقدانِ خواجہ میر، درد ست۔ در علمِ تاریخ

چناں فکرش رساست کہ اکثر قصائد دارد کہ در ہر مصرعش تاریخِ ممدوح برمی آید۔ بہ فرمایشِ یاراں تاریخ ہا بسیار گفتہ است۔ با فقیر بسیار آشناست۔ سلامت باشد۔ تاریخ چاہ گفتہ، مصرع:

"آب ازیں چاہِ بے نظیر برآر"

تعمیۂ آب بسیار مناسب افتادہ کہ بہتر از بے تعمیہ گردیدہ۔

حرف (ج)

متقدّمین

(۷۱) **جنوں**: جنوں تخلّص، اکبرآبادی از قدیم ست۔ دیگر احوالش بگوش نہ رسیدہ۔ از وست:

تھی جس پہ تری مہر وہی خیر سے پہنچا ۔۔۔ پہنچا کوئی کعبے سے کوئی دیر سے پہنچا

جنوں کا یاں تلک ہی گرم بازار ۔۔۔ کہ پتھر بھی نہیں سر کا خریدار

متوسّطین

(۷۲) **میر جعفر زٹلّی**: نادرۂ زماں و اعجوبۂ دوراں بود۔ اعلیٰ و ادنیٰ ہمہ کس از و ملاحظہ می کردند۔ الحال، اگر کسے در ہجوِ کسے بگوید، مدحِ خود می شمارند۔ غرض کہ میرِ مذکور در مدح و قدح بہ طورِ خود خوب می گفت۔ در مدحِ اعظم شاہ گفتہ:

ن
نگینِ سلیماں کہ تابندہ بود ۔۔۔ ہمیں اسمِ اعظم در و کندہ بود

نقل ست کہ روزے پیش میرزا بیدل رفت، میرزا در فکر مصرعے مصروف بودند، ملتفت نہ شدند۔ پرسید کہ صاحب و قبلہ کدام مصرعے فرمودہ اند؟ گفت "بلے، و آں ایں مصرع بود۔ "لالہ بر سینہ داغ چوں دارد" میر مسطور گفت "دریں تامل چیست "چو بکے سبز زیر ... دارد" میرزا ازیں معنی بہم برآمد زود چیزے دادہ، رخصت نمود۔ خدا اش بیامرزد۔ ایں مثنوی از وست کہ اکثر مولود ہا می خوانند:

شنو اے طوطیِ روحانیِ من — نہ کر الفت بہ رنگیں پنجرۂ تن
نہ تو یاں ہے نہ یہ پنجرہ رہے گا — بلا کر لال تجھ کو کیا کہے گا
جعفر بہ بوستانِ جہاں دم غنیمت ست — شادی نصیب اگر نہ شود غم غنیمت ست

در ہجوِ شاہ زادہ گفتہ:

ن چہارم پسر ڈومنی کا جنا — برج میں رہے جوں ...

(۷۳) **جعفر علی خاں**: خانِ عالی شاں، جعفر علی خاں، ولد میرزا مومن بیگ، جوانِ محمّد شاہی، از متوسلانِ نوّاب عمدۃ الملک، امیر خاں بود۔ بادشاہِ عالی جاہ، محمّد شاہ رحمۃ اللہ علیہ بہ منصب سہ ہزاری سرفراز نمودہ بود، در ذیلِ امرایاں مشہور بود۔ ذہن و ذکا و طبع رسا داشت۔ سوائی رام راجا بود برد تعشّق داشت۔ چناں چہ ایں مثنوی در عشق او گفتہ مشہور ست:

الٰہی شوق سے دل کو جلا دے — برہ کی آگ تن من میں لگا دے
جلا جوں پھل جھڑی مجھ ناتواں کو — شرر لب ریز کر ہر استخواں کو
فنا کر عشق میں یوں جانِ بے تاب — کہ جوں آتش میں کھپ جاتا ہے سیماب
جلا وحدت کی آتش سے دوئی کو — کہ بس ہے ایک چنگاری روئی کو

در نعت می گوید:

محمدؐ باعثِ ایجادِ ایماں — کہ جس کے واسطے آیا ہی قرآں
مقرر ہی کہ بزّازِ دکاں دار — دکھائے جنسِ اوّل آخرِ کار
اِسی سے جان ارفع اُس کا پایہ — کہ سب پیغمبروں کے بعد آیا

در منقبت می گوید :

علیؑ ہی شاہِ اورنگِ ولایت — شریعت کا معیں دیں کا حمایت
ہؤا کعبے سے نور اُس کا نمایاں — کہ جوں ظلمات سیتی آبِ حیواں
کیا معراج پر شیرانہ دھاوا — لیا افلاک پر چڑھ کر چڑھاوا
رسالت کے کرو اب سیر گھر کا — بنا ہی زور ایواں پانچ در کا
ن قضا کے راج کی صنعت گری دیکھ — نبی کے گھر کی یہ بارہ دری دیکھ
نبی کی آل پر سے وار جانا — اِسی بارہ پُلے سے پار جانا
خدا تک اب پہنچنا کیا ہی مشکل — کہ بارہ کوس کی ہی ایک منزل
اگر فہمید حکمت آشنا ہی — اِسی نسخے میں چودہ بدّیا ہی

در تعریفِ معشوق :

صفا اُس کے بنا گوشوں کی دیکھ آن — خجالت سے رہے موتی پکڑ کان
زبس گل برگِ لب میں نازکی ہی — کٹورے میں پیے ہی پھول کی مے

در مقدّمۂ آمدِ جنوں :

بگولا گم رہوں کا رہنموں ہی — نشانِ لشکرِ اہلِ جنوں ہی

ایں مثنوئ حقّہ بہ فرمایشِ فردوس آرام گاہ از اوّل تا چند بیت گفتہ، دلبعدہٗ میاں حاتم بہ اتمام رسانیدہ، این ست :

تماکو کو نہ جانوں کیا سبب ہی — ملا ہی گڑ سے اور کیوں کر طلب ہی
طلب گڑ کی اُسے ہی اس سبب سے — ملائے گڑ اِسے پیارے کے لب سے

اشعار متفرقہ از وست:

بلبل کو باغباں سے رہی نت کھٹا پٹی
تا صبح کیوں نہ ہوئے چمن میں چٹا پٹی

آ مجھ نین میں بس کہ بنا ہی ترے لیے
یہ خیمۂ سیاہ و سفیدِ پٹا پٹی

عشق میں بلبل کو کیا نسبت ہی پروانے کے ساتھ
جو نک مٹی میں ملے تو بھی لہو پیتی رہے

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں ہونا رفو
تا قیامت سوزنِ تدبیر اگر سیتی رہے

پروئے کیوں نہ ہر اک بات میں موتی دو جھتیسی
صفا دانتوں کی روشن ہی شبِ مستی میں تتّی سی

نہ ہو کھوجی انجھو کے کاروانِ منزل دو رہ تھے
خدا جانے کدھر یہ بے سر و پا جائیں گے بہ کے

(۷۴) **جوہر**: چراغِ بزمِ آشنائی و شمعِ انجمن آرائی تیغِ شجاعت را جوہر و کانِ مروّت را گوہر، میرزا احمد علی، المتخلّص بہ جوہر۔ مردے بود در نہایتِ خلق و اخلاق، در صحبت داری و یار باشی چالاک و چست و در کارِ آشنائی ہا درست۔ از زبانِ شیخ اسراری، سلّمہ اللہ شنیدم کہ اکثر مجمعِ شعرا در خانۂ او می شد۔ اصلش از ایران بود، مولدِ وی شاہ جہاں آباد۔ طبعِ موزوں داشت، اکثر فارسی می گفت، مگر ہمیں غزل ریختہ از وے بہ یادگار ماند کہ قلمی خواہد شد۔ می گویند کہ با یکے از آشنایانِ او جائے خانہ جنگی رُو داد، ایں خبر شنیدہ، در معرکہ در آمد، دو سہ را کشت و خود نیز کشتہ شد، غرض کہ تا جاں از یاراں دریغ نہ کرد۔ خدایش بیامرزد۔ از وست:

آتش دہِ چمن ہو یا برقِ آشیاں ہو
ای مُرغِ نالہ کچھ ہو یک شب تو پرفشاں ہو

شاید کہ پہنچے تجھ تک واماندہ کوئی ہم سا
آوارۂ بیاباں ای گردِ کارواں ہو

گر ہو سکے ہی تجھ سے اُٹھ ای غبارِ مجنوں
ناقے کے ساتھ تو بھی اک دو قدم رواں ہو

اتنا لب و دہاں تو جوہر ہو عاشقی میں
مُنہ پہ تو ہوئے نالہ اور زیرِ لب فغاں ہو

(۷۵) **جرات**: میر مستقیم، السیّد زادۂ عالی ہمّت، المتخلّص بہ جرات، از جوانانِ محمّد شاہی ست۔ بندہ او را در صغر سن بہ شاہ جہاں آباد دیدہ ام، بسیار

خوش رو بود، کہ بے اختیار دل را می ربود۔ حالا شنیدہ ام کہ بہ طرف پورنیہ بہ لباسِ درویشی بہ سر می برد۔ سلامت باشد۔ از وست:

ہر بُنِ مُو سے مرے شعلہ نمایاں کر دے ۔۔۔ دل تو جلتا ہی ہے اب سروِ چراغاں کر دے
جاؤں صحرا میں دِوانوں میں مری عزت ہو ۔۔۔ اپنے ہاتھوں سے مرا چاکِ گریباں کر دے
کون گلشن میں یہ بو مشک کی لے آتی ہے ۔۔۔ کہتے ہیں زلف کے کوچے میں صبا جاتی ہے

(۷۶) **جولاں**: میاں رمضانی، جولاں تخلص۔ جوانِ محمد شاہی، کماں دارِ بے نظیر بود۔ دیگر احوالش معلوم نیست:

رہتے ہیں رات دن خفا تجھ بن ۔۔۔ جیویں گے مجھ سے شخص کیا تجھ بن

متاخّرین

(۷۷) **جنوں**: میر علی مہتدا، شاگردِ شاہ فصیح۔ جنوں تخلص۔ از متاخّرین ست۔ احوالش معلوم نیست۔ کلامش پختگی نہ یافتہ:

رقیبوں کے گھروں میں ہائے کیوں وہ شوخ جاتا ہے ۔۔۔ لڑوں جا کر رقیبوں سے یہی اب دل میں آتا ہے
خمار آلودہ ماتا نیند کا ہے غیر صحبت میں ۔۔۔ صریحاً رات تو جاگا ہے کیوں باتیں بناتا ہے

(۷۸) **میاں جگّن**: میاں جگّن، خالہ زادۂ شیر افگن خاں، دعوائے شاگردیِ میر تقی می نماید۔ از مشاہیراں نیست۔ خدایش بہ سلامت دارد:

ن اے دل مریضِ عشق کو آزار ہے بھلا ۔۔۔ چنگا ہو تو ستم ہے یہ بیمار ہے بھلا

(۷۹) **جذب**: میر مظہر علی، المتخلص بہ جذب۔ در عظیم آباد استقامت دارد۔ گاہ گاہے فکر ریختہ می نماید۔ سلامت باشد:

ہے جنوں کا زورِ طوفاں اِن دنوں ۔۔۔ میں ہوں اور میرا گریباں اِن دنوں

(۸۰) **جوشش**: میاں محمد روشن المتخلص بہ جوشش۔ مردے ست ساکنِ عظیم آباد،

خوش طینت و نیک اعتقاد، شاعرِ شیریں کلام، صاحب دیواں، از خاصانِ آں دیارست۔ بندہ با وی ملاقات نہ کردہ، از سببِ بُعد اشعارش نیز بہ فقیر نہ رسیدہ، مگر چند بیت از زبانِ مرزا فدوی، سلمہ اللہ شنیدہ بودم، بہ نگارش می آید۔ مشتے نمونہ از خروارے، خدایش سلامت دارد:

توانائی جدا کرتی ہے اب آغوش سے مجھ کو گرامت دیجیو اے ناتوانی دوش سے مجھ کو
دل میں ہے اب قرب میں آئینہ سا پیدا کروں وہ مجھے دیکھا کرے اور میں اُسے دیکھا کروں

جوں آئینہ یہ ستم رسیدہ رہتا ہے مدام آب دیدہ
ہیں داغ میرے جزوِ بدن جوں پرِ طاؤس مخلوق ہوں اِس دہر میں ہم پیکرِ طاؤس

کلامش شاعرانہ است۔ شخصے می گفت کہ او در تالیفِ تذکرہ مشغول ست۔

(۸۱) **جانِ عالم خاں**: خانِ عالی شان، بلند مکاں، برادر زادۂ نوّاب روشن الدولہ مغفور، ولدِ مفتخر الدّولہ، **جانِ عالم خاں** بجز و خارِ طبعش از گوہر نثر و نظم لب ریز و افکارِ صدفِ معانیش چوں دیدۂ عشّاق جواہر ریز۔ گوہرِ طبعش از چشمۂ خورشید آب خوردہ، سہیلِ خطش از زلف نکویاں تاب بردہ۔ سنجشش بے حساب و شعرش چوں دُرِّ یتیم نایاب۔ در اوائل مشقِ سخن از میر سوز نمودہ در غزل تخلّص نہ می آرد، محتاجِ شہرت نیست۔ قابل و قابل دوست۔ خدایش سلامت باکرامت دارد۔ ازوست:

لگا خوبانِ نو خط سے یہ ملنے گھسیٹا پھر مجھے کانٹوں میں دل نے
چھوڑ عارض دل نے گھیرا زلفِ مشکیں فام کو صبح کا بھولا غنیمت ہے جو پہنچے شام کو

(۸۲) **جرات**: میاں قلندر بخش، المتخلّص بہ جرات، از شاگردانِ میاں حسرت۔ جوانے ست چیچک رو، خوش خلق و نیک خو۔ کلامش نمکین و بیانش شیریں۔ دستگاہِ شعورشش چوں دل صاحب ہمّتاں فراخ و گلزارِ معانیش چوں میوۂ آرزد

شاخ در شاخ۔ اصل از شاہ جہاں آباد، نشو و نما در فیض آباد یافتہ۔ شوقِ شعر از حد زیاد دارد۔ اگرچہ در علمِ موسیقی و ستار نوازی نیز دستے بہم رسانیدہ، لیکن آنچہ گویند دیوانۂ فنِ شعر ست کہ گاہے بے فکر نمی ماند۔ بسیار دردمند و گداز بست۔ مثنوی ہجو برسات و کھٹمل نامہ ہم گفتہ۔ دریں نوجوانی بسیار بہ حلم و حیا بسر می برد۔ خدایش سلامت دارد:

کیا سحر کیا ہے یار دل کو
تجھ بن جو نہیں قرار دل کو

آنے کی خبر ہے اُس کے لیکن
آتا نہیں اعتبار دل کو

تب زخم تو اُس کے بھرنے پائیں
جب صبر ہو اس فگار دل کو

نالہ و آہ و فغاں میرا ہی دم بھرتے ہیں
آپ کا جان کے سب مجھ پہ کرم کرتے ہیں

ہے عین ہجر ہی میں میسّر وصالِ دوست
اب کچھ خیال دل میں نہیں جز خیالِ دوست

سب سے ملتا ہے وہ اک ہم سے ملاقات نہیں
آہ کیا کیجیے دم مارنے کی بات نہیں

وصل کی رات مرا جی ہی نکل جاتا ہے
جب کہ آواز یہ آتی ہے کہ اب رات نہیں

اُس کے کوچے میں گئے یا نہ گئے اے ہمدم
ہے مساوات ہمیں دل کو مساوات نہیں

اپنا میں دردِ دل اس طور جتا رہتا ہوں
حسبِ حال اس کو کوئی شعر سنا رہتا ہوں

بات میں کس کی سنوں آہ کہ اے مرغِ چمن
شور میں اپنے ہی نالوں کے سدا رہتا ہوں

اے ستم ایجاد، کب تک یہ ستم دیکھا کریں
تو کرے غیروں سے باتیں اور ہم دیکھا کریں

کچھ تو نکلے آرزو دشنام دے تلوار کھینچ
چشمِ حسرت سے کہاں تک دم بہ دم دیکھا کریں

ہم کچھ اسیر ہوتے ہی خاموش ہو گئے
سب چہچہے چمن کے فراموش ہو گئے

چین اس دل کو نہ اک آن ترے بن آیا
دن گیا رات ہوئی، رات گئی، دن آیا

صیاد نے جفا تو یہ ایجاد اور کی
پر میرے کاٹے اور سُنی فریاد اور کی

جرأت ذلیل ہو چکا مارا ہی جائے گا
اب کے جو اُس نے پھر کہیں فریاد اور کی

کیوں مُکرتا ہے جو کچھ ٹھانی ہے تو نے دل میں سب مرے جی پہ عیاں ہے تجھے معلوم نہیں

(۸۳) **جلال الدّولہ** : جلال الدّولہ، جلال الدّین وکیل مرہٹہ، مشیر نواب عماد الملک۔
ازوست :

ماہ رو مسند پہ بیٹھا جب سے دل بے تاب ہے چاندنی کے فرش پر کیا عالمِ مہتاب ہے

حرف (ح)

متقدّمین

(۸۴ و ۸۵) **حبیب و حسن** : حبیب و حسن تخلص از خاکِ دکن بودند۔ اکثر اشعار ایں ہا در بحرِ کبت بہ نظر آمدہ۔ چوں الفاظش ربط بہ یک دیگر نہ داشتند بہ قلم نیاوردہ۔

متوسّطین

(۸۶) **حیا** : حیا تخلّص ہم کسے گزشتہ است۔ چند شعر در سلکِ متوسّطین دیدہ شد۔ اغلب کہ زن باشد۔ احوالش معلوم نیست، و نیز بے ربط می گوید۔ ازوست :

حیا کی تلخ کامی کا یہ قصہ مفصّل جا کہو شیریں سخن کو

(۸۷) **حاتم** : شیخ محمّد حاتم، المتخلّص بہ حاتم، شاعرے ست صاحب کمال و پسندیدہ افعال، عالی فطرت و بلند ہمّت، معاصرِ میاں آبرو۔ دو دیوان ترتیب دادہ، یکے بہ زبانِ قدیم بہ طورِ ایہام و دوم بہ زبانِ حال ادائیہ۔ شہرۂ اشعارش بسیار ست۔ اکثر غزل ہائے او را نغمہ سرایانِ ہند می خوانند۔

تا حال در شاہ جہاں آباد مقیم ست۔ از وست:

ن مثالِ بحر موجیں مارتا ہے | کیا ہے جس نے اس جگ سے کنارہ ن
ن ہجر کی زندگی سے موت بھلی | کہ جہاں سب کہیں وصال ہؤا
ن تو نہیں تو کنج تنہائی میں ہے | بوریا کا نقش ہم پہلو مرا
ن حاتمِ بے کس کا تجھ بن کون ہے | کون ہوگا جو نہ ہوگا تو مرا
ن سجن نے یاد کر نامہ لکھا اور ہم رہے غافل | بجا ہے معذرت لکھنا ہمیں کاغذ خطائی پر
ستم سے تیرے میں جاتا ہوں پھر نہ کہیو تو | کہ آشنائی کا حاتم نباہ بھی نہ کیا
ن کوئی دیتا نہیں ہے داد بیداد | کوئی سنتا نہیں فریاد فریاد
ن جب سے تیری نظر پڑی ہے جھلک | تب سے لگتی نہیں پلک سے پلک
ن ایک دن ہاتھ لگایا تھا ترے دامن کو | آج تک سر ہے خجالت سے گریبان کے بیچ
شانہ نہ کیجو زلف میں زنہار دیکھنا | بہتوں کے دل ہیں اس میں گرفتار دیکھنا

(۸۸) **حاتم** : سیّد حاتم علی خاں، حاتم تخلص۔ ایں ہم از سلکِ متوسطین ست۔ مولدش جون پور۔ شاگردِ میاں مضمون بودہ است۔ خدا ایش بیامرزد:

شاید محبت اب کے زمانے میں ڈوب گئی | آتی نظر نہیں جو کسی آشنا کے بیچ

(۸۹) **حشمت** : حشمت عالی ہمت و بلند فطرت، سیّد محتشم علی خاں، المتخلص بہ حشمت، ولدِ میر باقی، سپاہی پیشہ، عمدہ روزگار بود۔ برادرِ خُردِ میر ولایت اللہ خاں، ریختہ و فارسی ہمہ گفت، فہمیدہ و سنجیدہ متواضع مؤدب۔ آخر روزگار ترک نمودہ، خانہ نشیں بود، ناگاہ فوراً فوت شد۔ از وست:

نم نکہتِ گل نے جگایا کسے زندان کے بیچ | پھر یہ زنجیر کی جھنکار پڑی کان کے بیچ
نم بہار آئی دِوانوں کی خبر لو | اگر زنجیر کرنا ہے تو کرلو

ایں واسوخت از و مشہور ست: "کیوں لے دل جاہی پھنسا میں نہ تجھے کہتا تھا"

بندِ دوّم ایں بندہ را خوش آمد:

حاسداں تم کو جدا بیٹھ کے بہکاتے ہیں
ہم سے دل توڑ تمھارے کو وو بہلاتے ہیں
کیا ہوا تم کو بھی اب گرچہ وہی بھاتے ہیں
آج کل جور تمھارے سے وو سب جاتے ہیں
پھر وہی تم ہو، وہی ہم ہیں، وہی باتیں ہیں
پھر وہی عیش وہی دن ہیں، وہی راتیں ہیں
باز فردا ست کہ زلفِ تو بود در دستم
من ہماں عاشقِ دیرینہ کہ بودم ہستم

(۹۰) **حزیں**: میر محمّد باقر مردے ست از سلکِ متوسّطیں، المتخلّص بہ حزیں، از ساداتِ اکبرآباد۔ سپاہی پیشہ شاگردِ میرزا مظہر۔ از مدّتے بہ طرفِ بنگالہ رفت۔

خدا اش سلامت دارد:

ن اُس بے وفا کے عشق میں کچھ مجھ کو حَس نہیں
پانو تلک بھی ہاے مجھے دست رس نہیں ن
ویراں ہوا ہی باغ خزاں سے یہاں تلک
چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں
جس دن سے میں سُنا ہی کہ آخر ہوئی بہار
اُس دن سے چھوٹنے کی مجھے کچھ ہوس نہیں
کیا کیا گزرتی ہوئے گی اُن پر چمن کے بیچ
اِن بلبلوں کا ہاے کوئی دادرس نہیں
کس کس مزے سے دھوم مچائی تھی تب تلک
جاتی ہی یوں بہار، حزیں ہاے بس نہیں
کہا میرا اگر وہ شوخ مانے
تو غیروں کو نہ دوں اُس پاس جانے
حزیں اک دم نہ جیتا تھا سجن بن
سو یوں گزرے جدائی کے زمانے
م وہ کہ ہی ملک مسلّم جسے یکتائی کا
خوب لیتا ہی مزہ عالمِ تنہائی کا
م میں تو بندہ ہوں تری جور و جفا کا لیکن
سخت دھڑکا ہی مجھے اس دلِ سودائی کا

(۹۱) **حشمت**: محمّد علی، حشمت تخلّص، از شاگردانِ محمد علی بیگ، قبول تخلّص۔ مردم کشمیر بود، اُستادِ عبدالحی، تاباں۔ شاعرِ مربوط گو و دقّت پسند بود۔ ہم راہِ قطب الدین علی خاں، طرفِ سہارن پور گشتہ شد۔ خدا ایش بیامرزد:

ن جب آخر اں چمن میں ہوئی آشنا ے گل
تب عندلیب رو کے پکاری کہ ہاے گل

نم
خط نے ترا حسن سب اڑایا
یہ سبزہ قدم کہاں سے آیا

(۹۲) **حسن** : میرزا حسن علی، حسن تخلص، برادرِ جعفر علی خاں - ایں بیت در مرثیۂ امام علیہ السلام از وست :

یہ کس طرح کا زخم لگا تھا حسین کے
اب تک بہے ہے خون حسن دل کے گھاؤ سے

متاخرین

(۹۳) **حیرت** : مراد علی، حیرت تخلص متوطنِ مراد آباد - طبع رسا دارد - سلامت باشد - از وست :

کہاں ہے شیشۂ مے محتسب خدا سے ڈر
مری بغل میں جھلکتا ہے آبلہ دل کا
کیا قافلے یاروں کے آگے کہیں ٹھہرے ہیں
آوازِ جرس کم ہے یا کچھ ہمیں بہرے ہیں

(۹۴) **حسن** : میر حسن، المتخلص بہ حسن، در کمالِ خوبی و اخلاق - ظاہر حالش بہ لباسِ دنیا داری آراستہ، و باطن بہ زیورِ فقیری پیراستہ، مدتے در صحبتِ یونس خاں بہ سر بُرد - گاہ گاہے دو سہ بیت می گوید - خدایش سلامت دارد - از وست :

تھی ہمیں سیر کوئی دن اُسی مے خانے کی
اب خبر ہے نہ صراحی کی نہ پیمانے کی
تیغ ابرو نے تو مارا ہی تھا جو زلف نہ ہو
غیر زنجیر خبر کون لے دیوانے کی
اے حسن آپ کو سمجھے گا تو کیا بن جیئے
سرِ حق ہے یہ نہیں بات ترے پانے کی

(۹۵) **حسن** : خواجہ حسن، گلشنِ بوستانِ آشنائی و سروِ گلستانِ رعنائی، خوش فکر و خوش سخن، متخلص بہ حسن، ابن خواجہ ابراہیم، نبیرۂ حضرت خواجہ کھاری، قدس اللہ سرہٗ از فرزندانِ خواجہ مودود چشتی - جوانے ست درویش، صالح، متقی و متواضع، مؤدب - در فنِ طلسم و شعبدہ بازی نیز ماہرست -

مدّتے بہ طرفِ بریلی اقامت داشت۔ چوں از تخلّص فقیر واقف نہ بود بنا بریں حسن تخلّص نمود۔ الحال، بہ فیض آباد استقامت دارد۔ خدایش بہ سلامت دارد۔

از وست:

دل دلاسوں سے کرے ہی بے قراری بیشتر — خانۂ ماتم میں ہو پرسے سے زاری بیشتر
صحبتِ سنگیں دلاں سے کیوں شہ ہو خوں ریز حسن — سنگ سے شمشیر کو ہی آب داری بیشتر
کب میں کہتا ہوں کہ میری جان جانے سے رہے — پر ٹک ایسا ہو کہ یہ دل تلملانے سے رہے
ہم نے ایسی بھی تو کچھ چوری نہ کی تھی آپ کی — بے سبب جو آپ اب ادھر کے آنے سے رہے
آہ کس کس بے وفائی کا میاں کیجے شمار — اور تو سب یک طرف منہ بھی دکھانے سے رہے
اُس نے کس کس طرح اپنے در سے ٹالا ہم کو پر — دیکھ تو ہم بھی حسن کس کس بہانے سے رہے

(۹۶) حجّام: حجّام تخلّص شخصے ست حجام در شاہ جہاں آباد، متّصل مدرسۂ غازی الدین خاں دکانِ سخن را گرم داشتہ، مضمون تراشی می نماید، لیکن از یں شعرا و معلوم شد کہ کلامش بے اصلاح ست، در موشگافی معانی قصر دارد۔ شعر این ست:

کام کیا زور یہ حجّام نے — شیخ کی ڈاڑھی کو قصر کر گیا

(۹۷) حامد نصیری: میر حامد نصیری، درویشِ گوشہ نشیں، بہ کمالِ صلاح و تقویٰ، متواضع و مؤدّب از مریدانِ حضرت میر نصیر دام افضالہٗ، کہ الحال جانشینِ حضرت خواجہ محمّد باسط، نوّر اللہ مرقدہٗ ہستند۔ غرض ہماں جا بر دروازۂ پیرِ خود از سرِ اعتقاد بہ سر می برد، شوقِ شعر بہ مرتبۂ دارد کہ در گفتن نہ می آید، اشعارِ بسیار جمع نمودہ چوں فراولت اکثر بہ شعر و سخن دارد، گاہ گاہے بعد از سال و ماہے بیتے یا رباعی موزوں می کند خدایش سلامت دارد۔ رباعی از وست:

دنیائے دنی کو جو کہ فانی سمجھے — اور قصۂ عمر کو کہانی سمجھے

دریاے حقیقت کو وہی جاوے پیر   جو مثلِ حباب زندگانی سمجھے

(۹۸) حضور: حضور تخلّص شخصے ہندو، در شاہ جہان آباد۔ رطب و یابس بسیار دارد:

زبانِ شمع سے روشن ہُوا یہ اہلِ مجلس پر   کہ یاں جو دم گزرتا ہی ترقّی ہی تنزّل میں

(۹۹) حیراں: میر حیدر علی، گلِ بوستانِ سیادت و سروِ جویبارِ شرافت، از نجباے زماں، میر حیدر، المتخلّص بہ حیراں۔ جوانیست شگفتہ رو، نیک خو، سلیقۂ سخنش نہایت خوب و فکرِ دل پزیرش بسے مرغوب۔ اصل وی از شاہ جہان آبادست۔ الحال در لکھنؤ استقامت دارد۔ از شاگردانِ لالا سرب سکھ کہ شاعرِ فارسی ست، و دیوانہ تخلّص دارد۔ با فقیر بسیار دوستی دارد۔ سلامت باشد:

دکھ اُس سے کون کہے تابِ التماس کہاں   کسے ہی ہوش بجا دل کہاں حواس کہاں
ہُوا ہی اب تو نئے دوستوں سے ربط و لے   تمھیں اب آنے کی فرصت ہمارے پاس کہاں
ہُوا نہ ہم کو کبھی سیرِ باغ و کشت نصیب   کریں گے زیست کا کیا یاد ہم سے زشت نصیب
دلِ ستم زدہ کا آج پوچھتے ہو حال   غمِ فراق سے کب کا ہُوا بہشت نصیب
کٹے شب کس توقع پر ہماری چین سے حیراں   اب آیا دم میں آیا دن توان باتوں میں کٹتا ہی
اپنے جانے کا نہ واں دن کو ہی نہ رات کو ڈھب   دیکھیے کیسی بنے آن پڑی بات کڈھب
روئے بن کوئی گھڑی دل نہیں لگتا اپنا   یار بن آ پڑی اپنی نپٹ اوقات کڈھب
دردِ دل غیر کے ہونے سے نہ کہنے پایا   کل میسّر ہوئی حیراں کو ملاقات کڈھب

ق
کل کہا میں نے میرے گھر چلیے   اِس میں کچھ کم نہ ہوگی محبوبی
سن کے تیوری بدل کے کہنے لگا   رسم و راہِ ادب تو سب ڈوبی
مجھ سے کہتا ہی میرے گھر چلیے   دیکھیے اختلاط کی خوبی

کلیجہ بھن گیا کب تک کرو گے ہائے بے دردی
اٹھوں میں ہی جہاں سے یا کہ اُٹھ جائے یہ بے دردی

(۱۰۰) **حسرت** : از شعرائے دوراں و فصحائے زماں، غنچۂ گلشن محبّت، میاں جعفر علی، المتخلّص بہ حسرت۔ طبعش از چمنِ خوبی بہ شکلِ طوبیٰ بر خاستہ و درجِ فطرتش رشتۂ سخن دانی از جواہرِ معانی آراستہ۔ شربتِ عذب بیانش را قوام عالی، و گوہرِ طبعِ رواں‌اش را نظم متوالی۔ خلفِ میاں ابوالخیر کہ بہ پیشۂ عطّاری در لکھنؤ متّصلِ اکبری دروازہ بہ سر می برد۔ جولانیِ طبعش از حد گزشتہ۔ قصیدہ ہا در زمینِ مشکل گفتہ۔ فکرِ ہر کس بہ قدرِ ہمّتِ اوست۔ حالا بہ وسیلۂ فنِّ شاعری در سرکارِ حسن علی خاں بہادر سرفراز ست۔ مدّتے اصلاحِ سخن از رائے سرب سکھ گرفتہ، الحال منحرف ست۔ غرض مثلِ او پیدا نیست۔ خدا ایش سلامت دارد۔ کثرتِ شاگردانش چناں ست کہ در صورت شناسی خود ہم حیران ست :

کس کا ہی جگر جس پہ یہ بیداد کرو گے
لو دل تمھیں ہم دیتے ہیں کیا یاد کرو گے

بہ رنگِ آبلہ ای واے یہ کیا زندگانی ہی
کہ جس کے پانو پڑتے ہیں اُسی کو سرگرانی ہی

جب تلک سینے میں دل تھا داغ بھی جلتا رہا
بے چراغ اب گھر ہوا مالک جو تھا جلتا رہا

چھنے تیرِ نگہ سے دل اگر یوں ہو تو بہتر ہی
بنے غربال کی صورت جگر یوں ہو تو بہتر ہی

کہے وہ اپنے منہ سے قتل حسرت کو کیا میں نے
مرے مرنے کی عالم میں خبر یوں ہو تو بہتر ہی

سرشکِ گرم یہ جس بحر سے ملے نکلے
حباب ہو کے وہیں اُس پہ آبلے نکلے

تمام دن تھے جدا آہ شمع و پروانہ
ملے جو شب کو تو آپس کے سب گلے نکلے

رقیب نے ہمیں توام ہو جس طرح بادام
جو توڑا اُس سے تو دونوں کے دل ملے نکلے

تری فرقت میں ہی شام و سحر مجھ کو عجب مشکل
جو شب کاٹی تو دن مشکل جو دن کاٹا تو شب مشکل

ابھی تو حسرت اُس پر عشق یہ پوشیدہ ہی ترا
وہ جب پہچان جائے گا تجھے ہوئے گی جب مشکل

تم جو کہتے ہو کہ دو حسرت کو ق آہ و فریادیاں کیا نہ کرے
آپ کا اس میں کیا بگڑتا ہے درد دل کی کوئی دوا نہ کرے

ای شوق کیا ہے یاد تجھے آہ دست برد کی تونے دل پہ لاکھ سر راہ دست برد
چھینا ہے تونے ہی دل پُرخوں حنا سے یہ ثابت ہے تیرے ہاتھ پہ واللہ دست برد
دل رکھتے تھے بساط میں حسرت سو دے چکے اب غارت اس دیار میں ہو خواہ دست برد

اتنا رسوا یہ دل زار ہوا کچھ نہ ہوا کچھ بھی یہ عشق سے بیزار ہوا کچھ نہ ہوا
دل میں سو بات تھی پر اُس نے جو پوچھا احوال مجھ سے کچھ درد دل اظہار ہوا کچھ نہ ہوا
سارے ہستی کے بکھیڑے ہیں وگرنہ دم مرگ کچھ سرانجام بھی درکار رہا کچھ نہ ہوا
کاش کے عشق جتاتا نہ میں اُس کو حسرت میری صورت سے وہ بیزار ہوا کچھ نہ ہوا

مثال اُس شمع کے جس کو ہوائے تند لگتی ہے ہماری ساعت آپہنچی ہے اب خاموش ہونے کی
ہوئے ہیں اس قدر آفت زدہ ہم تو کہ اب ہم یاں نہ کیفیت ہے ہنسنے کی نہ کچھ لذت ہے رونے کی

در ہندوستان رسم ست کہ برای پوشیدن پستاں اکثر زناں دامن را بہ گریباں می کشند دراں مقدمہ می گوید:

شاید اس دامن میں پیارے خون بے تقصیر ہے تیرا دامن آج کیوں تیرا گریباں گیر ہے

دل درد بتاں سے آہ کیوں کر نہ کرے ر پر آہ تو تب کرے جو ان سے نہ ڈرے
وہ شکل ہے جیسے دشمنوں میں گھائل دم لیوے تو سر کٹے نہ دم لے تو مرے

(۱۰۱) **حسن**، پارۂ از احوال فقیر مؤلف کتاب: پوشیدہ نہ ماند کہ اصل این فقیر ابن غلام حسین، ولد میر عزیز اللہ بن میر امامی، ہروی ست۔ میر امامی نور اللہ مرقدہ ہفت قلم و فاضل متبحر بودند۔ بہ سبب فضیلت در شاہجہاں آباد آمدہ، بین الاقران ممتاز گردیدند، گاہ گاہ شعر ہم می فرمودند، پس این عاجز سخن را سررشتۂ شاعری اجدادی ست نہ امروزی، حاصل کہ از صغر سن میلان طبیعت این فقیر بہ طرف

سخن بیشتر بود، بارے حق تعالیٰ دریں فن کم و بیش موافقِ ظرف استعداد و قبولیت بخشید، اصلاحِ سخن از میر ضیا سلمہ اللہ گرفتہ ام، لیکن طرزِ اوشاں از من کما حقہ، سرانجام نہ یافت، بر قدم دیگر بزرگاں مثلِ خواجہ میر درد و میرزا رفیع، سودا و میر تقی پیروی نمودم۔ شروع جوانی از گردشِ روزگارِ بد ہنجار کہ ہرگز بہ کسے وفا نہ کردہ است، بہ طرفِ لکھنؤ و فیض آباد رسیدم، بارے کم و بیش از قدر دانیِ نواب فلک جناب، سالار جنگ بہادر، دام اقبالہ، بہ لبِ ناں رسیدہ، در خدمتِ میرزا نوازش علی خاں بہادر صحبت گزیدم کہ خلفِ ارجمند اوست۔ چناں چہ تا حال بہ ہر نوع گزراں می نمایم۔ اکثر بہ فرمایشِ نواب معلّی القاب مرثیۂ امام علیہ السلام نیز بہ گفتن می آید، ازاں کہ طبع عالیِ آں بزرگوار در ہمہ فن بلند افتادہ است، علی الخصوص در علم موسیقی کہ از حصر و بیاں بیرون ست، سوزہاے مرثیہ طرح می نمایند، و ایں حسنہ براے آخرت ست۔ اجرہٗ الی اللہ، و سردار جنگ بہادر نیز ہمیں طور دریں فن ذہنِ رسا و گوشِ شنوا دارند۔ حق تعالیٰ عمرِ دولتِ ایشاں را تا جہان ست مع فرزنداں قائم دارد، فقیر دریں مدت قریب ہفت ہشت ہزار بیت گفتہ باشد، و یک ترکیب بند و یک رموز العارفین گفتہ است کہ مقبولِ دل ہا گردیدہ، مشہور شدہ است۔ دو سہ بندِ او در اواخر قلمی خواہد شد۔ اوّل چند اشعار براے یادگار در ذیل ایں بزرگاں مسطور می نماید شاید کہ مقبولِ دل ہا افتد:

گرچہ از نیکاں نہ ام خود را بہ نیکاں بستہ ام
در ریاضِ آفرینش رشتۂ گلدستہ ام

گر کیجے رقم کچھ تری وحدت کے بیاں کا | تو چاہیے خامہ بھی اسے ایک زباں کا
رکھتے ہیں نہ کچھ نام ہی اپنا نہ نشاں ہم | کیا نام و نشاں پوچھو ہو بے نام و نشاں کا

سر دیوے گا جس دن تو حسن تیغ کو اس کی
اسرار کھلے گا جبھی اس سِرِّ نہاں کا

چھوٹا نہ واں تغافل اس اپنے مہرباں کا
اور کام کر چکا یاں یہ اضطرابِ جاں کا

وہ دن گئے کہ گلشن تھا بود و باش اپنا
اب تو قفس میں بھولے نقشا بھی گلستاں کا

عشق کب تک آگ سینے میں مرے بھڑکائے گا
راکھ تو میں ہو چکا کیا خاک اب سلگائے گا

نو گرفتاری کے باعث مضطرب صیّاد ہوں
لگتے لگتے جی قفس میں بھی مرا لگ جائے گا

قیامت مجھ پہ شب اُس کا ترحّم اور تظلّم تھا
کبھی تھیں گالیاں منہ پر کبھی لب پر تبسّم تھا

کہا میں کہ بھرتا ہوں دم آپ کا
لگا کہنے صاحب کرم آپ کا

کیا جانے اُس کے جی پر کیا کچھ خیال گزرا
کچھ آپ ہی آپ اپنے دل پر ملال گزرا

ایسی ہی آہ باتیں اس بے وفا نے چھیڑیں
روتے ہی روتے جس میں روزِ وصال گزرا

کچھ تو صدا ہے آہ تہِ خاک بھی کہ جو
اودھر کو لگ رہا ہے حسن گوشِ نقشِ پا

لے صبح سے تا شام اسی نام کو جپنا
اور شام سے تا صبح غم و درد میں کھپنا

اُس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا
جیسے کوئی بھولے ہوئے پھرتا ہے کچھ اپنا

جس نے ملنے میں تمہارے دو جہاں چھوڑ دیا
تم نے ملنا بھی اب اس دل سے بتاں چھوڑ دیا

چھوڑ دے کوئی کسی کے لیے جس طرح سے کچھ
ہم نے منت میں تری کون و مکاں چھوڑ دیا

اتنی جاگہ نہ ملے اور کہیں مجھ کو کیا
تیری خاطر سے میں آتا ہوں نہیں مجھ کو کیا

میں ہوں آئینہ تو اپنا ہے تماشائی آپ
تیری آنکھیں جو مجھے دیکھ رہیں مجھ کو کیا

گو اب رہا تو کیا ہے پر اک روز جائے گا
مجھ پر قیامت ایک نہ اک دن تو لائے گا

کرتے تو قتل مجھ کو کیا ہے پر اب حسن
کیا کیا نہ اپنے جی سے دو باتیں بنائے گا

وہ ملکِ دل کہ اپنا آباد تھا کبھو کا
سو ہو گیا ہے تجھ بن اب وہ مقام ہو کا

جز اشکِ بلبل اب نہیں گل شاخسار پر
کیا اوس پڑ گئی ہے چمن میں بہار پر

وصل بھی ہوگا حسن تو ٹک تو استقلال کر
حال اپنا ہم سے کہہ کہ ہم کو مت بے حال کر

ای گرد باد طرفِ چمن ٹک گزار کر
بلبل کے پر پڑے ہیں گلوں کے نثار کر

بے چیز تو نہیں یہ حسن اُس گلی میں وز
جا جا کے بات کرنی ہر اک سے پکار کر

جس طرح ہو کوئی حیراں رُوئے حیراں دیکھ کر
دل پریشاں ہو گیا زلفِ پریشاں دیکھ کر

دامنِ صحرا سے اُٹھنے کو حسن کا جی نہیں
پانو دیوانے نے پھیلائے بیاباں دیکھ کر

نہ رہا گل نہ خار ہی آخر
اک رہا حسن یار ہی آخر

اب جو چھوٹے بھی ہم قفس سے تو کیا
ہو چکی واں بہار ہی آخر

اُس شوخ نے پھینکا ہی مگر تیر ہوا پر
جاتا ہی جو دل کا مرے نخچیر ہوا پر

ٹک کیجو حذر نالۂ جاں سوز سے میرے
ہی برق کے مانند یہ شمشیر ہوا پر

آباد شہرِ دل تھا اُسی شہر یار تک
اب کوئی آ پھرے نہ اِس اُجڑے دیار تک

قسمت نے دور ایسا ہی پھینکا ہمیں کہ ہم
پھر جیتے جی پہنچ نہ سکے اپنے یار تک

دیکھا جو واں نہ تجھ کو گماں سو طرف گیا
آئے نہ ہوتے کاشکے ہم کوئے یار تک

آن کر غم کدۂ دہر میں جو بیٹھے ہم
شمع ساں اپنے تئیں آپ ہی رو بیٹھے ہم

آرزو دل کی بر آئی نہ حسن وصل میں اور
لذّتِ ہجر کو بھی مفت میں کھو بیٹھے ہم

صیّاد کی مرضی ہی کہ اب گل کی ہوس میں
نالے نہ کریں مرغِ گرفتارِ قفس میں

اِس ملنے سے ہو دل کو بھلا کیوں کے تسلّی
اک بار کہیں چھپ کے ملیں لاکھ برس میں

دم رُکتا ہوا آتا ہی لب تک ترے غم سے
عقدے پڑے ہیں بس کہ مرے تارِ نفس میں

اشکوں سے حسن کیوں کے نہ ہو رازِ دل افشا
پانی کے چھڑکنے ہی سے بو ہوتی ہی خس میں

اُس کی جب بزم سے ہم ہو کے بہ تنگ آتے ہیں
اپنے ساتھ آپ ہی کرتے ہوئے جنگ آتے ہیں

حسن میں جب تئیں گرمی نہ ہو جی دیوے کون
شمع تصویر کے کب گرد پتنگ آتے ہیں

اپنے دل سے تو کبھی ہم ترا شکوہ نہ کریں
ہوں گر آزردہ بھی ایسے ہی تو بولا نہ کریں

روز و شب ہم کو اسی فکر میں گزرے ہی کہ ہم
عشق میں اُس کے حسن کیا کریں اور کیا نہ کریں

تمرے بن باغ میں جب وقت غنچے گُل کے کھلتے ہیں
خراشِ ناخنِ غم سے جگر کے زخم چھلتے ہیں
نہ لپیٹا اِس طرح منہ پر زلف کو بکھرا کے ای ظالم
ذرا اُٹھ بیٹھ تو اِس دم کہ دونوں وقت ملتے ہیں

سماں تھا کل عجب ہونے سے تیرے شوخ محفل میں
کہ سو سو آرزوئیں مضطرب پھرتی تھیں ہر دل میں

ہی سزا دل کی جو زلفوں کے گیا پہرے میں
شب کو کیوں نکلا اکیلا جو پھنسا پہرے میں

مردمِ چشم نے پلکوں کی چڑھا سنگینیں
ایک عالم کو نظر بند کیا پہرے میں

حسن گر پارسا ہوں میں تو ناچاری سے ہوں ورنہ
نظر ہی جام پر میری سدا اور دل ہی شیشے میں

حسن مت یاد کر اُن صحبتوں کو
سدا ایک ساں نہیں رہتی کسی کی

کمی جب جا کرے بارش تو یہ کہ دیجو دہقاں کو
کہ اپنی کشت پہ رہے جائے میری چشمِ گریاں کو

نہیں تقصیر کانٹوں کی مرا چھالا ہی پانو کا
یہ رنگ کہربا کھینچے ہی خود خارِ مغیلاں کو

رہنے نہ دے گا اُس بن یہ دل تو ایک دم بھی
کیوں روٹھ کر ہم اپنا کھودیں عبث بھرم بھی

ہزار حیف کچھ اپنی ہمیں خبر نہ ہوئی
تمام عمر گئی پر فہم یہ سر نہ ہوئی

شبِ فراق میں رو رو کے مر گئے آخر
یہ رات جیسی تھی ویسی رہی سحر نہ ہوئی

یہ سینہ بھی جائے قدم تھا کسی کا
کبھی اس طرف بھی کرم تھا کسی کا

نہ رہتی تھیں آہیں نہ تھمتے تھے آنسو
حسن تجھ کو کیا رات غم تھا کسی کا

جان و دل ہیں اداس سے میرے
اُٹھ گیا کون پاس سے میرے

کبھی کبھی جو مرے دل میں ہوش آتا ہی
تو پھر تری ہی محبت کا جوش آتا ہی

دریا میں ڈوب جائے کہ یا چاہ میں پڑے
ای عشق پر نہ کوئی تری راہ میں پڑے

آجا کہیں شتاب کہ مانندِ نقشِ پا
تکتے ہیں راہ تیری سرِ راہ میں پڑے

یوں غیر کچھ کہیں تو بلا کو بُری لگے
تو کچھ نہ کہہ کہ ہم غربا کو بُری لگے

اُس بت کی بندگی سے نہ آزاد ہو حسنؔ
یہ بات بھی کہیں نہ خدا کو بُری لگے

بے کلی مجھ کو نہیں ہر گل بدن کے واسطے
جاں بہ لب ہوں اپنے اُس غنچہ دہن کے واسطے

کچھ سنا تھا حق میں اپنے ایک دن تجھ سے سخن
سیکڑوں سنتا ہوں باتیں اُس سخن کے واسطے

بے جگہ عاشق ہوا ہے کیا کریں کچھ بس نہیں
جی تو کڑھتا ہے بہت اپنا حسنؔ کے واسطے

کہتا ہے تو کہ تجھ سے میں ہی نباہتا ہوں
تو ہی کہیں ہو سچا میں یوں ہی چاہتا ہوں

مجھ پر تو یہ ترا ستم و جور کچھ نہیں
لیکن ترے ہر ایک سے یہ طور کچھ نہیں

روٹھا کرے نہ کیوں وہ کسی اور سے حسنؔ
یہ سب بگاڑ چاہ کا ہے اور کچھ نہیں

جان میں جان تبھی قیس کے بس آتی ہے
ناقۂ لیلیٰ کی جب بانگِ جرس آتی ہے

ساتھ دیکھوں ہوں کسی کے جو کسی دلبر کو
میں بھی جی رکھتا ہوں مجھ کو بھی ہوس آتی ہے

زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائیں گے دن
فصل گل جیتوں کو پھر اگلے برس آتی ہے

جب قفس میں تھے تو تھی یادِ چمن ہم کو حسنؔ
اب چمن میں ہیں تو پھر یادِ قفس آتی ہے

غیر کو تم نہ آنکھ بھر دیکھو
کیا غضب کرتے ہو اِدھر دیکھو

دیکھنا زلف و رخ تمھیں ہر وقت
شام دیکھو نہ تم سحر دیکھو

کیا ہنسے اب کوئی اور کیا رو سکے
دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے

کہنے کی ہیں یہ باتیں کس بن نہیں گزرتی
پر ایک جان تو ہے جس بن نہیں گزرتی

کچھ ہو نہ ہو ولے ہو تیرا خیال ہر دم
اُس بن نہیں گزرتی اِس بن نہیں گزرتی

نہ ہم ہوش میں ہیں مے پرستی سے گزرے
ہوئے جب کہ بے ہوش مستی سے گزرے

نہ ٹھہرا ذرا قافلہ اس سرا میں
لیے حسرتیں یاں کی بستی سے گزرے

رہے جس میں خطرہ سدا نیستی کا
بس ای زندگی ایسی ہستی سے گزرے

آنکھوں کو اُس کی دیکھا تو مستی نظر پڑی
پھر ساتھ اُس کے بادہ پرستی نظر پڑی

سارا جہاں خراب تھا آنکھوں میں تجھ بغیر
بارے تو آج آیا تو بستی نظر پڑی

سوجھا ہمیں نشیب و فرازِ زمانہ تب
جب عشق کی بلندی و پستی نظر پڑی

وصل کا عیش کہاں پر غمِ ہجران تو ہے
لبِ خنداں تو نہیں دیدۂ گریان تو ہے

آرزو اور تو کچھ ہم کو نہیں دنیا میں
ہاں مگر ایک ترے ملنے کا ارمان تو ہے

حال کیا پوچھے ہے حیرت کدۂ دہر کا دیکھ
آئینہ یاں کا ہر ایک دیدۂ حیران تو ہے

جو چاہے آپ کو تو اُسے کیا نہ چاہیے
انصاف کر تو چاہیے یہ یا نہ چاہیے

مجھ سے نے تجھ کو چاہا تو چاہا عجب نہیں
تجھ سا جو مجھ کو چاہے تو پھر کیا نہ چاہیے

نہ تو آہ و نالہ ہی نکلے ہے نہ اُٹھے ہے کل سے صدائے دل
تو خبر تو سینے میں لے حسن کہیں چل بسا ہو نہ ہائے دل

چند اشعار بہ طورِ قدمائے ایہام بنداں گفتہ شد

سجن جل جاؤں گا میں رشک سے مت دیکھ آئینہ
دکھاتے غیر کو منہ عار سی تجھ کو بھی آئی نہ

مژگاں سے جھاڑتے ہیں جو اس گلی کے تنکے
رہتے ہیں ہم دوانے روزِ ازل سے تن کے

اک دم میں بھوت ہیں وہ اک دم میں ہیں فرشتہ
ہم آشنا ہوئے ہیں دو چار دن سے جن کے

کیا ڈھنگ ہوئیں اب کے دیکھیں ترے حسن کے
صحرا کو پھر یہ نکلا مجنوں کے حال بن کے

سبزے نے تیرے خط کے آنے کی دھوم ڈالی
خضری خبر اُڑی ہی تحقیق ہو کے آخر

غزلے گفتہ بودم کہ در سہ بحر خواندہ می شد، آتش کہ بہ خانہ افتاد سوختہ شد۔
بہ چناں چہ یک مطلع قلمی می نماید:

کہے تو غم ترے آگے کہوں ٹک ایک مری جاں
نہیں ہے تاب مرے دل میں جو رکھوں لسے پنہاں

اوّل بحرِ ہزج مفاعیلن ہشت بار، دوّم بحرِ رمل مثمن مخبون فعلاتن ہشت بار، سوم بحرِ مجتث مخبون مفاعلن فعلاتن چہار بار۔

⁂

ہر آن میں آپ کو دکھا جاتے تھے ؎ مشتاق کو تسکین دلا جاتے تھے
کیوں دیر لگی ہے کس نے روکا تم کو اب تک تو کئی بار تم آجاتے تھے

دنیا داری میں اور نہ دیں داری میں ؎ چاہت میں کسی کی ہیں نہ بیزاری میں
حیرت کدۂ دہر میں تصویر کی طرح سویا کرتے ہیں عین بیداری میں

بندِ اوّل ترکیب بند

ہر ایک بزم میں ہے اُس کا ذکر صبح و مسا ہر ایک ملک میں ہے اُس کے حسن کا شہرہ
ہر ایک چشم میں ہر دل میں ہے اُسی کی جا ہر ایک مذہب و ملت میں اُس کا ہے چرچا
ہر ایک جان کو بلبل صفت ہے اُس کی ہوا اگرچہ اور بھی گل ہیں بہت پہ نام خدا

"نہ دانم آں گلِ خنداں چہ رنگ و بو دارد
کہ مرغِ ہر چمنے گفتگوے او دارد"

مقطعِ دیگر از غزل فقیر را بسیار خوش آمدہ بود، قلمی می نماید:

پہنچے نہ حسن منزلِ مقصود کو ہم اور آخر ہوئے سب زیست کے ایام سفر میں

حرف (خ)

متقدّمین

(۱۰۲) **خسرو**: ایں بیت اوّل بہ طریق تیمناً و تبرکاً از کلام معجز نظامِ حضرت امیر خسرو ترقیم می نماید و احوال آں بزرگوار مشہور و معروف ست:

زحالِ مسکیں مکن تغافل، درائے نیناں بنائے بتیاں
چو تاب ہجراں نہ دارم ای جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

(۱۰۳) **خوشنود**: خوشنود تخلص مردِ دکنی بود۔ احوالش معلوم نیست۔

اوراست :

ن سب رین جاگی سیج پر تو بھی سجن آیا نہیں
چھپ چھپ کے دیکھی باٹ میں درشن کو دکھلایا نہیں

(۱۰۴) **خاکی** : خاکی تخلص مردے بود درویش، از شاہ جہاں آباد، در عہد جہاں گیر بادشاہ، احوالش معلوم نیست، از یک مرد پیرے ایں شعرش بہ گوش خورد ازوست :

ٹھانی ہے اپنے من میں اب تو یہی سریجن — تجھ ہیم کی گلی میں خاکی کو خاک ہونا

متوسّطین

(۱۰۵) **خاکسار** : غنچۂ باغِ مکرمت و وقار، محمّد یار، المتخلّص بہ خاکسار۔ مردے بود خادمِ درگاہ قدم شریفِ رسول خدا صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم، آنچہ میر تقی در تذکرۂ خود نوشتہ است کہ خود را بسیار دور می کشد۔ غالب کہ ایں حرف راست نہ باشد، و بر تقدیر اگر دور کشید بہ نزدیک ایں فقیر بجاست۔ شخصے کہ خادمِ چنیں مکان مقدّس باشد اگر دماغ بر فلک رساند رواست، دیگر دلیل بر بطلانِ ایں ہا ایں کہ اگر ہم چنیں می بود خاکسار تخلص نہ می نمود مگر در فراج متانتے خواہد بود۔ مدّتے شد کہ جاں بہ جاں آفریں سپرد۔ خدا یش بیامرزد۔

م تیری زلفِ سیہ سے اے پیارے — مجھ کو اک سر ہزار سودا ہی
م خاکسار اس کی تو آنکھوں کے کہے مت لگیو — مجھ کو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

میر تقی می گوید کہ اگر بہ جائے " بیمار کیا" " گرفتار کیا" می شد بہتر می بود، لیکن، در عقلِ فقیر چنیں می گزرد کہ اگر چشمِ خود می بود گرفتار مناسب بود، چوں ایں جا چشمِ معشوق ست، بیماری صحت دارد :

نم تیغِ قاتل سے رہے محروم بے تقصیر ہم روزِ محشر کو اٹھیں گے گور سے دل گیر ہم

نم کیا ہی اس خاکسار کی تقصیر یہ مگر تم کو پیار کرتا ہی

نم کیا ہی حاصل تجھے ناصح مرے سمجھانے میں آہ جوں شمع ہی راحت مجھے جل جانے میں

نم قیامت بھی ہوگی تو میری بلا سے مجھے داد خواہی کی طاقت کہاں ہی

نم رونے سے خاکسار کے سوتا نہیں ہی کوئی اس خانماں خراب کو چپکا خدا کرے

نم عشوہ و ناز کو ترے پیارے یہ ترا خاکسار جانے ہی

نم شانہ آہستہ کیجیو حجّام تار اِس زلف کا رگِ جاں ہی

(۱۰۶) **خالہ بیگم** : بدر النسا بیگم، دخترِ نواب قمر الدین خاں، وزیر ہندوستاں۔ چوں خالۂ نواب عماد الملک بود، مشہور بہ خالہ بیگم گردید۔ با مادرِ نواب غالب جنگ، احمد خاں، مرحوم در فرخ آباد بہ سر می برد۔ ہماں جا بہ جوارِ رحمتِ ایزدی پیوست۔

ایں شعر بنامِ او شنیدہ شد:

کہا تھا ساربان کے کان میں لیلیٰ نے آہستہ کہ مجنوں کی خرابی کا کہیں مذکور مت کیجو

متاخّرین

(۱۰۷) **خوش دل** : از جملۂ متاخّرین گھاسی رام خوش دل تخلّص می نماید۔ از شاہ جہاں آباد ست۔ در فیض آباد بہ کارِ صرّافی مشغول ست طبعش موزون ست، از قافیہ و ردیف واقف نیست:

تو جو چاہے کہ رہے حسن یہ مغرور سدا
یہ غلط ہی نہیں نبھنے کا یہ دستور سدا

تارِ طنبور و نے و بین و صدائے مطرب
ہر زباں میں ہی صنم تیرا ہی مذکور سدا

حرف (د)

متوسّطین

(۱۰۸) **داؤد** : دریں سلک از متقدّمیں کسے گزشتہ باشد بہ نظرِ فقیر نہ رسید، مگر از متوسّطیں مرزا داؤد بیگ، داؤد تخلص در عہدِ فردوس آرام گاہ بود۔ ازوست :

ن زلفِ دل بر سے مجھ کو سودا ہی
خلق کہتی ہی تجھ کو سودا ہی ن

(۱۰۹) **دل** : شاہ فتح محمّد، المتخلّص بہ دل، متوطّنِ اکبرآباد ست، از نبیرۂ محمّد غوث گوالیاری۔ ہم عصرِ میاں آبرو، تلاشِ لفظِ تازہ بر وضع قدیم دارد۔ در کمالِ تجرید بہ وسیلۂ طبابت در فیض آباد بہ سر می برد۔ سلامت باشد :

کیا نکیلی تیز تر دیکھی ہیں مژگاں یار کی
ہم نے سوئیاں بھی نہیں دیکھیں کبھی اس سار کی

(۱۱۰) **دانا** : با بیگانہ و با آشنا آشنا، میاں فضل علی، المتخلّص بہ دانا۔ جوانِ محمّد شاہی، سیہ فام، ریش بلند از قومِ افغاں بود، با ہمہ معاصرینِ خود خوش طبعی داشت۔ بہ آں خوب صورتی اکثر لباسِ سیاہ می پوشید، یاراں بر وضع او خندہ می کردند، وخود ہم تبسّم می فرمود، غرض مردِ زندہ دل بود از مدّتے بہ طرفِ بنگالہ رفت، خبرش نیست۔ ازوست :

نہم بہ ہر صورت خدا کو دیکھنا عنواں ہی میرا
یہی توحید میں مصرع سرِ دیواں ہی میرا

ص تجھ انتظار میں پیارے مثالِ آئینہ
تمام عمر پلک سے مری لگی نہ پلک

ن دل میں ہر ایک کے سودا ہی خریداری کا
یوسفِ مصر مگر تو ہی ہی اک یار عزیز

(۱۱۱) **دردمند** : محمّد فقیہ، المتخلّص بہ دردمند، جوانِ محمّد شاہی بود،

نظر کردۂ مرزا مظہر جانِ جاناں۔ سوائے ہمیں ساقی نامہ دیگر اشعارش بہ نظر نہ رسیدہ۔ مدتے ست کہ بہ طرفِ بنگالہ رفتہ است۔ غرض بسیار بانمک گفتہ و گوہرِ معانی سفتہ۔ من ساقی نامہ:

ن ارے ساقی ای جانِ فصلِ بہار — یہی تھا ہمارا اور تیرا قرار
ستم سے گزر کچھ تو انصاف کر — خدا سیتی ڈر کچھ تو انصاف کر
تأمل سے ٹک دیکھ گل کا شکوہ — کہ لب ریز ہی باغ تا دشت و کوہ
اِس آتش میں میرا نہ کر دل کباب — نہ کر میری طاقت کے زہرے کو آب
کہ میں جاں بہ لب ہوں پیالے کی طرح — لگی ہی مجھے آگ لالے کی طرح

در قسمیہ می گوید:

ن تجھے وعدہ کر بھول جانے کی سوں — تجھے اپنے سوگند کھانے کی سوں
شبِ عید کے تجھ کو جاؤں کی سوں — تجھے اپنے مہندی کے پاؤں کی سوں

در تعریفِ اہلِ چمن:

نظر تو کرو ٹک چمن کی طرف — شگوفے کو مستی سے آئے ہیں کف
ہوا کے نشے نے کیا بس کہ زور — پڑا آب مستی سے کرتا ہی شور

در اشتیاق گوید:

ارے ظالمو مفت ہی یہ بہار — کہاں یہ نشہ پھر کہاں یہ خمار
نپٹ نقش بر آب ہی یہ جہاں — ٹک اک موج میں ہم کہاں تم کہاں
ن نہ یہ مے نہ یہ باغ رہ جائے گا — نہ ملنے کا اک داغ رہ جائے گا ن

حکایت بر سبیلِ تمثیل:

لگن میں پڑا ایک پروانہ رات — یہ کہتا تھا اربابِ مجلس کے ساتھ
کہ اِس بے پر و بال کی عرض ہی — کہ ابلاغ اِس کا تمھیں فرض ہی

مرا شمع سے یہ سندیسا کہو — اُسے خوب سمجھا کے اتنا کہو
یہی تھا لکھا میری قسمت کا جان — قیامت تلک ہجر وصل ایک آن۔
جو تجھ کو مرا خوش یہ آیا ہے حال — تو مجھ کو شکایت کی کب ہے مجال
سراپا مرا گرچہ آتش میں ہے — سعادت مری تیری خواہش میں ہے
وہی کر تو، جس میں ترا کام ہو — ولیکن نہ اتنا کہ بدنام ہو
یہ کہہ کر کیا کام اپنا تمام — ہوا زندگانی کا روز اُس کی شام
جو کوئی عشق میں اِس ادب سے مرے — خدا تا ابد اُس پہ رحمت کرے

۴ قفس تک بھی نہ پہنچے اور پڑے دُور آشیانے سے
عجب ساعت میں بچھڑے تھے چمن کے آستانے سے

(۱۱۲) درد : بوستانِ حلاوت و گلستانِ طراوت۔ در زمرۂ دردمنداں فرد، کرم اللہ خاں، درد۔ ہمشیرہ زادہ نوّاب عمدۃ الملک، جوان محمد شاہی بودہ، طوطی طبعش نکتہ پرواز، و بلبل فکرش با عندلیب ہم آواز۔ طرزش عاشقانہ و سخنش دردمندانہ۔ وقتے کہ در شاہجہان آباد ہنگامۂ مرہٹہ برپا گردید، چند کافراں برائے غارت بر ناموسِ سید علی اصغر کبریٰ ریختند۔ ایں جوانِ خدا پرست للہ برائے ناموس میر مذکور از دستِ مقہوراں شہید شد۔ خدا اش بیامرزد۔ از وست:

آتشِ عشق سے رشتہ ہے مری جان کے بیچ — شمع ساں جل کے اٹھوں گا ابھی اک آن کے بیچ
۴ سامنے ہوتے ہی پھر نعش نہ پائی دل کی — بٹ گیا نوکِ سناں پر صفِ مژگان کے بیچ
۱ اگر وہ بت کسی صورت سے میرا رام ہو جائے — تو پوجوں اِس عقیدت سے کہ کفر اسلام ہو جائے
۲ ہر اک دم سانس ہو کر پھانس مجھ دل میں کھٹکتی ہے — اگر جی کی خلش نکلے تو کیا آرام ہو جائے
تری ترچھی نگاہوں نے رکھا ہے نیم بسمل کر — اگر بھر کر نظر دیکھے تو میرا کام ہو جائے

م تحمّل آتشِ غم میں دلِ بے تاب کیا جانے | ٹھہرنا ایک دم بھی آگ پر سیماب کیا جانے
م کنارے سے کنارہ کب ملا ہے بحر کا یارو | پلک لگنے کی لذّت دیدۂ پُر آب کیا جانے

(۱۱۴) **درد** : سالکِ مسالکِ مکاشفاتِ دینی، و ناہجِ مناہجِ مجاہداتِ یقینی، از عرفائے عالی مقام و فقہائے ذوی الاحترام، بر آسمانِ سخن مانند خورشید فرد، حضرت خواجہ میر، المتخلّص بہ درد- از عالمان خوش ذات و از درویشانِ نیکو صفات، طنطنۂ فضل و کمال و دبدبۂ جاہ و جلالِ او بہ فلک رسیدہ، و طنابِ خیمۂ فکرِ عالی‌ش چوں شعاعِ مہر از مشرق تا بہ مغرب کشیدہ- در بحرِ ضمیرش ہمہ گوہرِ ناسفتہ، و بر گفتۂ او عقل آفریں ہا گفتہ- مرشد بہ وادیِ حقیقت و رہ بر بہ میدانِ شریعت، دلِ آگاہ‌ی مخزنِ اسرارِ خدائی، صفائے باطنش محرمِ کعبۂ کبریائی، خسروِ اقلیم حال و قال، جامعِ صفاتِ جلال و جمال، خلفِ حضرت خواجہ ناصر قدّس سرّہٗ- اصلش شاہ‌جہاں آباد- شاعرِ فارسی و ہندی، نے نے غلط ایں چہ لائقِ اوست، بل، شعر گفتن دونِ مرتبۂ اوست- اکثرے از دستِ عسرت پریشاں شدہ بہ طرفے رفتند لیکن آں ثابت قدم تکیہ بر توکّل نمودہ، قدم از جا نہ برداشت، تا حال در شاہ‌جہاں آباد مقیم ست- دیوانش اگرچہ مختصر ست، لیکن چوں کلامِ حافظ سراپا انتخاب- دام افضالہٗ:

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا | حقّا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا
مانندِ حباب آنکھ تو اے درد کھلی تھی | کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا
نہم اکسیر پہ مت ہوس اتنا نہ ناز کرنا | بہتر ہے کیمیا سے دل کا گداز کرنا
نہم ہم جانتے نہیں ہیں اے درد کیا ہے کعبہ | جیدھر ملے وہ ابرو ہم کو نماز کرنا
آرام سے کبھی بھی نہ اک بار سو گئے | ایسے ہمارے طالعِ بیدار سو گئے
خوابِ عدم سے چونکے تھے ہم تیرے واسطے | آخر کو جاگ جاگ کے ناچار سو گئے
بارے مجھے بتا تو سہی کیا سبب ہوا | پھر مجھ پہ مہربان ہوا تو غضب ہوا

نم عاشقِ بے دل ترا یاں تک توجی سے سیر تھا
زندگی کا جو اُسے دم تھا دمِ شمشیر تھا

نم کی تو تھی تاثیرِ آہِ آتشیں نے اُس کو بھی
جب تلک پہنچے ہی پہنچے راکھ کا یاں ڈھیر تھا

نم شیخ کعبے ہو کے پہنچا ہم کنشتِ دل میں ہو
درد منزل ایک تھی ٹک راہ ہی کا پھیر تھا

مدرسہ یا دیر یا کعبہ تھا یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا

م وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

ہو گیا مہمان سرائے کثرتِ موہوم آہ
وہ دلِ خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا

بھول جا خوش رہ عبث وہ سابقے مت یاد کر
درد یہ مذکور کیا ہے آشنا تھا یا نہ تھا

نم جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا نم

جان سے ہو گئے بدن خالی
جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا نم

نالہ فریاد آہ اور زاری
آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا نم

اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا نم

اگر یوں ہی یہ دل ستاتا رہے گا
تو اک دن مرا جی ہی جاتا رہے گا ن

میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے
مری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا ن

بھلا کوئی تم میں سے اے ہم صفیرو
خبر گل کی ہم کو سُناتا رہے گا

گلی سے تری دل کو لے تو چلا ہوں
میں پہنچوں گا جب تک یہ آتا رہے گا

خفا ہو کے اے درد مر تو چلا تو
کہاں تک غم اپنا چھپاتا رہے گا ن

مثلِ نگیں جو ہم سے ہوا کام رہ گیا
ہم روسیاہ جاتے رہے نام رہ گیا

یا رب یہ دل ہے یا کوئی مہماں سرائے ہے
غم رہ گیا کبھی کبھی آرام رہ گیا

تم نے تو ایک دن بھی نہ ادھر گزر کیا
ناچار ہو کے ہم نے ہی اودھر سفر کیا

پیکان و دل کے ساتھ ہوا جب معاوضہ
سینے سے تب خدنگ نے میرے گزر کیا

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے
ادھر تو نے لیکن نہ دیکھا نہ دیکھا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجومِ یاس جی گھبرا گیا

تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے جز جفا
پر وہ کیا کچھ تھا کہ دل کو بھا گیا

میں تو کچھ ظاہر نہ کی تھی دل کی بات
پر مری نظروں کے ڈھب سے پا گیا

کہاں کا ساقی اور مینا کدھر کا جام و مے خانہ
مثالِ زندگی بھرتے ہیں اپنا آپ پیمانہ

کسی سے کیا بیاں کیجیے اس اپنے حال ابتر کا
دل اُس کے ہاتھ دے بیٹھے جسے جانا نہ پہچانا

دل کو لے جاتی ہیں محبوبوں کی خوش اسلوبیاں
ورنہ ہیں معلوم ہم کو سب اُنھوں کی خوبیاں

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ کچھ طاعت کی خاطر کم نہ تھے کرّوبیاں

گلیمِ بختِ سیہ سایہ دار رکھتے ہیں
یہی بساط میں ہم خاکسار رکھتے ہیں

بتاں کے جبر اُٹھائے ہزار ہا لیکن
جو اس پہ بھی نہ ملیں اختیار رکھتے ہیں

ہم کس ہوس کی تجھ سے فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں نم

نہ گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار
کس بات پہ چمن ہوسِ رنگ و بو کریں

مٹ جائیں ایک دم میں کثرت نمائیاں
گر آئینے کے سامنے ہم ایک ہو کریں

تیرے سوا نہیں کوئی دونوں جہان میں
موجود ہم جو ہیں بھی تو اپنے گمان میں

ایدھر بھی اہل بزم توجّہ ضرور ہے
کچھ کچھ کہے ہے شمع بھی اپنی زبان میں

باراں بیاں کرے ہے نکاتِ تنزّلات
سطریں لکھے ہے برق تجلّی کی شان میں

نہ ملیے یار سے تو دل کو کب آرام ہوتا ہے
وگر ملیے تو مشکل ہے کہ وہ بدنام ہوتا ہے نم

یہ حسن و عشق مل سمجھیں گے آپس میں جو کچھ ہوگا
پہ ان دونوں کے الجھیڑے میں میرا کام ہوتا ہے

کیا فرق داغ و گل میں اگر گل میں بو نہ ہو
کس کام کا وہ دل ہے کہ جس دل میں تو نہ ہو م

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے یہ کہ جہاں تو سما سکے

اپنے بندوں پہ جو کچھ چاہو سو بیداد کرو
پر نہ آ جائے کبھی جی میں کہ آزاد کرو ن

اہلِ فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے
لوحِ مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے

اس ہستیِ خراب سے کیا کام تھا ہمیں
ای نشۂ ظہور یہ تیری ترنگ ہے

فرصتِ زندگی بہت کم ہے
مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے نم

درد کا حال کچھ نہ پوچھو تم
وہی رونا ہے نت وہی غم ہے ن

مراجی ہے جب تلک تری جستجو ہے
زباں جب تلک ہے یہی گفتگو ہے ن

تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا
تری آرزو ہے اگر آرزو ہے ن

درد اپنے حال سے تجھے آگاہ کیا کرے
جو سانس بھی نہ لے سکے سو آہ کیا کرے ن

فرسودگی ہے رشتۂ تسبیح کا حصول
دل میں کسی کے آہ کوئی راہ کیا کرے ن

روندے ہے نقشِ پا کی طرح خلق یاں مجھے
ای عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے نم

نہ وہ نالوں کی شورش ہے نہ وہ آہوں کی ہے دھونی
ہوا کیا درد کو پیارے گلی کیوں آج ہے سونی

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن
میں نے پوچھا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا

شب گزری و آفتاب نکلا
تو گھر سے بھلا شتاب نکلا

ایدھر کو جو مسکرا کے دیکھا
کچھ تو جی کا حجاب نکلا

پھولائے نہ تھے کہ کھو گئے ہم
تھے آپ ہی ایک سو گئے ہم

جوں آئینہ جس پہ یاں نظر کی
ساتھ اپنے دوچار ہو گئے ہم

یہی پیغام درد کا کہنا ق
گر کوئی کوے یار میں گزرے

کون سی رات آن ملیے گا
دن بہت انتظار میں گزرے

کبھو خوش بھی کیا ہے دل کسی رندِ شرابی کا
بھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور گلابی کا ن

میں اپنا دردِ دل چاہا کہوں جس پاس عالم میں
بیاں کرنے لگا قصہ وہ اپنی ہی خرابی کا

یارو مرا شکوہ ہی بھلا کیجیے اُس سے
مذکور کسی طرح سے جا کیجیے اُس سے

جوں جوں وہ کُڑھے ہی تو یہی آئے ہے جی میں | پھر چھیڑیے اور باتیں سنا کیجیے اُس سے
کہتے نہ تھے ہم درد میاں چھوڑیہ باتیں | پائی نہ سزا اور وفا کیجیے اُس سے
تہمتِ چند اپنے ذمّے دھر چلے | جس لیے آئے تھے سو ہم کر چلے

بندِ مخمّس از غزل کلیم

کئی قیمت میں اُس کے پاس نقدِ دین کو لائیے | کئی دنیا دکھاتے ہیں کہ سودا یوہیں بن جائے
مجھے یہ سوچ ہی وہ خود فروش ایدھر اگر آئے | بہ راہے او چہ دربازیم نہ لیتے نہ دُنیائے

دلے داریم واندوہے سرے داریم وسودائے

اے درد یہ درد جی سے کھونا معلوم | جوں لالہ جگر سے داغ دھونا معلوم
گلزارِ جہاں ہزار پھولے لیکن | میرے جی کا شگفتہ ہونا معلوم
اے درد یہ کون صبر کو لوٹ گیا | یوں ضبط جو تجھ سے یک بہ یک چھوٹ گیا
کیا ایسی مصیبت پڑی تجھ پر ظالم | کہ تو سہی جی ڈھا کہ دل ٹوٹ گیا
اے درد بہت کیا پہ کیکھا ہم نے | دیکھا تو عجب یہاں کا لیکھا ہم نے
بینائی نہ تھی تو دیکھتے تھے سب کچھ | جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ دیکھا ہم نے
پیری چلی اور گئی جوانی اپنی | اے درد کہاں ہی زندگانی اپنی
کل اور کوئی بیان کرے گا اس کو | کہتے ہیں ہم آپ اب کہانی اپنی
ہر بُت کے لیے کب تئیں مرتے رہیے | کب تک یہ کفر دل میں بھرتے رہیے
اے درد جو کچھ کہ زندگی باقی ہی | اللہ کو اپنے یاد کرتے رہیے

(۱۱۴) **دیوانہ**: رائے سرب سکھ، المتخلّص بہ دیوانہ، شاعرِ زبردست فارسی ست۔ شعر بسیار گفتہ است۔ استادِ ریختہ گویانِ لکھنؤ۔ چناں چہ میاں حسرت و میر حیدر علی حیراں واکثر دیگراں شاگردِ اویند۔ درآں جا مشہور و معروف ست۔ در اوائلِ مشقِ فکرِ ریختہ ہم می کرد۔ عجب شخصے ست۔ خدا سلامتش دارد۔ ازوست:

دل ہی کہ تیری تیغ کے آگے سے ٹل نہ جائے
رستم کا کیا جگر ہی کہ زہرہ پگھل نہ جائے

وہ لوگ کہاں کہ یار باشی کیجے
وہ وقت کہاں کہ خوش معاشی کیجے
اک گوشے میں بیٹھ کر دیوانہ تنہا
اب ناخنِ غم سے دل خراشی کیجے

متاخّرین

(۱۱۵) **دل** : محمد عابد، جوانے ست مربوط گو وقابل، المتخلّص بہ دل، در سلکِ متاخّریں از حروف الدّال، ساکن عظیم آباد۔ برادر میاں روشن علی جوشش تخلّص۔ از خوبانِ آں دیار ست۔ سلامت باشد۔ از وست :

وہ کافر ہماری شبِ تار ہی
جسے صبح کا دیکھنا عار ہی

تمھارے در پہ جو درباں نے آستیں پکڑی
برنگِ نقشِ قدم ہم نے بھی زمیں پکڑی

(۱۱۶) **درخشاں** : میرزا منگو بیگ، المتخلّص بہ درخشاں، سیاہ فام چیچک رو مردِ شوقین بود۔ مرثیہ و غزل و مثنوی ہمہ می گفت۔ بسیار سادہ وضع بود۔ مدّتے آزار کشید، از چندے رحلت کرد۔ خدایش بیامرزد :

یاراں وداعِ عمر کو ہجراں کی رات ہی
مانندِ شمع میری سحر کو وفات ہی

تھی درائے ناقۂ لیلیٰ کی ہردم یہ صدا
آہ مجنوں پاشکستہ رہ گیا منزل سے دور

حرف (ذ)

(۱۱۷) **ذاکر** : شنیدہ ام، لیکن اشعارش یاد نیست۔

✣

حرفِ (ر)

متوسّطین

(۱۱۸) **رنگیں** : از متقدّمیں کسے بہ نظر نیامدہ۔ رنگیں تخلص مرزا امان بیگ مردے ست سپاہی پیشہ، خوش اوقات و نیک ذات، جوانِ محمد شاہی، خط نستعلیق خوب می نویسد۔ از ملازمانِ نوّاب افتخار الدّولہ مرزا علی خاں بہادر ست، از یارانِ میاں غریب، وضعِ قدیم دارد۔ ایہام بندست، خدایش سلامت دارد۔ ازوست:

رات کی بات نہیں کہنے کا تیری پیارے | گو چلیں آج مرے سر پہ ہزاروں آرے
ایک مو زلف کا رنگیں کو نشانی بھیجا | بعد مدّت کے کیا یاد صنم نے بارے

(۱۱۹) **رسوا** : آفتاب رائے، رسوا تخلص از سلکِ متوسطیں، ہندو پسرے بود در توپ خانہ نوکری داشت، از چندے ترک روزگار نمودہ، بر یک پسرِ کمبوہ، منّو نام تعشق پیدا کردہ بود، زبانش بہ لفظ میاں بسیار آشنا بود، باہر کہ سخن می گفت میاں می گفت و می گریست۔ کلامش خالی از درد نیست۔ عریاں می گشت، آخر بہ ہماں حالت مُرد۔ ازوست:

رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے | ایسی نگاہِ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے
قفس سے وہ دن گئے اور چمن میں جا نے نہیں | اڑیں تو اُڑ نہیں سکتے چلیں تو پا ئے نہیں

وصل میں بے خود رہے اور ہجر میں بے تاب ہو
اس دوانے دل کو **رسوا** کس طرح سمجھائیے

وہ کون سی زمیں ہے جو اشکوں سے نم نہیں | **رسوا** بھی اِس زمانے میں مجنوں سے کم نہیں

نقل ست کہ روزے معشوقِ او رسن در گردنش انداختہ می گشت، ناگاہ شخصے دیگر بہ نظرش رسید، او را ہم از نازِ محبوبانہ دراں گرفتاری شامل گردانید، دراں وقت رسوا چہ مناسبِ حال ایں شعر برخواند:

دیگرے را در گرفتاری شریکِ ما مکن
مدّعا گر شہرتِ حسن ست یک رسوا بس ست

(۱۲۰) **رند**: میر حمزہ علی، المتخلص بہ رند اصلش از شاہ جہاں آباد است جوانِ محمد شاہی ست۔ از چندے بہ طرفِ بنگالہ رفت، الحال اکثر از زبانِ یاران معلوم شد کہ در مرشد آباد ترک لباس نمود۔ خدایش سلامت دارد۔ از وست:

سینے سے داغِ عشق مٹایا نہ جائے گا
ہم سے تو یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

نہیں پیکاں پہ جوہر نامہ اُن نے تیر پر لکھا
اشارہ قتل کا مجھ کو یہ کس تقصیر پر لکھا

بچے جی کس طرح روزِ ازل کاتب نے قدرت کے
ہمارا خون قاتل کے دمِ شمشیر پر لکھا

خدا جانے کہ اس کو رند پڑھ پڑھ کیا وہ سمجھے گا
ہمیں تھا خط کا لکھنا دور از تدبیر پر لکھا

(۱۲۱) **راقم**: بندرابن راقم، تخلص ہندو از قوم کھتری، بسیار پست قد و بلند فکر ست۔ از شاگردانِ مرزا محمد رفیع، سودا سلمہ اللہ، در تضمین نمودنِ مخمس دست بہم رسانیدہ، بسیار بہ خوبی می گوید۔ معلوم نیست کہ کجاست:

یاں تک قبولِ خاطر کیجے تری جفا کو
تا سب کہیں کہ **راقم** رحمت تری وفا کو

پہنچا نہ آہ درد کو میرے کوئی طبیب
یا رب عجب طرح کا کچھ آزار ہے مجھے

سنتے ہیں ہم کہ ہوتی ہے جگ میں دوام صبح
ہو گی کبھی ای چرخ ہماری بھی شام صبح

ای باغباں نہیں ترے گلشن سے کچھ غرض
ق
ہم کو قسم جو توڑیں ترے برگ و بر کہیں

اتنا ہی چاہتے ہیں کہ ہم اور عندلیب
آپس میں دردِ دل کہیں ٹک بیٹھ کر کہیں

دیکھا میں رات جا کر احوالِ چشمِ **راقم**
برسات کی اندھیری پتلی کی تھی سیاہی

کہے گیا دردِ دل بلبل گلوں سے — اڑا دیتے ہیں اُس کی بات ہنس کر
کام عاشقوں کا کچھ تجھے منظور ہی نہیں — کہنے کو ہے یہ بات کہ مقدور ہی نہیں

اغلب کہ ایں شعر بے اصلاح باشد، چراکہ از افتادنِ عین ناموزوں می شود، و دریں جا عین می افتد عین خطا است، در دانستِ فقیر چناں بہتر می شود:

"میرا تو کام کچھ تجھے منظور ہی نہیں"

متاخرّین

(۱۲۲) **رنگیں**: لالا بلاس رائے المتخلص بہ رنگیں، خلفِ راجامان رائے دیوانِ مدار المہام پسرِ محمد علی رہیلہ است۔ طبعِ موزونے دارد۔ ہر جاکہ باشد سلامت باشد۔ ازوست:

اس مصیبت سے جو تو گھر سے نکالے ہے مجھے — یہ تو بتلا میں بھلا جاؤں کدھر آخرِ شب

(۱۲۳) **روشن**: خواجہ صاحب خواجہ حسین علی، سلمہ اللہ، المتخلص بہ روشن، طبع موزونے دارد، اصلش از شاہ جہاں آباد ست، جوانے ست بہ کمالِ انسانیت و حسنِ خلق۔ چندے بہ طرفِ سلطان پور نیز بہ سر بردہ، الحال، در سرکار نوّاب فلک جناب، آصف الدّولہ بہادر بہ خدماتِ قریبہ سرفراز ست۔ خدایش سلامت دارد۔ ازوست:

رسمنا اٹھ خمار میں آیا — کیا ہی کافر بہار میں آیا
جی میں یہ تھا کہ جان کیجے نثار — ایک دم بھی وہ بے وفا نہ رہا
یہ تکلّف سے آپ کہتے ہیں — دیکھو روشن چلا گیا نہ رہا

شکوۂ ظلم سبھی دل سے اُٹھائے روشن
جب کہا اُس نے کہ میں یار ہوں کن کا ان کا

(۱۲۴) **رضا** : آشنائے باصفا، میرزا علی رضا، المتخلّص بہ رضا، از یارانِ لالا سرب سکھ۔ اکثر مثنوی ہا گفتہ است حسبِ حالِ خود۔ بر شخصے وہب علی نام عاشق ست، احوالِ عاشقیِ خود و معشوقیِ او بسیار بہ خوبی در مثنوی بیاں نمودہ۔ خدائیش سلامت دارد۔ از وست:

دنیا میں کوئی تجھ سا ستم گار نہیں ہے
بے رحم و جفا پیشہ و خوں خوار نہیں ہے

سب خلق ہوئی دشمنِ جاں عشق میں تیرے
افسوس کہ تس پر تو مرا یار نہیں ہے

تم کہتے رضا تو نظر آتا ہے سبب کیا
سچ بول کہیں دل تو گرفتار نہیں ہے

(۱۲۵) **رند** : مہرباں خاں، خانِ بلند مکاں، شفیقِ مسافراں، المتخلّص بہ رند۔ در سرکارِ نوّاب غالب جنگ بہادر بہ فرخ آباد بہ خدمتِ دیوانی ممتاز بود۔ بہ کمالِ نیک نامی اوقات بہ سر بردہ۔ مجلسے رنگیں و بزمے ارم تزئیں داشت۔ ہر صادرے و واردے را بہ قدرِ استعدادِ خود و حوصلۂ او می نواخت۔ بہ اہلِ سخن ہمیشہ سرگرمِ سخن و با صاحبِ ہر فن چوں روح در تن، محسّن بہ حسنِ اخلاق، در فنِ موسیقی و شاعریِ ہندی کہ عبارت از کبت ہا باشد، طاق۔ امارتِ ظاہری ہم بہ مرتبۂ رسیدہ کہ با امرایانِ سابق و حال انیس و جلیس گردیدہ، از شاگردانِ میر سوز و میرزا رفیع مشہور ست، در تصانیفِ نغمیّہ ہم دستے پیدا کردہ، چناں چہ اکثر اہلِ غنا دلِ عشّاق را بہ نغمۂ دل آویزِ او می برند و بسیارے کلامش را چوں کلامِ سودا و میر سوز سرلوحِ دیوانِ خود می انگارند۔ در علمِ تیر اندازی اصلاح از میر سوز گرفتہ۔ از ہمہ تیر اندازانِ آں دیار گوئے سبقت ربودہ، امورِ دیگر نیز مثلِ شمشیر شناسی و ادب شناسی و قدردانیِ انساں از صحبتِ میر مسطور حاصل نمودہ، غرض کہ از مغتنماتِ روزگار ست۔ سلامت باشد۔ از وست:

خلقت تمام گردشِ افلاک سے بنی
ماٹی ہزار رنگ کی اِس چاک سے بنی

مجھ ساتھ تیری دوستی جب ہو گئی آخر — دنیا کی مرے دل سے طلب ہو گئی آخر
حاصل تو ہوا وصل ہمیں رات پر افسوس — اک پل میں شبِ عیش و طرب ہو گئی آخر

حرف (ز)

متوسّطین

(۱۲۶) **زار**: مغل بیگ، زار تخلّص، جوانے ست از سلکِ متوسّطین۔ معلوم نیست کہ کجاست - از یارانِ میر تقی، میر ست۔ سلامت باشد۔ از وست:

مشہور تھے جو نالے میرے گلی میں اُس کی — کوئی اور بھی جو رویا سمجھا کہ زار ہو گا

متاخّرین

(۱۲۷) **زار**: دیگر، میر مظہر علی، زار تخلّص از متاخّرین ست۔ نقاوۂ دودمانِ سیادت، و نوبادۂ بوستانِ شرافت، پاکیزہ سرشت و نیک شعار ست۔ جوانے بہ علم و عمل آراستہ، و بہ صلاح و تقویٰ پیراستہ۔ کلامش عاشقانہ، و فکرش دردمندانہ۔ استفادۂ سخن از شاہ حفیظ اللہ صاحب، دام افضالہٗ، کہ در دیارِ لکھنؤ عالم و فاضل و مثنوی داں مشہور اند، حاصل نمودہ۔ اصلش از شاہ جہاں آباد است۔ فی الحال در فیض آباد در رفاقت نوّاب مرزا علی خاں بہادر بہ سر می برد، گاہ گاہے فکر می نماید، لیکن بسیار بہ طرز می گوید۔ خدایش سلامت دارد:

چھوٹ جائیں غم سے ہر دم کے جو نکلے دم کہیں — خاک ہے یہ زندگی جو تم کہیں اور ہم کہیں
ایک دن آگے ہی دنیا سے اُٹھانا ہم کو — شبِ فرقت تو الٰہی نہ دکھانا ہم کو
تیری ہی قسم تجھ بن گر کچھ بھی خوش آتا ہو — کافر ہو اگر اس میں کوئی بات بناتا ہو

دل کو اس کوچے میں کھو بیٹھے ہیں ہم
اس لیے مغموم ہو بیٹھے ہیں ہم

سر رہو یا جاؤ اب در پر ترے
جو کچھ ہونی ہو سو ہو بیٹھے ہیں ہم

نیند تیرے ہوتے آئے، ہے محال
یار تو جاہے، تو سو بیٹھے ہیں ہم

اپنے تئیں اس بزم سے کیا کام ہے
جب تلک تم بیٹھے ہو بیٹھے ہیں ہم

جس طرح فرما گئے تھے یار تم
اُس طرح سے دیکھ لو بیٹھے ہیں ہم

کرنی جو کبھی مجھ سے گفتار سو یہ تحفہ
سب تیرے لیے دشمن تو یار سو یہ تحفہ

گزرے ہے تڑپتے یاں بھادیں ہی نہیں اُس کی
دل کی تو یہ حالت ہے دلدار سو یہ تحفہ

کہتا تھا کل آؤں گا سو آج تلک آتا ہے
مدت میں کیا اُس نے اقرار سو یہ تحفہ

اب زارؔ یہاں بھی تو جھٹ خار نہ کچھ دیکھا
صحرا ہی کو روتے تھے گلزار سو یہ تحفہ

لگا کہنے کہ کہہ احوالِ فرقت مختصر کر کے
دکھایا آنسوؤں سے خون کے میں دامان کو بھر کے

ہمیں تو فرش سے اور تکیۂ مخمل سے بہتر ہے
گلی میں اس کی پڑ رہنا سرہانے ہاتھ کو دھر کے

کیا ہوئی ہے ای زارؔ کہ تو خانہ نشیں ہے
اور اس کو تو جوں برق کہیں چین نہیں ہے

کیا تجھ کو خوش آیا ہے یہ ای چرخ ستمگار
عاشق کہیں بے تاب ہے معشوق کہیں ہے

کیا تجھ پہ زارؔ ایسا کہ درد دکھ کٹھن ہے
جو تو ہے اور رونا اور یہ اجاڑ بن ہے

لے جاؤ گے تم اُس کی گلی سے جہاں مجھے
آرام جو یہاں ہے نہ ہوگا وہاں مجھے

فصلِ بہار تجھ کو مبارک ہو عندلیب
بن یار ایک سی ہے بہار و خزاں مجھے

رہتی نہیں ہے ذکر کیے بن تو یار کا
رسوا کرے گی زارؔ یہ تیری زباں مجھے

⁂

حرف (س)

متقدّمین

(۱۲۸) **سراج** : سراج تخلّص از مردم اورنگ آباد، در وقتِ عالمگیر اوّل بود، از شاگردانِ سیّد حمزہ علی دکنی۔ روشن طبع معلوم می شود۔ خدا ایش بیامرزد۔ از وست:

اُس بِن مجھ آنسوؤں کے شراروں کی کیا کمی ، جس رات چاند نہیں ہے ستاروں کی کیا کمی

نہیں ہے تاب مجھے تیرے سامنا جانا کہاں سراج کہاں آفتابِ عالم تاب

شعلہ خو جب سے نظر آتا نہیں لوٹتا ہے تب سے انگاروں پہ دل

مدّت سے گم ہوا دلِ بیگانہ اے سراج شاید کہ جا لگا ہے کسی آشنا کے ہاتھ

وہ ظالم مجھ کو جلتا دیکھ کر اتنا نہیں کہتا کہ گیا ثابت قدم ہے کیوں نہ ہو آخر سراج اپنا

(۱۲۹) **سالک** : سالک تخلّص، دکنی ست۔ چند اشعارِ او در تذکرۂ میر تقی دیدہ شد، چوں ربط بہ یک دیگر نہ داشتند بہ قلم نیاورد۔

(۱۳۰) **سعدی** : سعدی دکنی، بعضے ایں را سعدی شیرازی قرار دادہ اند، و بعضے سعدیِ دیگر یعنی دکنی۔ واللہ اعلم:

ہمنا تمھن کو دل دیا تم نے لیا اور دکھ دیا تم یہ کیا ہم وہ کیا ایسی بھلی یہ ریت ہے ن

دو نین کے کھپر کروں رو روا جھو اس میں بھروں پیش سگ کو یت دھروں پیا سا نہ جائے میت ہے ن

سعدی غزل انگیختہ شیر و شکر آمیختہ نسخ

در ریختہ دُر ریختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

چوں زبانِ فارسی دریں شامل ست اغلب کہ سعدی شیرازی ست۔

متوطّنین

(۱۳۱) **ساماں** : میر ناصر، با وجود بے سر و سامانی ساماں تخلّص داشت، متوطّن جون پور۔ در اوائلِ سلطنتِ محمّد شاہ، بادشاہ در شاہ جہان آباد آمدہ، بہ خدمتِ خانِ آرزو استفادہ حاصل نمودہ۔ از وست :

اُٹھیں کیوں کر نہ اس دل سے بھبھوکے — کبھو تھے آشنا ہم بھی کسو کے م

رقیب اِس طرح جلتے ہیں ہمیں دیکھ — گویا رشتے ہیں ساہیں اُس شمع رو کے م

(۱۳۲) **سلیماں** : میاں سلیمان معشوق عبدالحی، تاباں ست، چوں آں ماہ تاباں در پردۂ ابرِ فنا پنہاں گردید، ایں عزیز با او الفتے کہ داشت مانندِ گل گریباں چاک کردہ، گریاں گریاں از گوشۂ دنیا عزلت گزیدہ، چندے بر تالاب فرید آباد با دلِ پُر غم و چشمِ پُر نم درویشانہ بہ سر بُرد۔ بعدہٗ بہ طرف الٰہ آباد رفت۔ تا حال بہ لباسِ فقیری بہ سر می برد۔ خدایش سلامت دارد۔ از وست :

تجھ سے ظالم سے ملا دیکھ تو طرّاریِ دل — کچھ بھی دھڑکا نہ کیا بل بے جگر داریِ دل م

(۱۳۳) **سلام** : میاں نجم الدّین، المتخلّص بہ سلام، خلف میاں شرف الدین علی خاں، پیام، در عہدِ فردوس آرام گاہ بود۔ بہ کمالِ خلق و اخلاق بہ سر برد۔ خدایش بیامرزد۔ از وست :

حدیثِ زلف چشمِ یار سے پوچھ — درازی رات کی بیمار سے پوچھ م

(۱۳۴) **سعادت** : میر سعادت علی، سعادت تخلّص، از سادات امروہہ، مرد سلیم الطبع، کم سخن بود۔ فی الجملہ چاشنی درویشی نیز داشت، از مریدان شاہ ولایت۔ میلِ ایہام بندی بسیار داشت۔ یک مثنوی در عشقِ سیلی و سجنوں کہ دو عاشق و معشوق گزشتہ اند، گفتہ، و نام او نیز بہ جائے لیلی مجنوں سیلی سجنوں

گزاشتہ۔ اکثر مناقب او نیز مشہور ست، چناں چہ سواری ہوئی امیر المومنین کی
از وست۔ خدا ایش بیامرزد۔ ایں چند بیت ازان ست:

بس کہ ہوں کم ظرف دو پیالوں میں بہ جاتا ہوں مست — ہوش کھو دیتی ہیں میرا اُس کی آنکھیں مے پرست — نم
یار سے جو رقیب لڑتے ہیں — یہ ہمارے نصیب لڑتے ہیں — ن
مت دکھا اِس طرح کی آن مجھے — جینے دے کوئی دم تو جان مجھے — م
پپیہے کی طرح دارو کے شیشے — زبانِ حال سے کہتے ہیں پی پی — ن

مطلع سر دیوان او این ست:

واللہ جو سر لوح ترا نام نہ ہوتا — ہرگز کسی آغازہ کا انجام نہ ہوتا — ن

(۱۳۵) **سجّاد**: سلالۂ دودمانِ مصطفوی، نقاوۂ خاندانِ مرتضوی، موصوف بہ اوصاف حمیدہ، مخلوق بہ اخلاق سنجیدہ، شہرۂ انفس و آفاق، در لطیفہ گویان و ایہام بنداں طاق، سیادت و شرافت نہاد، نیک نیت و خوش اعتقاد، میر محمّد سجّاد، ہم متخلّص بہ سجّاد، خلف الصدقِ میر محمّد عظیم، ابنِ محمّد اکرم خاں مرحوم، سرمنشاے منشیانِ بادشاہی، مصحّحِ فرامین شاہنشاہی، ہم راہی یحییٰ خاں، میر منشی۔ وطن آبا و اجدادِ ایشاں بعدِ آمدن از ولایت آذربایجان اکبر آباد بود، و معاشرت ایشاں شاہ جہاں آباد۔ در ہر امور کہ دخل نمودہ آں را بہ کمال رسانیدہ، علم طب ہم حاصل نمودہ۔ در اکبر آباد بہ مساکنِ قدیم استقامت دارند، و شوق طلسمات و انشا و خوش نویسی و شعر فہمی را بہ مراتبِ اعلیٰ رسانیدہ اند، و از شاگردانِ میاں آبرو ایہام را بہ چاشنیِ دردمندی گفتہ و اعلیٰ کردہ۔ خدا سلامت دارد۔ از وست:

ساقی بغیر جام کے جی کا بچاؤ نہیں — جوں فیلِ مست آئے ہی ابرِ سیہ پلا — ن
گر تیرے کل کے آنے نے کھوئے نہیں حواس — سجّاد کیوں پھرے ہی سجن آج فق ہوا — ن

غم نہیں گر گم ہُوا بالوں میں تیرے جاکے دل — پیچ پر تجھ زلف کے گویا کہ اِس کو بل دیا

تجھ کو ای سجّاد غیر از خنجرِ بیداد کے — اور بھی کچھ قاتلوں کی دوستی نے پھل دیا

بتاں تو چاہتے سجّاد تجھ کو — کریں کیا پر خدا نے جو نہ چاہا

بتوں کی بھی یہ چاہ دو روزہ ہے — ہمیشہ رہے ہے نام اللہ کا

جان و دل سب قبول ہے جانا — پر گلی میں تری مجھے آنا

میں نے جانا تھا قلم بند کرے گا وہ حرف — شوق کے لکھنے کا سجّاد نے دفتر کھولا

تیری شمشیر سے جدا ہو کر — سر مرا مجھ کو تن نہیں دیتا

سجّاد مہرباں کرے کوئی اُس کو کس طرح — غصہ ہُوا ہے یار ہیں کچھ ان دنوں غضب

اِس فصلِ گل میں جوشِ جنوں کا ہُوا ہے قہر — جنگل میں آبسا ہے نکل کر تمام شہر

ہوتی نہیں ہے سرد ہمارے یہ دل کی آگ — لاگی ہے جس زمانے سے جلتی ہے دہر دہر

تجھے غیر سے صحبت اب آبنی — ایسی دوستی ہم سے ہے دشمنی

لفظ "ایسی دوستی" زبانِ قدیم ست یعنی برائے ہمیں۔

بادِ صبا سے زلفِ معطّر کی ہم تلک — مدّت ہوئی کہ پہنچی نہیں کچھ خبر عطر

گلی میں تری بیٹھتے ہیں سجن — اِن آنکھوں سے آتے ہیں آنسو نکل

جب ہم آغوشِ یار ہوتے ہیں — سب مزے درکنار ہوتے ہیں

ناخدا ای ٹک ایک کر ساقی — ایک کشتی میں پار ہوتے ہیں

اب تو ہم نے کیا گریباں چاک — تیرے دامن کو کس طرح چھوڑیں

کس طرح کوہ کن یہ گزریں گی — ہجر کی یہ پہاڑ سی راتیں

دیکھوں طبیب درپئے دارو ہیں کب تئیں — مرتا ہوں میں تو عشق میں جیتا ہوں جب تئیں

تو روزِ وصل میں لے بیٹھے پاس کن کن کو — یہ راتیں ہجر کی کاٹی تھیں کیا اِسی دن کو

لبِ شیریں پہ اُس کے مرتا ہوں — زندگی اپنی تلخ کرتا ہوں

یار کا جامہ ہیں ہی گا عزیز — یوسف اپنا پیرہن تہ کر رکھے — نم
ہاتھ ہی میں رہے ہی طفلوں کے — یہ تماشے کا دل کھلونا ہی — ن
بختوں بازی کہیں سجن مل جائے — لیکن ایسے کہاں نصیب مرے — ن
جب تک نہیں پہنچتے ترے آستاں تلک — تب تلک ہماری خاک کی مٹی خراب ہی — نم
کچھ یہ سجّاد ہی کے دل کی عجب حالت ہی — ورنہ اِس درد کے میں دیکھے ہیں بیمار کئی — ن
ماہ رو بن یہ شمع مجلس میں — جیسی روشن ہی سب پہ روشن ہی — ن
ایک دل رکھتا ہوں جو چاہے سولے جائے اِسے — خواہ زلفیں، خواہ مژگاں، خواہ ابرو، خواہ چشم — ن
مرے دیکھ کر حال داماں کا — پھٹے کیوں نہ سینہ گریباں کا — ن
کیوں مشتِ گل بھی دل کی نہ رونے میں رہ گئی — سجّاد مجھ کو باقی ہی چشموں سے یہ گِلہ — ن
تیری اِن کالی کالی زلفوں پر — کیا گھٹا کی طرح برستی ہی
کیسے جنگل اُجاڑ کو دیکھیں — یہی سجّاد دل میں بستی ہی
سُرخیِ لب ہر آن میں کچھ ہی — یوں کچھ، اور رنگِ پان میں کچھ ہی — م
اِس زمانے کی دوستی کا رنگ — آن میں کچھ ہی آن میں کچھ ہی — م
یعقوب کے جب عشق پڑا سر پہ ٹوٹ کر — آنکھوں نے اُس کی رو دیا آخر کو پھوٹ کر

(۱۳۶) سودا: میرزا محمد رفیع، المتخلص بہ سودا، اُستادِ اُستادانِ کامل و قادر، سرآمدِ شعرائے زماں، در میدانِ نزاکتِ بیاں فکرش چوں مہر گرم تازست، و در عرصۂ لطافت و قدرت و متانتِ سخن بازوے فطرتِ او چوں تیر راست انداز ست۔ فلک از علوِ رتبۂ فکرش انگشتِ ہلال بہ دندانِ پردیں گرفتہ، و خورشید از سموِ منزلت خاکِ قدمِ طبعش را بہ جاروبِ مژگاں رُفتہ۔ اُستادِ شعرائے عصر و مقتدائے بلغائے دہر، میدانِ بیانِ او وسیع و طرزِ معانی او بدیع، بر سپاہِ دانش شاہ و بر آسمانِ بینش ماہ۔ در قصیدہ و ہجو ید بیضا دارد۔ قصائد عذب و دل آویز،

و بیانِ ہجو بلند، نظمش طرب انگیز ست ۔ مردے ست از مغتنماتِ روزگار، خوش خلق و نیک خو و یار باش ۔ مولدش شاہ جہان آباد ۔ سنِ شریف بہ ہفتاد رسیدہ باشد ۔ نوکری پیشہ ۔ الحال در سرکارِ نوّاب شجاع الدولہ بہادر بہ وسیلۂ فنِ شاعری سرفراز ست ۔ در علمِ موسیقی نیز ماہر ست، و تصانیفِ بسیار در تغنیہ ہم دارد ۔ تا حال مثلِ او در ہندوستانِ جنت نشان کسے بر نہ خاستہ ۔ اکثر فقیر در خدمتِ آں بزرگوار می رسد ۔ بسیار کرم می فرماید ۔ اگرچہ بندہ را چہ یارا ست کہ انتخابِ دیوانِ او نماید، دریا را بہ کوزہ نہ می تواں کردن ۔ ازبس کہ اشتہار دارد، محتاجِ نوشتنِ کسے نیست ۔ حق تعالیٰ بسیار سلامت باکرامت دارد کہ زندگیِ سخن وابستۂ ذاتِ اوست ۔ دام افضالہٗ ۔

ازوست :

مقدور نہیں اُس کی تجلّی کے بیاں کا — جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا

اِس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن — جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا

بے کس کوئی مرے تو جلے اُس پہ دل مرا — گویا یہ ہے چراغ غریبوں کی گور کا

بزمِ بتاں میں جس دم وہ رشکِ مہ گیا تھا — آپس میں ہر پری رو منہ دیکھ رہ گیا تھا

کسی دیں دار و کافر کو خیال اتنا نہیں آتا — سحر کیا ہو چکی سودا کے سر پر شام کیا ہوگا

قابو میں ہوں میں تیرے گو اب جیا تو پھر کیا — خنجر تلے کسی نے ٹک دم لیا تو پھر کیا

سودا ہوئے جب عاشق کیا پاس آبرو کا — سنتا ہے اے دوانے جب دل دیا تو پھر کیا

ٹوٹے اگر نگہ سے تری دل حباب کا — پانی بھی پیجیے تو مزہ ہو شراب کا

موجِ نسیم گرد سے آلودہ ہے نپٹ — دل خاک ہو گیا ہے کسی بے قرار کا

سونپا تھا کیا جنوں نے گریبان کو مرے — لیتا ہے اب حساب جو یہ تار تار کا

میں دشمنِ جاں ڈھونڈ کے اپنا جو نکالا — سو حضرتِ دل سلّمہ اللہ تعالیٰ

مانگا جو میں دل کو تو کہا بس یہی اک دل — ایسے تو مرے کوچے میں کتنے ہیں اٹھالا

نم سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہ کن ق — بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا

نم کس منہ سے پھر تو آپ کو کہتا ہی عشق باز — ای روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

نم کس گلی دیکھ کے میں اُس کو پکارا نہ گیا — مڑ کے ٹک دیکھنے کا ننگ گوارا نہ کیا

کسی کا دین کیا حق نے کسی کی دنیا — سب کا سب کچھ کیا پر تجھ کو ہمارا نہ کیا

ن نہ کھینچ ای شانہ، اِن زلفوں کو یاں سودا کا دل اٹکا — اسیرِ ناتواں ہی یہ نہ دے زنجیر کو جھٹکا

ن پرے رہ برق، خارِ آشیاں اپنے کے کہتا ہوں — اڑے گا دھجیاں ہو کر جو یاں دامن ترا اٹکا

نم موجِ آتش ہی سیلِ آنکھوں میں — شاید اس دل کا آبلہ پھوٹا

ن نہ جیا تیری چشم کا مارا — نہ تری زلف کا بندھا چھوٹا

نم مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر — مرے لہو کو تو دامن سے دھو ہوا سو ہوا

ن ترا جی مجھ سے نہیں ملتا مرا جی رہ نہیں سکتا — غرض ایسی مصیبت ہی کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا

ن سودا سے یوں کہا میں دل اس قدر نہ کھونا — کہنے لگا کہ ناداں کیا پوچھتا ہی ہونا

تیرے کوچے سے جو میں آپ کو چلتے دیکھا — جی کسی تن سے نہ اِس طرح نکلتے دیکھا

سوجھی تدبیر نہ تقدیر کو بہلانے کی — جب تجھے قتل پہ عاشق کے مچلتے دیکھا

م دل مت ٹپک نظر سے کہ پایا نہ جائے گا — جوں اشک پھر زمیں سے اُٹھایا نہ جائے گا

م فرصت ہو باغباں کہ زرا دیکھ لیں چمن — جاتے ہیں واں جہاں سے پھر آیا نہ جائے گا

جی مرا مجھ سے یہ کہتا ہی کہ ٹل جاؤں گا — ہاتھ سے دل کے ترے اب میں نکل جاؤں گا

قطرۂ اشک ہوں پیارے مرے نظارے سے — کیوں خفا ہوتے ہو پل مارتے ڈھل جاؤں گا

چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہتِ گل — پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

اس خرابی سے تو مت مجھ کو نکال اب گھر سے — تو کہے "آج نکل" میں کہوں "کل جاؤں گا"

ن کیوں اسیری پر مری صیاد کو تھا اضطراب — کیا قفس آباد ہو گئے کون سے گلشن خراب

م ٹک جاگ لے تو چھوڑ کے غافل پلنگِ خواب — آخر کو پھر یہی ہی کہ چھاتی پہ سنگِ خواب

کیا کیا لڑائیاں تھیں سرک سونے میں ہم — جاگیں سے گے پھر بھی بخت کہ ہوئے گا جنگ و خواب

ن ہندو ہیں بت پرست مسلماں خدا پرست — پوجوں میں اُس کسی کو جو ہو آشنا پرست

سودا گرفتہ دل کو نہ لاؤ سخن کے بیچ — جوں غنچہ سو زباں ہی اُس کے دہن کے بیچ

م گل رخصتِ بہار تھی شبنم صفت میں زور — رو یا ہر ایک گل کے گلے لگ چمن کے بیچ

م سودا کا تو نے حال نہ دیکھا کہ کیا ہوا — آئینہ لے کے آپ کو دیکھے ہی تو ہنوز

ن قاتل کے دل سے آہ نہ نکلی ہوس تمام — ذرّہ بھی ہم تڑپنے نہ پائے کہ بس تمام

ن نہ غنچے گل کے کھلتے ہیں، نہ نرگس کی کھلیں کلیاں — چمن میں لے کے خمیازہ کسی نے انکھڑیاں ملیاں

ن غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہی کہ نہیں — جلوہ گر یار مرا ورنہ کہاں ہی کہ نہیں

ن دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے پھرتا ہوں — کچھ علاج اِن کا بھی ای شیشہ گراں ہی کہ نہیں

ن بہار و باغ ہو، مینا ہو، جامِ صہبا ہو — ہوائے ابر ہو، ساقی ہو، اور دنیا ہو

ن روا ہی کہ تو بھلا ای سپہرِ نا انصاف — ریائے زہد چھپے، رازِ عشق رسوا ہو

ن ای لالہ، گو فلک نے دیے تجھ کو چار داغ — چھاتی مری سراہ کہ اک دل ہزار داغ

ن بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے — اپنا ہی تو فریفتہ ہوئے خدا کرے

فکرِ معاش و عشقِ بتاں یادِ رفتگاں — اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

گر ہو شراب و خلوت و معشوق خوب رُو — زاہد تجھے قسم ہی جو تو ہو تو کیا کرے

ن عشرتِ دو جہاں کی یہ دل ہاتھ دھو سکے — تیرے قدم کو چھوڑ سکے یہ نہ ہو سکے

ن جگ میں شراب خوار کی تشہیر کے لیے — سودا جو محتسب ہو تو زاہد کو خر کرے

ن میں کہتا ہوں دل اپنے سے کہ ننگ و نام سے گزرے
نہ ہوں گر اس میں یہ باتیں تو کیا آرام سے گزرے

پیار سے نہ بُرا مانو تو اک بات کہوں میں — کس لطف کی اُمید پہ یہ جور سہوں میں

گر چھپ کے کہیں تجھ کو ذرا دیکھ رہوں میں — ہر ایک مجھے آکے سناتا ہی کہوں میں

ہنوز آئینہ گرد اس غم سے اپنے منہ پہ ملتا ہی
خدا جانے کہ کیا کیا صورتیں اس خاک میں گڑیاں

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہی مرغ قبلہ نما آشیانے میں

منڈا کر خط، تم اپنے حق میں کیوں کانٹوں کو بوتے ہو
یہ عارض گل نہ ہوئیں گے، عبث سبزہ بھی کھوتے ہو

رقیب اور میں ہوں زیر آسماں یک جانِ دو قالب
مخاطب تم بہ لفظِ جان ہم دونوں کے ہوتے ہو

جگر اُن کا ہی جو تجھ کو صنم کہہ یاد کرتے ہیں
میاں ہم تو مسلماں ہیں، خدا کہتے بھی ڈرتے ہیں

کس کس طرح کی دیکھیں، اس باغ کی فضائیں
کیدھر گئے وو ساقی، وہ ابر وہ ہوائیں

صورت میں تو کہتا نہیں، ایسا کوئی کب ہی
اک دھج ہی کہ وہ قہر ہی، آفت ہی، غضب ہی

کہتے ہیں جسے عشق وو کیا چیز ہی سودا
جوں ذاتِ خدا، جس کو حسب ہی، نہ نسب ہی

یاں نہ ذرہ ہی چمکتا ہی فقط گرد کے ساتھ
جلوہ گر نور ہی خورشید کا ہر فرد کے ساتھ

صبح دم آج چمن میں بہ لبِ جو سودا
ق بیٹھا اک شعر یہ پڑھتا تھا پٹ درد کے ساتھ

دل کو چاہا تھا کہ خالی کروں مانندِ حباب
ہو گئی جان ہوا اک نفسِ سرد کے ساتھ

کہے ہی مجھ کو جو زاہد کہ تجھ کو دیں تو نہیں
بھڑا دے خم ہی مرے منہ سے چل نہیں تو نہیں

اس دل کو دے کے لوں دو جہاں یہ کبھو نہ ہو
سودا تو ہوئے تب نہ کہ جب اس میں تو نہ ہو

قصہ تو حسن و عشق کا چکتا ہی یوں کے بیچ
گر محکمے میں قاضی کے تو روبرو نہ ہو

تنزل میں بھی ہم ہرگز ترقی سے نہ کم ہوتے
جو بنتے کوہ سے پتھر تو پتھر سے صنم ہوتے

ہوا ہوئے گا کیا کیا مژدہ بر مورد تلطف کا
خبر کن حالِ بد اپنے کے اُس دم کاش ہم ہوتے

خاک پر بھی تیرے دیوانے کی یہ تدبیر ہی
ہر بگولا طوق، ہر موجِ ہوا زنجیر ہی

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں
یہ اگر سچ ہے تو ظالم اِسے کیا کہتے ہیں

جن نے پوچھا کہ دلِ خوش ہے کہیں دنیا میں
رو دیا اُن نے اور اتنا ہی کہا کہتے ہیں

مری آنکھوں میں تو رہتا ہے مجھ کو کیوں رُلاتا ہے
سمجھ کر دیکھ لو اپنا بھی کوئی گھر ڈباتا ہے

عیاں ہے شوق ملنے کا مرے نامے کے کاغذ سے
کہ جب کھولے ہے تو اس کو تو وہ لپٹا ہی جاتا ہے

اب کے بھی دن بہار کے یوہیں چلے گئے
پھر پھر گُل آ چکے پہ سجن تم بھلے گئے

پوچھے ہے پھول پھل کی خبر اب تو عندلیب
ٹوٹے جھڑے خزاں ہوئے پھولے پھلے گئے

گل پھینکے ہے عالم کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

تصوّر میں ترے کھیو صبا اُس لااُبالی سے
گلے لگ لگ میں رویا رات تصویرِ نہالی سے

ڈرتے ڈرتے ترے کوچے میں جو آجاتا ہوں
صیدِ خائف کی طرح رو بہ قفا جاتا ہوں

نہ تلطف نہ مروت نہ محبت نہ وفا
سادگی دیکھ کہ اِس پر بھی لگا جاتا ہوں

سوچوں ہوں اپنے تئیں جوں سخنِ رفتہ ز یاد
گاہ بے گاہ اگر آپ میں آجاتا ہوں

ر
کیا اشک مرا پانو تلک ڈھلتا ہے
سر کب کا ترے قدم تلے رُلتا ہے

اے غنچہ دہن پیار سے ٹک ہنس کر بول
کیا دل ہے مرا تو کہ نہیں کھُلتا ہے

(۱۲۷) **سوز**: میر سوز، سلمہ اللہ تعالیٰ، شعلۂ عالم سوز و گوہرِ گیتی افروز، محمد میر، المتخلص بہ سوز۔ فقیہِ بے مثال و درویشِ باکمال، منشیِ بے نظیر و خوش نویسِ دل پذیر، شاعرِ شیریں بیاں و سخن سنجِ زباں داں، مجلس نشینِ دانش مندی، قصرِ فطرتش در غایتِ بلندی۔ گلدستۂ نثرش چوں گلشنِ حسنِ دل براں تازہ، و گل ہائے نظمش در کثرت چوں سپاہِ غم بے اندازہ۔ فضائلش چوں حسنِ خوباں عالم گیر، و خصائلش چوں خمیازۂ نازِ محبوباں دل پذیر۔ معجز قلم و شیریں رقم، رشحاتِ مدادِ قلمش از دریائے اعزاز، کلکِ عنبر بارش از بوستانِ اعجاز۔ رسالۂ در علومِ تیراندازی بر سبیلِ تذکرہ چوں تیر در راستی

به کمالِ قوّت در میدانِ سخن انداخته، و خود چوں کماں از بدرنگیِ آفاق به گوشه نشینی ساخته۔ در عهدِ خود از جمله ابنداں ممتاز۔ طرزِ ادائیهٔ مِلکِ اوست، و خواندنِ اشعارش از زبانِ او نیکوست، از خواندنش چناں خوب می نماید که در گفتن نمی آید۔ مردے ست متواضع و متوکل، قابلِ دوست و جوہر شناس۔ ابنِ سید ضیاء الدین بخاری، از اولادِ قطبِ عالم گجراتی۔ بر فقیر بسیار کرم می فرماید، و از کلامِ بندہ محظوظ ست۔ حق تعالیٰ بسیار سلامت باکرامت دارد۔ سوز، دام افضالہٗ:

میں کس کے ہاتھ لکھ بھیجوں میاں صاحب سلام اپنا
مجھے تو بھول جاتا ہے ترے دھڑکے سے نام اپنا

دل کے ہاتھوں نپٹ خراب ہوا
جل گیا بھن گیا کباب ہوا

جن کو نِت دیکھتے تھے اب اُن کا
دیکھنا ہی خیال و خواب ہوا

یاریوں دور جا بسے اللہ
کیا زمانے کا انقلاب ہوا

سوز کچھ منہ بنائے آتا ہے
آج مجرے کا پھر جواب ہوا

کسی نے روم لی قسمت میں کوئی شام لے آیا
ہمیں کچھ لے نہ آیا ایک تیرا نام لے آیا

صدا ہے در پہ کچھ پیغام بر کی سی خدا جانے
نویدِ وصل ہے یا ہجر کا پیغام لے آیا

اہلِ ایماں سوز کو کہتے ہیں کافر ہو گیا
آہ یا رب رازِ دل اِن پر بھی ظاہر ہو گیا

کعبے ہی کا اب قصد یہ گمراہ کرے گا
جو تم سے بتاں ہو گا سو اللہ کرے گا

بغیر از عاشقی کچھ کام مجھ سے ہو نہیں سکتا
تڑپنے کے سوا آرام مجھ سے ہو نہیں سکتا

وہ میرے نام سے بیزار ہے ملنے کے کیا معنی
نہ صاحب وصل کا پیغام مجھ سے ہو نہیں سکتا

کہاں میں اور کہاں اندیشۂ بوس و کنار اُس کا
نہ بھائی یہ خیالِ خام مجھ سے ہو نہیں سکتا

غم تو کہتا ہے کہ میں تجھ کو ستا جاؤں گا
پر مری جان، ترے غم کو میں کھا جاؤں گا

مجھ سے مت جی کو لگاؤ کہ نہیں رہنے کا
میں مسافر ہوں کوئی دن کو چلا جاؤں گا

سر اوپر شام آئی اب تلک منزل نہیں پاتا
کہاں بستر بچھاؤں میں کسی کا دل نہیں پاتا

دور سے دیکھتے ہی سوز کی شکل
کیسا بھاگا ہی وہ شتاب شتاب

ایک بوسہ تو مجھ کو دو صاحب
سنتے ہی منہ پھرایا لو صاحب

مانگتے ہیں ہم اپنے یار کی خیر
آئینے کچھ تو دے بہار کی خیر

ابر کہتا ہی بار بار مجھے
بھیجیو چشم اشک بار کی خیر

کم نہیں ہوتا غبارِ خاطرِ جاناں ہنوز
خاک سے میری جھٹکتا ہی کھڑا داماں ہنوز

غم سے تیرے ہؤا یہ سوز و گداز
پر نہ آیا تو اپنی ضد سے باز

یوں کھب رہا ہی گل کے کلیجے میں خار حیف
جیتی ہی عندلیب تو اب تک ہزار حیف

صورت کو دیکھتے ہی گئے ہاتھ پاؤں پھول
گھبرا دیا نہ ای دلِ ناکردہ کار حیف

دیکھا تو کچھ نہ آ کے جہانِ خراب میں
کیوں زندگی خلل ہی کیا تو نے خواب میں

پیری میں غیرِ گریہ بھلا اور کیا ہی سوز
دریا کی سیر ہی تو شبِ ماہتاب میں

مثلِ نَے ہر استخواں میں درد کی آواز ہی
کچھ نہیں معلوم یارب، سوز ہی یا ساز ہی

اس فرشتہ شکل پہ کھونا ہی کتنا مہر سوز
بے پروبالی ہیں جس کی عرش تک پرواز ہی

اُمّیدِ وصل جز طمعِ خام کچھ نہیں
ہر صبح ہی قسم پہ قسم شام کچھ نہیں

بلبل کہیں، پتنگ کہیں اور ہم کہیں
اکٹھے یہ دل جلے نہ ہوئے ایک دم کہیں

گو آہ متصل یونہیں آتی رہے گی سوز
اندیشہ ہی مجھے نہ نکل جائے دم کہیں

بیٹھ جا ای سوز دو دو قطرے لیں ایک جا
خانۂ خمار بھیجا ہی ابھی دستار کو

سوز گردش سے غمِ گردوں کی مت دل تنگ ہو
جوش کھا کھا دل میں آپ ہی بادۂ گل رنگ ہو

کس طرح روتے ہو ای دیدۂ تر دیکھیں تو
کس طرح بہتے ہو ای لختِ جگر دیکھیں تو

خوش تو ہوتا ہی کلا دیکھ کے نٹ کی عالم
ہوش اُڑ جائیں کلا تیری اگر دیکھیں تو

نوکِ مژگاں پہ تو آجاؤ جھمک کر پیارے
لختِ دل آج تمھارا بھی ہنر دیکھیں تو

یوں تو نکلی نہ مرے دل کی اپاہے گاہے
ای فلک بہرِ خدا رخصتِ آہے گاہے

ق
ایک نے سوز سے پوچھا کہ صنم سے اپنے
اب بھی ملتے ہو بہ دستور کہ گاہے گاہے

دیکھ کر منہ کو گھڑی ایک میں بھر کر دمِ سرد
یوں اشارت سے جتایا سرِ راہے گاہے

اس تنگ وقت میں تو نہ تاخیر شرط ہی
ہی صید نیم جاں اِسے تکبیر شرط ہی

جس گلشنِ جہاں میں کہ صیاد کا ہو خوف
رہنا بہ رنگِ بلبلِ تصویر شرط ہی

ہاں مثلِ گل شگفتہ نہ ہو غنچہ ساں خموش
ماتم سرا میں صورتِ دل گیر شرط ہی

یوں پوچھنا کہ سچ ہی فلانے کو عشق ہی
صدقے میں جاں بوجھ بھلانے کو عشق ہی

دل خانۂ خدا ہی خدا لاشریک ہی
پر اس میں سوز تیرے سمانے کو عشق ہی

اشکِ خوں آنکھوں میں آ کر جم گئے
دُور کے بھی دیکھنے سے ہم گئے

پاس آ کر دیکھنا تیرا بڑا ارمان ہی
مجھ کو سب مشکل ہی لیکن تجھ کو سب آسان ہی

ای نکہتِ گل جائیو محفل میں کسی کے
ملک دل کو مرے ڈھونڈیو تو دل میں کسی کے

بیمار کی آ اپنے سرِ شام خبر لے
اس رات خدائی ہو جو ظالم وہ سحر لے

جوں خضر ہوس عمرِ ابد کی نہیں مجھ کو
اُس دم کی تمنا ہی جو تجھ پاس گزر لے

پیتا ہوں یادِ دوست میں ہر صبح و شام جام
بے یادِ دوست مجھ کو ہی پینا حرام جام

تھے وقتِ نزع منتظرِ کلمہ سوز سے
جنبش لبوں کی دیکھی تو کرتا تھا جام جام

اندوہ سے تیرے مر گئے ہم
روئیں کیوں کر نہ گھر گئے ہم

ق
کاہے کو تو گھورتا ہی ظالم
کچھ لے کے ترا مُکر گئے ہم

بس بس آنکھیں نکال مت واہ
ایسے غصّے سے ڈر گئے ہم

زباں سے ہو سکے کب دل رُبا تیری ثنا کہنا
مگر صورت کو تیری دیکھنا اور واہ وا کہنا

پرکار کی روش پھرے ہم جتنے چل سکے
اس گردشِ فلک سے نہ باہر نکل سکے

رونا بھی تھم گیا ترے غصّے کے خوف سے
تھی چشم ڈبڈبائی پر آنسو نہ ڈھل سکے

دل کی قدر و منزلت یاں کچھ نہیں
لا اُبالی یار کی سرکار ہی

ہم نے کون و مکان دیکھ لیا پل میں سارا جہان دیکھ لیا
نیستی کے لیے ہی ہستی ہے ہاں مرے مہربان دیکھ لیا

اشک کب ہوں تیرے مستانے کے خشک کوچے کب ہوتے ہیں مے خانے کے خشک
چوری چوری تیرے منہ شاید لگا ہونٹ تو ہی ہیں گے پیمانے کے خشک
زلف کے پٹّوں میں کیا جا کر دھسی یا الٰہی ہاتھ ہوں شانے کے خشک
اب کے دل میں ہے کہ گوہر رو دیئے ہوں سراسر آب دکھلانے کے خشک

کہوں اک بات میں تجھ سے اگر جی کی اماں پاؤں
مجھے قربان ہونے دے ترے قربان ہو جاؤں

جو میرے عدو تھے اُن سے تو یار ہُوا ہے مجھ سے لڑنے کو اب تو تیار ہُوا
رہ رہ کے مرے دل میں یہی آتا ہے اللہ تو مجھ سے ایسا بیزار ہُوا

اکثر اشعارِ میر سوز و میرزا رفیع، سودا در دیوانِ مہرباں خاں یافتہ می شود، ازیں جہت اشعارِ او را قلمی نہ کردم۔ آنچہ دو سہ نوشتم برہماں اکتفا کردم۔

متاخّرین

(۱۳۸) **سیّد**: میر یادگار علی، سیّد تخلّص، شخصے ست از ساداتِ بہادر پور کہ مشہور ضلع میوات ست۔ طبعِ موزوں دارد، و دراں دیار عزیزِ ہر کسے ست۔ سلامت باشد۔ ازوست:

خدا کے واسطے صیّاد تہ کر اب تو دام اپنا کہ گلشن سے لیا ہے تو نے خاطر خواہ کام اپنا م
شورشیں باقی ہیں دل میں تس پر آتی ہے بہار دیکھیے کیا کیا شگوفے اب کے لاتی ہے بہار م

کیا اب اُمید کریں وصل کی مرتے مرتے
عمر تو کٹ گئی دُکھ ہجر کے بھرتے بھرتے م

(۱۳۹) **سلیم**: میر سلیم، المتخلّص بہ سلیم، مردے ست سلیم الطبع، از ساکنانِ عظیم آباد، تجارت پیشہ، خوش اندیشہ، بندہ وے را نہ دیدہ، زبانیِ دیگراں شنیدہ کہ گاہ گاہے فکرِ غزل می نماید و الفاظ را درست می نشاند۔ سلامت باشد۔ از وست:

پڑھائے عشق نے جب ہم کو نکتے علمِ مستی کے
پریشاں ہو گئے اوراق سب دیوانِ ہستی کے

ہوئی معلوم بو، یہ خونِ دل کے جوش سے مجھ کو
کہ زخمِ تازہ پہنچے گا کسی مے نوش سے مجھ کو

شرابِ بے خودی سے کیا بجھی تھی تیغ قاتل کی
کہ زخم اُس کا لیے جاتا ہے ہر دم ہوش سے مجھ کو

سلیم اس بے کسی سے ہائے زیرِ خاک جاتا ہوں
کہ روئیں گے لگا منکر نکیر آغوش سے مجھ کو

(۱۴۰) **سوزاں**: از امرایانِ جہاں، نواب احمد علی خاں، ولدِ افتخار الدّولہ بہادر، مرزا علی خاں، دام اقبالہٗ۔ بہ خطابِ شوکت جنگ، المتخلّص بہ سوزاں[1] جوانے ست در سخن سنجی یگانہ، و در فہم و فراست ارسطوے زمانہ۔ در وقتے کہ میر ضیا سلّمہ اللہ ہم راہِ آں نیکو خصال بود، گاہ گاہے اشہبِ فکر را در میدانِ غزل جولاں می نمود، الحال مدّتے شد کہ راغب بہ ایں طرف نیست۔ حق تعالیٰ آں سروِ موزوں را در گلستانِ جہاں سرسبز داراد:

زبس کہ ذکر ترا گرم شب بیاں میں رہا
تپش جگر میں رہی اضطراب جاں میں رہا

اگرچہ کعبے ہی پہنچے تو کیا ہوا اے شیخ
بتاں تو دل میں لہے اور دل بتاں میں رہا

قید میں یوسف کو بھیجا واہ یوہیں چاہیے
خوب کی تو نے زلیخا چاہ یوہیں چاہیے

مت دل لگا بتوں سے کہنے یہ جا کسی کے
ہرگز ہوئے نہ ہوں گے یہ آشنا کسی کے

خوبی ہے کیا ستم گر اس ہفتہ دوستی میں
اپنا کسی کو کیجے ہو رہیے یا کسی کے

جانے سے نہ پوچھ اُس کے کیسی گزری ہی
دشمن پہ نہ گزرے ہم پہ جیسی گزری

جوں مرگ کا وقت گزرے موتی پہ ہائے
یہ زیست ہماری ساری ایسی گزری

(۱۴۱) **سکندر**: میاں سکندر، عرف گھیسا، از مرثیہ گویانِ متاخرین ست۔ اکثر در زبانِ پوربی و پنجابی و بنگالی و مارواڑی مرثیہ گفتہ، و بسیار مربوط گفتہ، و در قصہ خوانی و عرق کشی نیز ماہر ست۔ یک قصہ ملّاح و ماہی و بادشاہِ دل خوار بسیار بہ آب و تابِ نظم نمودہ است۔ اگرچہ علم نہ دارد، ولیکن بر کلامِ او جاے انگشت نیست۔ چوں با ہمہ مردم خوش طبعی دارد، و شراب می خورد، در نظرِ بعضے ہا سبک می نماید۔ غرض مردِ زندہ دلے ست۔ گاہ گاہ بہ طرزِ قدیم شعر می گوید طبعش مائلِ ایہام بسیار ست۔ سلامت باشد از شاگردانِ محمّد شاکر ناجی ست۔ از وست:

جو دھو کر داغِ دل سب پاک کیجے — تو جاری دیدۂ نم ناک کیجے
جلا جو آتشِ غم سے سراپا — علاج اُس کا پھر اب کیا خاک کیجے

حرف (ش)

متقدّمین

(۱۴۲) **شعور**: شعور دکنی، شعور تخلّص۔ ازیں شعر شعورِ او ظاہر ست:

برسات میں نہ دیکھا نظر بھر کر آفتاب — روشن ہے یہ کہ عاشق ہوا تجھ پر آفتاب ن

(۱۴۳) **شاہی**: شاہ قلی خاں، شاہی تخلّص۔ از ساکنانِ بھاگ نگر بود۔ مدّتے بر توسّلِ نوکری در بلدۂ حیدر آباد بہ سر برد، آخر بہ منصبِ ندیمیِ تانا شاہ معزّز گردید۔ بیشتر مرثیہ می گفت، در ولایتِ ہندوستاں دست بہ دست می آورند۔ غفر اللہ لہٗ:

ملنا تمھن کا غیر سے کوئی جھوٹ کوئی سچ کہے — کس کس کا منہ موندوں سجن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے م

متوسّطین

(۱۴۴) **شاکر**: محمّد شاکر، شاکر تخلّص، از یارانِ محمّد علی، حشمت۔ در نجوم ماہر بود۔ طبعِ موزوں نیز داشت۔ فکرشش خالی از درد نیست۔ از وست:

کیا پوچھے ہے حال بلبلوں کا ق جو اُن پہ گزرنی ہے گزر لی
گل چیں تجھے کیا تری بلا سے گل توڑ کے تو تو گود بھر لی

(۱۴۵) **شفا**: حکیم یار علی، شفا تخلّص، در ہماں زماں بود۔ گاہ گاہ دو سہ ریختہ نیز می گفت۔ در طبابت دستِ شفا داشت۔ خدائیش بیامرزد۔ از وست:

جوں ڈانک کے دیے سے دُونا کھلے ہے یاقوت چمکا ہے رنگِ پاں سے جوہر ترے لبوں کا م

(۱۴۶) **شاغل**: شاغل تخلّص در عہدِ محمّد شاہ، بادشاہ بود۔ شاگردِ میاں بسمل کہ سابق بریں گزشت۔ بیتے و مصرعے موزوں می کرد۔ خدائیش بیامرزد۔

از وست:

جاتی نہیں ہے اس سے تری فکرِ زلف و رخ شاغل کو روز و شب ہے ترا ذکرِ زلف و رخ نم

(۱۴۷) **شوق**: شاعرِ پرشوق، میاں حسن علی، المتخلّص بہ شوق۔ مردِ سپاہی پیشہ، صاحبِ دیواں، از شاگردانِ سراج الدین علی خاں، آرزو۔ مدّتے در سرکارِ نوّاب عماد الملک، غازی الدین خاں بہ وسیلۂ سپہ گری بہ سر بردہ۔ اصلش از قومِ افغان ست۔ الحال، معلوم نیست کہ کجاست۔ شعرش بسیار با انداز ست، و مشّاقی نیز از کلامش ہویدا است۔ اکثر ایں غزلِ او را نغمہ سرایانِ ہند در ہر دیار می خوانند، مشہور ست۔ سلامت باشد:

ہے غرض اپنی ہمیں یار کے مل جانے سے اور کچھ کام نہیں کعبہ و بت خانے سے
میں ہوں مے خوار و خرابات نشیں بادہ پرست جی ہے محظوظ مرا گردشِ پیمانے سے

ن مدت سے یہ بحث درمیاں ہے
پر علم نہیں کمر کہاں ہے

ن اگر قاصد ترے کوچے سے ٹک جلدی نہ آئے گا
تو پیارے دیکھیو پھر تو کہ میرا جی ہی جائے گا

ن میں اپنی کم زبانی سے عزیزاں گرچہ مرتا ہوں
لبِ زخموں سے قاتل کا ادائے شکر کرتا ہوں

ن ماتم میں میرے کوئی نہ رویا تو غم نہیں
تربت پہ میری شمع کا ہنسنا بھی کم نہیں

ن آچکا خط بھی پہ تیرا نت نیا اک ناز ہے
ہو چکی آخر بہار اور اب تئیں آغاز ہے

ن بجھے گی آتشِ دل ہم نے جانا تھا بہار آئی
ہوائے ابر نے دونی دے یہ آگ بھڑکائی

ن کیا کیا ستم نہ تھے کہ کیے چشمِ یار نے
جو سختیاں تھیں مجھ کو زمانہ دکھا چکا

ن آج ہی ملو تو بہتر وعدہ غلط ہے کل کا
جوں طفلِ اشک میں تو مہماں ہوں کوئی پل کا

تیری جفا اٹھائے یا جورِ آسماں کا
انصاف کر تو ایسا پتھر ہے دل کہاں کا

م خط مرا پڑھ کے یہ جواب دیا
نامۂ شوق کا جواب نہیں

تو نے چمن میں اس کو آنکھیں دکھائیاں ہیں
نرگس نے تجھ سے تو ہی آنکھیں چرائیاں ہیں

گر عاشقی کرو تو معلوم ہو حقیقت
اے ناصحو تمھیں تو باتیں بن آئیاں ہیں

سنتے ہی نہیں یہ بتِ گم راہ کسی کی
اِن ساتھ کٹے کس طرح اللہ کسی کی

ر اس دور میں بد قماش اکثر دیکھے
تھے وہ جو غلام تاج بر سر دیکھے

اے گنجفہ بازِ چرخ ہاتھوں سے ترے
اوراقِ جہاں تمام ابتر دیکھے

متأخّرین

(۱۴۸) **شاعر**: میر کلّو، سلّمہ اللہ تعالیٰ، المتخلص بہ شاعر، دامادِ خواجہ میر، درد، دام افضالہ۔ جوانے ست بہ کمالِ صلاحیت آراستہ، و بہ علم و عمل پیراستہ۔ اہلِ دل، منصف، متواضع، مؤدّب، بزرگ و بزرگ زادہ۔ فکرِ عالیش رسا و سخن متوالیش خوش نما۔ دیوانِ ریختہ مرتّب کردہ، و بیشتر رباعیات بہ طورِ میر سوز عمداً گفتہ۔

ہم راہِ میاں الم در فیض آباد آمدہ بود، بندہ باوے ملاقی شدہ است - خدایش سلامت دارد :

ہمیں یارب خبر اصلا نہیں ہے　　کہ پیدائش میں دل ہے یا نہیں ہے
تجھے جب سے صنم دیکھا کہے کیا　　خدا پہ علم ہے بندہ نہیں ہے
تری زلف آن اُلجھی ہے - مرا دل　　کسی سے آج تک اُلجھا نہیں ہے

تیغِ نگہ لگا ٹک اور زخمِ دلِ فگار پہ　　آہ نہیں یہ واہ ہے تیرے ہر ایک وار پر
ہمارا دل لیے جاتا ہے وہ خوں خوار کیا کیجے　　سوائے صبر کچھ چارہ نہیں ناچار کیا کیجے
گریباں پھاڑ کر کیدھر نکل جائیں ہم اے وحشت　　ہوئی ہے زندگی ناحق گلے کا ہار کیا کیجے
وہ سو جاتا ہے جھوٹے موٹھ بھی ہرگز نہیں سنتا　　حقیقت اپنی ایسے شخص سے اظہار کیا کیجے
مثل مشہور ہے شاعر کہ سوتے کو جگاتے ہیں　　جو کوئی جاگتا ہوئے اُسے بیدار کیا کیجے

ہم دیکھتے ہیں یوں کسے اے یار جہاں میں　　ایک تو ہی تو اس بات کے قابل نظر آیا
دیتے تو دیا آہ دل اپنا تجھے لیکن　　جینا بھی پھر اُس بن ہمیں مشکل نظر آیا

گر کہا ٹک بھی مرا کیجیے گا　　پھر جو جی چاہے کہا کیجیے گا
عوضِ لاکھ جفا ہے یہ ہمیں　　ایک گر وعدہ وفا کیجیے گا
ٹک بھی گر چین بہ جبیں کیجیے گا　　پھر نہیں ہم یہ یقیں کیجیے گا
اپنے مطلب کی کہے جائیں گے ہم　　گرچہ سو بار نہیں کیجیے گا

تکرار ہو جو ظلم و ستم کی تو کیا مزہ　　ظالم تبھی ہے لطف کہ ہر دم نئی رہے

(۱۴۹) شیدا : میر فتح علی، المتخلص بہ شیدا، از ساکنانِ مئو شمس آباد ست - پسرِ خواندۂ میر سوز - جوانے بہ کمالِ اخلاق، متواضع، مؤدب، از شاگردانِ میرزا رفیع، سودا سلمہ اللہ تعالیٰ - سپاہی پیشہ است - بندہ اورا یک مرتبہ ہم راہِ میاں آفریں دیدہ ام - طبعش بلند افتادہ - از کلامش بوئے دردمندی ظاہر ست -

سلامت باشد- ازوست:

وہ صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں — اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں
آئے تھے کیوں عدم سے کیا کر چلے جہاں میں — یہ مرگ و زیست دونوں آپس میں ہنستیاں ہیں

(۱۵۰) **شاداب** : لالا خوش وقت رائے، شاداب تخلّص- مولدِ او چاند پور، مدینہ است- منشی ست، نثر خوب می نویسد- در ہم چشمانِ خود بہ اعزاز بہ سر می برد- خدایش زندہ دارد:

م دیکھ اُس کے منہ پہ زلفِ سیہ فام کے تئیں — کیا زیب دی ہی کفر نے اسلام کے تئیں

واقعی ایں کافر مضمونے خوب یافتہ است، کہ کفر ازو می بارد- ولہٗ:

م بس ہو چکی شفا تو دلِ زار کے تئیں — اے کاش موت ہو ترے بیمار کے تئیں
م جب تلک ہو کام مژگاں سے تو ابرو مت چڑھا — تیر کے ہوتے بھی کھینچے ہی کوئی تلوار کو

(۱۵۱) **شرف** : میر محمدی، شرف تخلّص- برادر زادۂ نوّابِ خانِ دوراں مرحوم- بندہ نہ دیدہ، لیکن، اکثر از زبانِ یاراں شنیدہ کہ طبع خوبے دارد و بسا بزرگ ست- بیشتر بہ طورِ ناصر علی و میرزا جلال، اسیر ریختہ می گوید- حالا در شاہ جہان آباد ست:

عکس ہی کس مہ جبیں کا دل نشینِ آئینہ — ہم تگِ کبکِ دری ہی سرزمینِ آئینہ
صاف دل کا مرتبہ ہی عرش و کرسی سے بلند — جلوہ گر ہی آسماں زیرِ زمینِ آئینہ

(۱۵۲) **شفیع** : میر محمّد شفیع، سلمہ اللہ شخصے ست مجمعِ اخلاق و منبعِ اشفاق- عاشقِ ریختہ گویاں، در جمع نمودنِ اشعار توسنِ طبعش پویاں- با میر و مرزا و میاں قائم یک جا صحبت داشتہ- الحال بہ لکھنؤ در عالمِ تجرید بہ سر می برد، دافیوں ہم می خورد- شفیع تخلّص می کند- یک دو سہ بیت خود ہم می گوید- خدایش سلامت دارد- ازوست:

رات کیا ہو گیا تھا تجھ کو شفیع — جب کُھلی آنکھ روتے ہی دیکھا

غیر سے ملنے کو کریں گو نہ منع — دل میں تمھارے تو حیا چاہیے
یار کا پابوس نہیں دُور کچھ — اپنے تئیں خاک ہؤا چاہیے

حرف (ص)

متقدّمین

(۱۵۳) **صبائی**: صبائی تخلّص۔ احمد آبادی ست۔ از وست:

زر نہیں تو ہے جدائی دنیا میں جو ہے زر ہے — زر سے ہے آشنائی زر سے ملے ہے بھائی

متوسّطین

(۱۵۴) **صفدری**: صفدری تخلّص۔ شخصے گزشتہ است۔ از وست:

شمع کافوری پہ یہ فانوس مینا دیکھیو — سبز جامہ بر میں پی کے رنگ بھینا دیکھیو

(۱۵۵) **صادق**: نورِ حدیقۂ محمّدی وگلِ بوستانِ جعفری، سلالۂ دودمانِ مرتضوی و مصطفوی، میر جعفر خاں، ابنِ میر محمّد خاں، ولدِ میر سیّد محمّد قادری، نوّر اللہ مرقدہٗ، صادق تخلّص۔ جوانے بود بہ کمالِ خوبی وفصاحت وبلاغت وصلاح و تقویٰ۔ در فنِ شاعری مستعد وطالب علمِ جیّد۔ طبعش بہ غایت متیں و نظمش نہایت مبیں۔ بہارستانِ جعفری کتابے از تصنیفاتِ اوست۔ اصلش از شاہ جہان آباد است۔ برنالۂ بیرم دی درگاہِ جدّ اوست میر سیّد محمّد، مغفور مشہور ست۔ آں جا مجلس دوم ہر ماہ می شد۔ مردمِ بسیار می آمدند وقوّالان می خواندند، وصوفیاں بہ وجد می آمدند۔ از چندے شنیدہ می شود کہ بہ رحمتِ الٰہی واصل گشتہ، ہماں جا

مدفون ست - غفر اللہ لہٗ :

فصل کے شور نے عاقل سبھی دیوانہ کیے
شیخ بھی چاہیے مے آج تو رندانہ پیے

یوں پییں غیر شراب اور مثالِ نرگس
ہم رہیں دیکھتے ہی ہاتھ میں پیمانہ لیے

لوح پہ زلف کے مارے کے لکھا دیکھا تھا
موئے بھی لہر نہ گئی اے ترا کاٹا نہ جیے

دل ہے یہ یا کباب ہے کوئی
عاشقی بھی عذاب ہے کوئی

شرم سے نام تو نہیں لیتا
پر ہمارا خطاب ہے کوئی

مجھ کو قدرت بھی خدا کی نظر آتی ہے بڑی
تیری سہتے ہیں وہ باتیں کہ کسی کی نہ سہیں

ہم اگر جیتے رہے بھی تو بھلا کیا حاصل
دیکھتے ہیں کہ تری ہم سے وہ آنکھیں نہ رہیں

(۱۵۶) **صابر** تخلّص کسے گزشتہ است از سلکِ متوسّطین - سرسری می گوید -
کلامش بہ پختگی نہ رسیدہ است - از وست :

ناز اس طرح کیا کہ ادا کو نہ ہوئی خبر
جور اس طرح کیا کہ جفا کو نہ ہوئی خبر

صابر نے اپنے یار کے پاؤں پہ سر کو دھر
جی اس طرح دیا کہ قضا کو نہ ہوئی خبر

سارے عالم میں جو بڑا تھا شوخ
میری قسمت میں وہ دھرا تھا شوخ

متاخّرین

(۱۵۷) **صبر** : میر محمد علی صبر تخلّص، از سلک متاخّرین ست - بیشتر مرثیہ می گوید -
از متوسّلانِ بنی خانم صاحبہ - با وجودے کہ او ہم در فیض آباد می باشد، لیکن، بندہ
اورا نہ دیدہ، نہ اشعارش شنیدہ، گر مرثیہ - خدا اش سلامت دارد :

گو کہ دل بر نے مجھ پہ جبر کیا
میں بھی دل دے کے اُس کو صبر کیا

غمِ ہجرِ صنم میں رات دن کی بے قراری سے
نہ تھی فرصت مجھے وقتِ سحر تک آہ و زاری سے

فروتن تجھ سا کوئی اے صبر، دنیا میں نہ ہوئے گا
زمیں میں گر گیا آخر تو اپنی خاکساری سے

حرف (ض)

متوسّطین

(۱۵۸) **ضیا**: دریں فصل کسے از قدما بہ نظر نیامدہ، مگر در سلکِ متوسّطیں۔ نیّرِ آسمانِ سیادت و گوہرِ بحرِ شرافت، ذکاے وے بہ کمالِ ضیا و بہاے او در نہایت بہا، المتخلّص بہ ضیا۔ بدرے ست از سپہرِ کمال و صدرے ست از مجلسِ جلال۔ شمعے ست پرضیا و عاشقے ست باصفا۔ طبعِ عالیش بلند و دل و جانش گداز و دردمند۔ طرزِ سخنش مانا بہ طرزِ مولانا نسبتی تھانیسری۔ شعرِ پُردردش بر جگرِ عاشقاں نشتر زارے ست و براے سوختگانِ عشق شرارے ست۔ اکثر غزل در زمینِ سنگلاخ گفتن و الفاظِ نامقبول را در بندشِ مقبولِ دل ہا ساختن کارِ اوست۔ اصلش از شاہ جہان آباد، از چندے بہ طرف عظیم آباد استقامت دارند۔ پسرِ راجا شتاب رائے بہ طریقِ نذر کم و بیش خبرگیراں می باشد۔ شنیدہ ام کہ او ہم فکرِ شعر می کند، لیکن تا حال نہ شنیدہ ام۔ اکثر شاعرانِ آں دیار اصلاحِ سخن از میرِ موصوف می گیرند۔ بندہ ہم استفادۂ سخن ازاں بزرگوار حاصل نمودہ۔ استادِ فقیر مؤلّفِ کتاب ہمان ست۔ غرض کہ ہم چنیں آشناے درست در آشنائی نہ دیدہ و نہ شنیدہ۔ متواضع، مؤدّب، اہلِ دل، منصف مزاج، دردمند۔ از ہر کہ شعرِ پُردرد شنیدند محظوظ شدند و گریستند۔ دیوانش ترتیب یافتہ است۔ قصیدہ و ہجو و مثنوی و رباعی کم گفتہ۔ بیشتر غزلیات ازاں مشہور ست۔ خدا سلامت باکرامت دارد:

جمع کرکے درد سارے تو نے پیدا دل کیا ۔۔۔ کہہ تو اے دستِ قضا پھر اس سے کیا حاصل کیا
کیا مرے سے جی نکلتا جو وہ ٹک پھر دیکھتا ۔۔۔ کام آساں مجھ پہ قاتل نے مرے مشکل کیا

باؤ بھی کھائی نہ تھی دل نے کہ مرجھانے لگا / آہ یہ غنچہ تو کچھ کھلتے ہی کمھلانے لگا

قیس دیوانہ ہوا اور کوہ کن جس سے موا / عشق ہم کو بھی وہی اب کام فرمانے لگا

ایک دن وہ تھا کہ روز و شب رہے تھا پاس ہائے / اب خبر بھی بھیجنے سے ہم کو ترسانے لگا

کل کی رسوائی تجھے کیا کم نہ تھی اے ننگِ خلق / اُس کے کوچے میں ضیا تو آج پھر جانے لگا

میں نے کل پوچھا ضیا سے دل کو کیدھر کھو دیا / اُس نے کوچے کو ترے بتلا کے ٹپ دے رو دیا

دیکھیو اے دوستاں چپکا ضیا کیوں ہو گیا / مر گیا بے تاب ہو یا روتے روتے سو گیا

ضیا ہے کون کیا جانوں ترے گھر میں جو آتا تھا / کوئی حسرت سے پھر پھر دیکھا ادھر روتا جاتا تھا

برس لے ابر جتنا چاہے تو اب تیری باری ہے / کبھی دل تھا تو میں بھی رو رو اک دریا بہاتا تھا

کیوں گریباں دم بہ دم کرتا ہے اپنا چاک تو / ہاتھ سے تیرے ضیا کس گل کا دامن چھٹ گیا

آہ کرتے دہک گئے ہیں ہم / کیا شتابی بھڑک گئے ہیں ہم

آپ کو آپ میں، نہیں پاتے / آہ کیدھر بہک گئے ہیں ہم

جوں چنار اس جا نہ پھولیں ہیں نہ پھل لاتے ہیں ہم / جب مراد اپنی کو پہنچیں ہیں تو جل جاتے ہیں ہم

جیسے دو ہم درد آپس میں کریں غم خوارگی / دل ہمارا درد لے اپنے دل کا غم کھاتے ہیں ہم

جان کر زلف دل نہ دھنس اس میں / دام ہے دیکھ تو نہ پھنس اس میں

ہے قلم روِ میں حسن کی سب کچھ / اک نہیں ہے سو دادرس اس میں

دلِ نو غنچہ جھڑ پڑا افسوس / رہ گئی کھلنے کی ہوس اس میں

ہوں میں بے صبر رو نہ دو مجھ کو / کچھ کہو مت اے ناصحو مجھ کو

مجھ سا بندہ نہیں خدائی میں / ہاتھ سے اے صنم نہ کھو مجھ کو

خطِ نہ نوشتہ میں اس واسطے بھیجوں ہوں دلبر کو / کہ لکھتا شوق میں گر کچھ تو لکھتا ایک دفتر کو

پڑے برقِ تجلّی ایسی ارنی، لن ترانی پر / کہ موسیٰ ہوئے بے خود اور رہو دیدار پیمبر کو

آہستہ پانو رکھیو اے بوئے گل چمن پر / سوتے ہیں اس زمیں میں نازک دماغ کتنے

جوں گل لگائے منہ سے پھرتے تھے آگے آہا / ہوتے ہو دیکھ ہم کو اب بے دماغ کتنے

تربت ضیا کی دیکھی کل رات دور سے میں ق آئے نظر مجھے واں شمع و چراغ کتنے
جا کر جو آج دن کو دیکھا میں کر تفحّص اک دل جلے ہو اُس میں حسرت کے داغ کتنے

ایں مضمون را از میر ضیا سلّمہ اللہ شنیدہ، سلام اللہ خاں، تسلیم در فارسی ترجمہ نمودہ، بہ نامِ خود شہرت داد- ایں نہ دانست کہ در نظرِ صورت شناسانِ معانی متبنّیٰ و فرزند پوشیدہ نہ می ماند- مثلِ ہندی مشہور ست: "ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اُس کا ناؤں":

دوش رفتم بر مزارِ کشتۂ تسلیمِ خویش
می نمود از دور صد شمع و چراغِ حسرتے
چوں شدم نزدیک دیدم از تفحّص ہا بسے
یک دلے می سوخت باوے چند داغِ حسرتے

ضیا: سب اُمید اپنی کر حصول گئے اک ترے در سے ہم ملول گئے
بھول کر بھی کبھی نہ یاد کیا ہم ترے جی سے ایسے بھول گئے

نہ رکھ محروم بوسے سی ہمیں قاتل کہ مرتے ہیں جو مانگے سو اُسے دیتے ہیں جس کو قتل کرتے ہیں
پلا دے آبِ خنجر ہم کو قاتل تشنہ جاتے ہیں جو کوئی مرتا ہے اُس کے حلق میں پانی چواتے ہیں
یہ ماتم کس دوانے کا ہے یا رب آج صحرا میں کہ سیلیں روتی پھرتی ہیں بگولے خاک اُڑاتے ہیں

برعکس وضعیں آئیں اُس کے نباہنے کی شاید یہی ہے تاثیر اس دل کے چاہنے کی
جلدی ضیا خبر لے آتی ہے تجھ جگر سے آواز ناتواں سی دل کے کراہنے کی

روئیں ہم بزم موں کو کیا اپنے دلوں کے پھپھولے ہیں شمعِ محفل تھے جو کل سو راکھ کے اب ڈھیر ہیں

کل جو تو گلشن میں آ کر پھر چمن سے مڑ گیا چپکی لگ گئی بلبلوں کو رنگ گل کا اڑ گیا

ایک دو ٹکڑے ہو ناصح تو تو سیوے چاک تو پر زرے پرزرے ہے یہ سینہ کیا سیے گا خاک تو

ٹک آہ بچ نکل نہ کہیں دل تھلک پڑے یہ جام بھر رہا ہے مبادا چھلک پڑے

تیرے ضیا کا حال میں پوچھا تھا شمع سے
اک آہ اُس نے کھینچی اور آنسو ڈھلک پڑے

کسی کا نام لے کوئی عشق اپنا یاد کرتا ہے
مروں ہوں بدگمانی سے کہ شاید تجھ پہ مرتا ہے

کسی دشمن کی بھی یارب نہ گزرے شب جدائی کی
کہ جیسا اُس سے میرے وصل کا یہ دن گزرتا ہے

ضیا کیا دردِ مزمن ہے تمہارے دل میں میاں سچ کہہ
کہ جو تو بات کرتا ہے تو ٹھنڈی سانس بھرتا ہے

کیا جور کیا تعدّی جو کچھ کرو بجا ہے
بدلا ہے دل دہی کا اس کی یہی سزا ہے

برعکس حال اپنا میں کیا کہوں عزیزاں
جوں جوں اِدھر وفا ہے توں توں اُدھر جفا ہے

یہ آرزو ضیا کے دل کی بتاں خدا دے
تم اُس کو گالیاں دو اور وہ تمھیں دعا دے

دل مجھے پھر اُسی کوچے میں لیے جاتا ہے
دن کو ہے قتل جہاں رات جہاں شب خوں ہے

اک تبسم میں کیا خلق کو ساری تسخیر
مسکرانا ہے ترا یا کہ کوئی افسوں ہے

اُس گلی کا جو گرد ہوتا ہے
در بہ در شہر گرد ہوتا ہے

کون سے زخم کا کھلا ٹانکا
آج پھر دل میں درد ہوتا ہے

رسوائیوں کی اپنی مجھے کچھ ہوس نہیں
ناصح یہ کیا کروں کہ مرا دل یہ بس نہیں

نہ کھلنے کی اُمید ہے نہ بو کی آس ہے
غنچہ ہوں دل کا مجھ میں فقط داغِ یاس ہے

تم تو ہمارے پاس سے جاؤ گے کل یہ ہائے
اپنی نظر میں آج جہاں سب اداس ہے

دل تیرے پاس ہے کہ نہیں خیر ہے ضیا
کچھ اِن دنوں میاں تو بہت بے حواس ہے

ن گریاں و خاک اُڑاتا جوں ابر جوں بگولا
صحرا میں تو نے مجنوں وحشی ضیا بھی دیکھا

کبھی جا گل کو دیکھیں ہیں کبھی دیکھیں ہیں نرگس کو
خدا جانے یہ چشم اپنے پھیریں ہیں ڈھونڈتے کس کو

ہم نہ مثمر نہ ہم نہال ہوئے
اُگتے ہی ہم تو پائمال ہوئے

دل جگر اشکوں میں بہ گئے یوں ہیں تاک کر رہ گیا
جوں جدا ہو قافلے سے کوئی تھک کر رہ گیا

دل کے جلنے پر نہ کی رقت کسی نے رحم سے
خود بہ خود جل بل یہ انگارا دہک کر رہ گیا

کعبے میں چھپ رہا ہے یا دیر میں نہاں ہے
خانہ خراب جلدی تو بول اُٹھ کہاں ہے

اُس آن تھمے آنسو، جس آن کہ جی ڈوبا — تب جان سے ہم اُٹھے جب دیدۂ نم بیٹھے

رباعیِ فارسی درمدحِ امامؑ علیہ السّلام

کشّافِ حقائق ونکاتِ توحید — آں راکبِ دوشِ احمدی شاہِ شہید
خود معنیِ آیاتِ کلامِ اللّٰہی ست — تفسیرِ حسینی ست بہ قرآنِ مجید
افسوس دلاکہ غم گساراں رفتند — سیمیں بدنان وگل عذاراں رفتند
چوں بوئے گل آمدند بر باد سوار — درخاک چو قطرہاے باراں رفتند

حرف (ط)

متقدّمین

(۱۶۰) **طالب** : میرزا طالب، طالب تخلّص- از متوطّنانِ قصبہ بربند ست کہ متّصلِ اورنگ آباد واقع ست -جوانِ عالمگیری بود- ایں شعر بہ نامِ او دیدہ شد:

ہمنا کے خونِ چشم سے آلودہ کب کرے — وہ پگ جسے گرانی ہو رنگِ حنا سیتی م

حرف (ظ)

متوسّطین

(۱۶۱) **ظہور** : ظہور تخلّص - جوانِ محمّد شاہی از سلکِ متوسّطیں بود معلوم نیست کہ کجا ست :

کچھ کٹے وصل ہیں کچھ ہجر میں گریاں گزرے — کیا مری عمر کے اوقات پریشاں گزرے
چشمِ گریاں حسن سے معمور ہے — چاندنی برسات کی مشہور ہے

آہوں سے سلگوں کب تک اے شعلہ تو بھڑک اُٹھ
بجلی کی طرح مجھ پہ یک بارگی کڑک اُٹھ

تم تو غبار جان کے دامن جھٹک اُٹھے
پر میری حسرتوں کو زمیں بیچ پٹک اُٹھے

کیا کہا قاصد ضیا سنتے ہی جس کے مر گیا
بات تھی کچھ یاس کی یا ہجر کا پیغام تھا

ہر طرف زخم زخم تھا ہر سو سے داغ تھا
دل بھی ضیا ہمارا کبھی رشکِ باغ تھا

اُڑ اُڑ کے ڈھونڈ ڈھونڈ کے برباد ہو گئی
کیا جانے میری خاک کو کس کا سراغ تھا

کیا عیش و نشاط و شادمانی کرتے
کیا نازِ دنیا زِ جاودانی کرتے

گر پایہ کبھی میں اپنے ہوتا تو ہم
کیا خوب طرح سے زندگانی کرتے

(۱۵۹) **ضاحک** : مولانا میر غلام حسین، المتخلص بہ ضاحک، ابنِ میر عزیز اللہ، والدِ ایں فقیر مؤلف - از ساداتِ عالی شانِ سپہر مکاں، عالم و فاضل، ناثر و ناظم، بہ غایت فہیم، ہزل دوست، مزاح پسند، بذلہ گو و نکتہ سنج، درویش مزاج، متوکل - از سی سال ترکِ روزگار نمودہ، بہ کمالِ بے پروائی بہ سر می برند - در فہمیدہ علم موسیقی گوش شنوا و در فکرِ آورد فکرِ رسا - با وجودِ قوتِ آں علم کہ در ہجوِ مولوی ساجد بہ کار بردہ اند چوں طبائعِ سامعاں را در خورِ سخنِ بلند نہ یافتند، بہ قدرِ حوصلۂ آں ہا بہ طرفِ ہزل توسنِ قلم راندند، لیکن، زبانِ عجیب و غریب اختیار کردہ اند، کہ از آدم تا ایں دم کسے نہ گفتہ، چناں چہ ازاں جملہ یک مطلع ترقیم می نماید - مشتے نمونہ از خروارے :

یا ایہا التلانگہ کرّ و جھلانگہ
کل تو پچی پراہیہ فرّ و بکا سرہ

غزلِ ایشاں کم از چہل پنجاہ بیت نہ می باشد، و بر ہر غزل و ہزل پارۂ نثر نوشتن نیز شعارِ او شان ست - چوں گنجایش دریں پارچۂ کاغذ نہ بود، از ہزل گزشتہ بر غزل اکتفا نمود، تا زور و قوتِ ایں علم ہم مفہوم گردد - حق تعالیٰ ایشاں را ہمیشہ بر سرِ ما خوش و خرم سلامت با کرامت نگہ دارد، و لہ :

در پیش اگر روز اجل آہ نہ ہوتا
قصہ تھا محبت کا یہ کوتاہ نہ ہوتا

کیا دیجیے اصلاح خدائی کو ولیکن
کافی تھا ترا حسن اگر ماہ نہ ہوتا

حرف (ع)

متقدّمین

(۱۶۲) **عزیز اللہ**: عزیز اللہ دکنی از اورنگ آباد ست۔ یک غزلے گفتہ است کہ نامِ ہمہ اولیا را در وے درج نمودہ مقطع آں بہ یاد بود، قلمی می نماید:

مجھ ناتواں میں کیا سکت جو بولوں اولیاں کی صفت عاجز عزیز اللہ پر دکھن کے سب پیراں مدد ن

(۱۶۳) **عطا**: خواجہ عطار اللہ، عطا تخلص۔ شخصے در عہدِ عالم گیر بود۔ اوباش وضع، موافقِ طورِ خود شعرِ بلند می گفت، ہندی و فارسی ہر دو۔ نقل ست کہ بادشاہِ دیں پناہ ایں را بنا بر گناہے گرفتہ حبس نمودہ بود۔ روزے بہ حسبِ اتفاق بادشاہِ عالی جاہ مصرعے موزوں کرد از کسے پیش مصرعِ او خوب بہم نہ می رسید۔ ایں سخن قال قال بہ گوشِ عطا رسید، گفت اگر مرا خلاص نمایند می گویم۔ چناں چہ پیشِ ملک بہ ایں وسیلہ بر دند، بادشاہ فرمود کہ مصرعِ ما ایں ست:

"بسترم خاک و خشت بالین ست"

عطا گفت "قربانت شوم" یکے از سر گزشتِ من این ست"

باوجودِ ایں فکرِ عمدہ طرزِ خود را چنیں مقرر کردہ بود۔ خدا یش بیامرزد۔ از وست:

اے در نبردِ حسن تو گٹّی پچھاڑ چشم
زیرِ مژہ نہفتہ چو آہو پچھاڑ چشم

بر فلک شب نمی تپد انجم — دلِ رستم ز سہم می دھڑکد
دست و پا می زند عدو در رن — ہم چو پدڑی کہ در قفس پھڑکد

متوسّطین

(۱۶۴) **عارف**: محمّد عارف المتخلّص بہ عارف اکبرآبادی ست - متّصلِ دہلی دروازہ شاہ جہان آباد دکان دارد - رفوگر ست - حالا سنِ او قریبِ ہفتاد رسیدہ باشد - از ایہام بندان ست - اکثر شعرائے ہم مشربِ او اورا بہ استادی ستودہ اند - از بس کہ بسیار کم می گوید، خوب می گوید - سلامت باشد:

دخترِ رز سے کہہ کہ اُس سے ملے ورنہ عارف افیم کھائے گا نم
ہزاروں معنیِ باریک آئیں دل میں اے عارف اگر زلفِ سیہ کا پیچ اُس کے منہ پہ کھل جائے نم
جنوں کی قطع اب پوشاک کیجے بہار آئی گریباں چاک کیجے

(۱۶۵) **عاجز**: عاجز تخلّص، در عہدِ فردوس آرام گاہ، از شاگردانِ میاں کمترین بود - از وست:

دل لعل مارے لیے جاتے ہیں سب مکتب کے طفل شیخ سعدی تم بھی اپنی لے گلستاں دوڑیو ن

(۱۶۶) **عزلت**: سیّد عبدالواسع، عزلت تخلّص، متوطّنِ سورت، ولدِ سیّد سعداللہ، قدّس سرّہٗ - درویش وضع، عالم و فاضل، متوکّل - فارسی ہم می گفت، لیکن مائلِ ریختہ بسیار بود - در وقتِ محمّد شاہ تازہ واردِ ہندوستان بود - بہرۂ از دردمندی داشت:

نخلِ اُمّیدِ بے وفاؤں سے جی سلامت رہے تو پھل پایا نم
چینِ ابروے بتاں سے مراجی الجھا ہے دل کھُلے گر کبھو دونوں میں گرہ پڑ جائے ن
دل ہیں رندوں کے پھپھولا ہوا عمّامۂ شیخ یارب اس بزم سے یہ زہر کا ملکڑا جائے نم
نہ بوجھو ہو کے کیفیِ چشم پہ سرمے نے گھیری ہے گریباں گیرِ ظالم بے سخن فریاد میری ہے ن
بہ جز رفاقتِ تنہائی آسرا نہ رہا سوائے بے کسی اب اور آشنا نہ رہا نم

(۱۶۷) **عاقل** : رائے سکھ رام، عاقل تخلّص، متوطنِ پنجاب - طبعِ موزوں داشت، گاہ گاہے فکری می کرد :

جب مرا بس نہ چلا میں نے خدا کو سونپا
نہ بس اپنے سے گیا اُس کو میں رخصت عاقل

(۱۶۸) **عزیز** : شاعرِ زباں داں، منشی خوش بیاں، غنچۂ باغ تمیز، رائے بھکاری داس، المتخلّص بہ عزیز - سیلِ طبعش رواں، و توسنِ خامہ اش دواں - مردے ست سیہ فام و جسیم، مشّاقِ قدیم، از شاگردانِ خواجہ میر، درد - مولدش شاہ جہان آباد، از مدّتے در الہ آباد بہ سر می برد - سلامت باشد :

ساتھ لے نکلے ہی جی آہِ جگر آخرِ شب
شمع ہو بزم سے سرگرمِ سفر آخرِ شب

دل پہ غفلت نے کیا پیری میں اِس طرح ہجوم
نیند جس طرح کرے آنکھوں میں گھر آخرِ شب

ملیں کیوں کر بھلا اُس شوخ طفلِ لااُبالی سے
کہ سوتے سوتے جو چونکے ہی تصویرِ نہالی سے

دلِ بے معرفت سے خار پہلو بیچ بہتر تھا
بغل میں کاش ہوتا سنگ اِس مینائے خالی سے

دن تو گزرے ہی اشک باری کرتے
اور رات تمام آہ و زاری کرتے

گر روزِ فراق ہم کو ہوتا معلوم
واللہ کہ ہم نہ تجھ سے یاری کرتے

کرے نہ یار اگر دل کو صاف کینے سے
عزیز موت بھلی پھر تو ایسے جینے سے

(۱۶۹) **عسکر علی خاں** : عسکر علی خاں شخصے بود عمدہ روزگار، بہ طرفِ بنگالہ - طبع موزوں داشت :

آبرو کیوں کے رہے گی مری ہم چشموں میں
روتے روتے نہ رہا نام کو نم چشموں میں

(۱۷۰) **عاجز** : غازی الدّین خاں، عاجز تخلّص - شخصے بود در عہدِ فردوس آرام گاہ - اکثر در بحرِ کبت و دوہرا ریختہ می گفت - چند اشعارِ او دیدہ شدہ، چوں دریں بحر خوش نما نہ بود، بہ نگارشش نیا ورد -

متأخّرین

(۱۷۱) **عماد الملک** : نوّاب معلّی القاب، غازی الدّین خاں، عماد الملک۔ کتابِ جامعِ طبعش صحیح، و بیانِ معنیش ملیح۔ دستگاہِ فضلش وافی و شرابِ نظمش شافی۔ والی صدر، عالی قدر، بر جمیعِ علوم قادر، در فنونِ سخن ماہر۔ از وزرائے ہندوستاں در عہدِ خود بودہ، الحال، سروکار بہ ایں عہدہ نہ دارد۔ ہفت قلم و ہفت زبان ست۔ اشعارش بہ ایں سبب اشتہار نہ یافتہ کہ شعرہائے خود را سر بہ مُہر گزاشتہ، و بہ کسے ارزانی نہ فرمودہ، نظر بران ست کہ در شعر پست و بلندمی باشد، منتخب نمودہ اشتہار باید داد۔ سوائے ایں چند بیت بہ گوش نہ خوردہ۔ از وست:

دل گرمیِ نگاہ سے بے تاب ہو گیا — جب تک اُسے میں تھاموں جگر آب ہو گیا

زلف کا کھولنا بہانہ تھا — مدّعا ہم سے منہ چھپانا تھا

بس اب اِس سے مت زیادہ ہمیں دادخواہ کیجو — تجھے اپنی ہی قسم ہے ٹک اِدھر نگاہ کیجو

ٹک اِدھر دیکھ سجن ہم بھی توجہ رکھتے ہیں — گو کہ ظاہر میں ہم اب دستِ تہی رکھتے ہیں

(۱۷۲) **عظیم** : صاحبِ طبع سلیم و ذہن مستقیم، محمّد عظیم، متخلّص بہ عظیم مردے ست شاعر، درویش کیش ظاہر۔ حسنِ بیانش از کلامش پیدا، بر سادہ عذاراں شیدا۔ از شاگردانِ میرزا رفیع، سودا سلّمہ اللہ۔ مدّتے در فرخ آباد بہ لباسِ درویشی بہ سر بردہ، الحال، شنیدہ ام کہ در شاہ جہان آباد ست بہ طورے کہ پیش از درویشی داشت۔ غرض کہ بہ ہر رنگے کہ باشد خوش باشد:

اس قدر پتھر نے کب پایا تھا یارو رنگ سرخ — کوہ کن کے خون کی دولت ہوا ہے سنگ سرخ

آ کر ہماری خاک پہ کیا یار کر چلے — خوابِ عدم سے فتنے کو بیدار کر چلے

کیا سحر تھا نہ جانوں کہ گلشن میں آن کر — بلبل کو گل کی شکل سے بیزار کر چلے

خواہی پیالہ خواہ سبو کر ہمیں کلال ہم اپنی خاک پر تجھے مختار کر چلے

(۱۷۳) **عاشق** : خانِ مہرباں، علی اعظم خاں، عاشق تخلص، از مریدانِ مرزا گھسیٹا، عشق تخلص۔ برادرِ بزرگِ میاں محترم خان ست کہ محترم تخلص دارد۔ در اوائل فکرِ سخن کم کم می کرد۔ از چندے ترکِ دنیا نمودہ، مشغولِ دریادِ الٰہی ست۔ سلامت باشد:

شمع کی طرح کون رو جانے جس کے دل کو لگی ہو سو جانے

روز و شب یار سے ملا کیجے چین اس پر نہ ہو تو کیا کیجے

جتنے جور و ستم ہوں تو کر دیکھ یہ نہ ہوگا کہ کچھ گلہ کیجے

(۱۷۴) **میرزا عسکری** : میرزا عسکری، شخصے ست در مرشد آباد از یارانِ شاہ قدرت اللہ، قدرت۔ یک مطلع از و بہ گوش خوردہ:

بات اب امتحان پر آئی قصّہ کوتاہ جان پر آئی

اے اشک تو اس کوچے میں اب مجھ کو ڈبا دے چاہے ہے صبا یہ کہ مری خاک اڑا دے

(۱۷۵) **عشق** : خورشیدِ سپہرِ حال و سپہرِ خورشیدِ کمال، مالکِ کنوزِ دقائق دکاشفِ رموزِ حقائق، کلامش بہ مذاقِ تصوّف آشنا، و نورِ صفائے باطنش چوں آئینۂ صبح دل کشا، درعینِ صفا۔ عارفِ صاحب کمال و درویشِ بے مثال، عرف مرزا گھسیٹا، المتخلص بہ عشق۔ مردِ صوفی ست کہ خیلِ مریدان و معتقداں حلقۂ غلامی دارند۔ در سلسلہ نقش بندیہ نقش زدہ۔ اصلش از شاہ جہان آباد ست۔ پیشتر نوکری پیشہ بود، الحال، از مدّتے ترکِ روزگار نمودہ، بہ عظیم آباد مقیم ست۔ میرزا فدوی از شاگردان و معتقدانِ او ست۔ شعرِ عارفانہ در کلامش بسیار ست۔ گاہے در ذوق و شوق یا بہ عالمِ وجد دو سہ شعر می فرماید۔ دام افضالہ، سرِ دیواں:

آہِ جاں سوز کو بسم اللہِ دیوان کیا عشق نے دیکھتے ہو پہلے ہی طوفان کیا

کہنے کو ادھر اُدھر گئے ہم
تھے تیری طرف جدھر گئے ہم

تا جان نہ ہو عدو دل جسکی
تو نے کہا مر تو مر گئے ہم

تھا کعبہ و دیر سے کسے کام
مقصود تھا وہ جدھر گئے ہم

جز عشق نہ سمجھے کفر و دیں کو
طرفین سے بے خبر گئے ہم

تصرّف چشم کا گر میں دکھاؤں
تو اک پل میں ابھی طوفاں اٹھاؤں

یہ ہر دم بلبلا سا پھوٹتا ہے
کہاں تک شیشۂ دل کو بناؤں

خانماں کر چکا ہوں میں برباد
اِس پہ وہ میرے گھر نہیں آتا

خاک جو شہر میں لگی اُڑنے
عشق کیا چشم تر نہیں آتا

نے دودِ دل ہے باقی نے آہ و نہ فغاں ہے
اے سوزِ عشق سچ کہہ تو اِن دنوں کہاں ہے

رونقِ بوستان کیا کیجے
تو نہ ہو تو یہ جان کیا کیجے

ڈر سے اُس کے زبان پہ حرف نہیں
تس پہ ہے بدگمان کیا کیجے

بے نشانی ہے یار کو منظور
عشق نام و نشان کیا کیجے

حرم میں نام سنا دیر میں نشاں دیکھا
سوائے تیرے نہ دیکھا غرض جہاں دیکھا

آسی کا آئینہ ہژدہ ہزار عالم ہے
دوانے کیا کہوں تجھ سے کہاں کہاں دیکھا

نہ عزمِ وادیِ ایمن نہ طور کا ہے قصد
جو کچھ کہ دیکھنا تھا دل میں سب عیاں دیکھا

دل سا جگر جو رکھے سو اُس سے دوبدو ہو
منہ دیکھو آئینے کا جو اُس کے روبرو ہو

کیا کیا جفائیں ظالم میں نے تری سہی ہیں
تس پر شکایتوں سے لب آشنا نہیں ہیں

کہ بعدِ قتل مجھکو کس طرح چین آئے
جو حسرتیں تھیں دل کی سو جوں کی توں رہی ہیں

اوروں کا جگر یار جو تیروں سے سیے ہے
یہ عاشقِ جاں باختہ کس دن کے لیے ہے

زلف نے جس کے تئیں دکھائی شام
دوسری پھر اُسے نہ آئی شام

کعبے میں بہت خاک اُڑائی ہم نے
بت خانے میں صورت بھی نہ پائی ہم نے

آخر کو کہا عشق نے ہم سے کچھ اور -- دیکھا تو یوہیں عمر گنوائی ہم نے
پہلے پی زاہد کسی عاشق کے دل سے مِل کے مُل فی الحقیقت تب نظر آئیں یہ شتِ گِل کے گُل

حرف (غ)

متقدّمین

(۱۷۶) **غوثی** : غوثی تخلّص، محمّد غوث خلفِ مولٰنا قطب الدین گجراتی، قاضیِ حیدر آباد، صاحبِ حال و قال بود۔ گاہ گاہے بہ مقتضاے موزونیِ طبع دو سہ ریختہ می فرمود۔ آخر بہ زیارتِ حرمین رفت ہماں جا جاں بہ جاں آفریں سپرد۔ غفر اللہ لہٗ :

م تیغ بھواں سے کِن کہا گھایل نکو کرو پلکان کے یا خنجر سیتی بسمل نکو کرو

(۱۷۷) **غوّاصی** : غوّاصی تخلّص در وقتِ جہاں گیر بادشاہ بود۔ طوطی نامۂ نخشبی را نظم نمودہ است بہ زبانِ قدیم، نصفے فارسی و نصفے ہندی، بہ طورِ بکٹ کہانی۔ سرسری دیدہ بودم۔ شعرِ آں نظم بہ یاد نیست۔

متوسّطین

(۱۷۸) **غریب** : کلّو، غریب تخلّص۔ در سلکِ متوسّطیں بود، معاصرِ میاں آبرو۔ طبعِ معقولے داشت۔ از وہمیں یک غزل مشہور است۔ غفر اللہ لہٗ :

دیکھ دستارِ بسنتی ساقیِ سرشار کی کھل گئی ہیں آج انکھیاں نرگسِ بیمار کی
بات رہ جائے گی قاصد وقت رہنے کا نہیں دل تڑپتا ہے شتابی لا خبر دل دار کی
اے دل اُس نا مہرباں کی مہربانی پر نہ بھول جی کا دشمن ہے جو وہ کرتا ہے باتیں پیار کی

بھول سب جاتا ہی باتیں دیکھ صورت یار کی حال کہنے کا کبھی جو وقت پاتا ہی غریب

(۱۷۹) **غریب** : میر تقی، غریب تخلص دیگر، در سلکِ متوسطین بود، احوالش معلوم نیست - از وست :

آلہی مت کسی کے پیش دردِ انتظار آئے ہمارا دیکھیے کیا حال ہو جب تک بہار آئے ۴

متاخّرین

(۱۸۰) **غریب** : محمّد اماں خاں، غریب تخلص در سلکِ متاخّرین در شاہجہان آباد در وقتِ احمد شاہ بود - بہ طرف بنگالہ رفت - از وست :

ن حسرتِ چمن کی کھانے کو یہ باغ ہی غریب میری بغل میں جو دلِ پر داغ ہی غریب

(۱۸۱) **غلامی** : غلامی تخلص، در شاہ جہاں آباد بود، از قوم اراذل بہ پیشۂ خبرداری نوکری داشت، لیکن در فنِ شعر بہ کمالِ بے خبری بہ سر برد، مگر طبعِ موزونے داشت - از وست :

دلِ زخمی پہ لگاتی ہیں ٹکورے انکھیاں سرخ لاتی ہیں نشے بیچ جو ڈورے انکھیاں

حرف (ف)

متقدّمین

(۱۸۲) **فخری** : فخری تخلص از مردمِ دکن بود، شاگردِ ولی غفر اللہ لہ :

نم ہر گز کہیں دیکھا ہی نظر بھر کر آفتاب جب دیکھوں میں تجھے تو چکا چوند لگ رہے

(۱۸۳) **فراقی** : فراقی تخلص از مردمِ دکن بود، ہم راہِ فقیر اللہ آزاد بہ ہند

آمدہ بود۔ از وست:

م فراقی کشتہ ہوں اُس آن کا جس دم کہ وہ ظالم — کمر سے کھینچتا خنجر چڑھاتا آستیں آئے

(۱۸۴) **فضلی**: افضل الدین خاں، فضلی تخلص۔ در زمانِ خود از خوش گویاں بودہ۔ یک مثنوی در تعریفِ شاہ زادہ قریبِ پانصد بیت بسیار بہ آب و تاب گفتہ، خدا اشیں بیامرزد۔ ایں بیت ازاں مشہور ست:

م عرق منہ پہ جوں آرسی میں حباب — تبسم لباں پر جوں موجِ شراب

م زنخ جوں مربّاد سے سیو کا — پہ واں ہاتھ کب پڑ سکے دیو کا

متوسّطین

(۱۸۵) **فراق**: میرزا مرتضیٰ قلی بیگ، فراق تخلص۔ از ملازمانِ توپ خانۂ بادشاہی بود۔ اکثر شعر بہ فرس می گفت، گاہ گاہے ریختہ ہم بہ ندرت موزوں می کرد۔ شاعرے خوب بود۔ از وست۔ غفر اللہ لہٗ:

م تماشا اِس چمن کا کس کے دل کو شاد کرتا ہے — کہ یاں یک لب تبسم غنچے کو برباد کرتا ہے

م اسیروں کی قسم تجھ کو صبا بیچ کہ گلشن میں — کوئی اُن ہم نواؤں سے ہمیں بھی یاد کرتا ہے

(۱۸۶) **فقیر**: میر شمس الدین، فقیر تخلص، احوالِ ایں بزرگوار در تذکرۂ فارسی مسطور ست۔ شاعرِ زبردست بود، دو سہ ریختہ ہم ازاں بزرگ مشہور ست۔ دریں ولا بہ طرفِ کربلاے معلّٰی تشریف بردہ بود، ہماں جا بہ جوارِ رحمتِ ایزدی پیوست۔ رحمۃ اللہ:

م ترا منہ دیکھ بلبل گل سیتی بے زار ہو جائے — اگر گل تجھ تلک پہنچے گلے کا ہار ہو جائے

م زندگی موجِ آب ہے گویا — دم کا آنا حباب ہے گویا

م خال تیری بیاضِ گردن پر — نقطۂ انتخاب ہے گویا

(۱۸۷) **فدوی** : محمد محسن، فدوی تخلص از شرفاے شاہ جہان آباد ست، در علمِ موسیقی و ستار نوازی شہرتے دارد، گاہ گاہے فکرِ ریختہ ہم می کند۔ جوانِ محمد شاہی ست تا حال زندہ است، حق تعالیٰ سلامتش دارد۔ از دست :

م ایک ملنا غیر کا تو چھوڑ سکتا نہیں سجن — دیکھ تو عاشق نے تیرے واسطے کیا کیا تجا
طلب میں یار کی رہنا ارادت اس کو کہتے ہیں — پھر اس میں گو اذیت ہو سعادت اس کو کہتے ہیں

(۱۸۸) **فدا** : میر امام الدین، فدا تخلص۔ از سلکِ متوسلین بود، الحال معلوم نیست کہ کجاست۔ سلامت باشد۔ از دست :

یہ چاہتی ہیں کہ لیں دل مرا تری باتیں — مری نظر میں ہیں سب دل ربا تری باتیں
تو بات بات میں ہوتا ہے مجھ سے آزردہ — یہی تو کچھ نہیں اے بے وفا، تری باتیں

(۱۸۹) **فغاں** : از ہنگامہ آرایانِ زماں و ظرفاے دوراں، خوش طبع و شیریں بیاں، اشرف علی خاں، المتخلص بہ فغاں، کوکۂ احمد شاہ، بادشاہِ غفران پناہ۔ خانِ ظریف طبع و خوش اختلاط بود، با ہر کس خوش طبعی داشت۔ شاعرِ مربوط بہ طورِ خود بود۔ لطائف و ظرائف او مشہور ست۔ از مدتے بہ طرفِ عظیم آباد پیشِ راجا شتاب رائے بہ سر می برد، از چندے جاں بہ جاں آفریں سپرد۔ دیوانِ فارسی ہم ترتیب دادہ است۔ خدایش بیامرزد۔ از وست :

صنم بنا تو خدائی میں تجھ کو کیا نہ ہوا — ہزار شکر کہ تو بت ہوا، خدا نہ ہوا
زخمِ دل تو سیا نہیں جاتا — بن سیے بھی جیا نہیں جاتا
اے فغاں دیکھنا سمجھ لینا — دے کے دل پھر لیا نہیں جاتا
ایسی نگاہ کی کہ مرا جی نکل گیا — جھگڑا مٹا عذاب سے چھوٹے خلل گیا
جب گلشنِ بہار کو رنگ خزاں نہ تھا — مشفق ہمارے حال پہ تو مہرباں نہ تھا
دل بستگی قفس سے یہاں تک ہوئی مجھے — گویا کبھی چمن میں مرا آشیاں نہ تھا

یہ امتحاں نہ کر ای میرے مہربان عزیز — جہاں میں کوئی تجھ سے رکھے گا جان عزیز
ملے ہی غیر سے ہرگز اُسے حجاب نہیں — کہوں تو کہ نہیں سکتا، رہوں تو تاب نہیں
خراب دیکھ کہے گا مری خرابی کو — ہزار حیف کہ وہ خانماں خراب نہیں
عاجز ہوں تیرے ہاتھ سے کیا کام کروں میں — کر چاک گریباں تجھے بدنام کروں میں

اس قدر طاقت نہیں جو بال و پر بھی وا کروں
کس گرفتاری میں آیا ہوں، الٰہی کیا کروں

تقویت ہی داغ سے میرے دلِ بیمار کو — ای فلاطوں، کہ تو کیا کہتے ہیں اس آزار کو
چھوڑ کر مجھ کو کہاں جاتا ہی، ای خانہ خراب — سونپتا ہی کیا مرے سر سے درد دیوار کو
ہم نے شبِ فراق میں سنتا ہی ای فغاں — ق کیا خاک ہو کے حسرتیں دل کی نکالیاں
یہ تھا خیال خواب میں دیکھیں گے روزِ وصل — آنکھیں جو کھل گئیں وہی راتیں تھیں کالیاں

نکالا خط ہمیں پیغام کیا ہو — اب اس آغاز کا انجام کیا ہو
نہ الفت نہ محبت نہ مروّت — تری خاطر کوئی بدنام کیا ہو
ہمیشہ ہجر میں کہتا رہا یہ — ق جدائی میں مجھے آرام کیا ہو
ہوا جو وصل تو دھڑکا رہا یہ — الٰہی صبح کیا ہو شام کیا ہو

مت کوئی روشن کرو مجنوں کی تربت پر چراغ
روح جل جائے گی دیوانے کی پروانے کے ساتھ

صنم کہنے سے کب خوش ہی وہ کافر — خدائی کا تصوّر بندھ رہا ہی
فغاں کو وصل میں آرام کیا ہو — جدائی کا تصوّر بندھ رہا ہی

نہ ای قاصد، بیں رو رو یار کی فریاد کرتا ہوں
ترے دیکھے سے میں اپنے لکھے کو یاد کرتا ہوں

گر کوئی مارا پڑے تیری بلا سے کیا تجھے — بلکہ خوش آتا ہی ای ظالم یہی چرچا تجھے

یہ دل ترے وصال کا مذکور کیا کرے — مقدور جب نہ ہوئے تو مجبور کیا کرے

ترے فراق میں کیوں کر یہ دردناک جیے — مرے تو مر نہیں سکتا جیے تو خاک جیے

م کہتے ہیں فصلِ گل تو چمن سے گزر گئی — اے عندلیب تو نہ قفس بیچ مر گئی

مجھ سے جو پوچھتے ہو بہ ہر حال شکر ہے — یوں بھی گزر گئی مری ووں بھی گزر گئی

نم شکوہ تو کیوں کرے ہے مرے اشکِ سرخ کا — تیری کب آستیں مرے لوہو سے بھر گئی

ایں شعر را میرزا رفیع، سودا سلمہ اللہ در قطعۂ تضمین نمودہ است۔

تنہا اگر میں یار کو پاؤں تو یوں کہوں — ق انصاف کو نہ چھوڑ مروت اگر گئی

آخر فغاں وہی ہے اُسے کیوں بھلا دیا — وہ کیا ہوئے تپاک وہ الفت کدھر گئی

اثر کرتی نہیں اُس بت کے دل میں آہ کیا کیجے — عجب حالت ہے میری اے مرے اللہ کیا کیجے

مجھ دلِ ناشاد کو ہر وقت غم سے کام ہے — کیا خوشی یارو زمانے میں کسی کا نام ہے

کٹ گئی ساری عمر غفلت میں — کچھ تری بندگی ادا نہ ہوئی

عکس میرا شبِ ہجراں میں تماشائی ہے — ایک میں آپ ہوں اور گوشۂ تنہائی ہے

میں تو وہ ہوں کہ مرے لاکھ خریدار ہیں اب — لیکن اس دل سے میں ڈرتا ہوں کہ سودائی ہے

دل زلف میں اُلجھے مجھے آرام یہی ہے — میں صیدِ بلاکش ہوں مرا کام یہی ہے

صیاد اور صید کی مت کر ہوس ابھی — معمورِ مشتِ پر سے ہے کنجِ قفس ابھی

نالاں نہ ہو تو یار کے شکوے سے باز آ — سُن پائے گا فغاں کوئی فریاد رس ابھی

کٹیں تجھ یاد میں اس طرح راتیں ہجر کی بڑیاں — لکیریں اُنگلیوں کی مٹ گئیں گنتے ہوئے گھڑیاں م

اشکوں نے لے سفینۂ اُلفت ڈبو دیا — کچھ بس نہ چل سکا تو مری جان رو دیا

اُس کے وصال و ہجر میں یوں ہیں گزر گئی — دیکھا تو ہنس دیا جو نہ دیکھا تو رو دیا

ہجو یک اکول خوب کردہ است کہ مطلعش این ست:

ایک شخص آشنا ہمارے ہیں — نہ ہمارے نہ وہ تمھارے ہیں

دل ہے وہ آشنا ہیں کھانے کے　　متلاشی ہیں آب و دانے کے

(۱۹۰) **فرّخ** : میر فرّخ علی، فرّخ تخلّص، از سادات اٹاوہ است طبع رسائے دارد، ریختہ و فارسی ہر دو می گوید:

اِس قدر رکھیوں مجھ سے ہوائے مہ وشاں نا آشنا　　میں بھی تو آخر کسی دن تھا تمہارا آشنا م

گو ہوا شیریں تجھے خسرو کی دولت جاہ و مال　　پر کہیں ہوتا ہے پیدا کوہ کن سا آشنا م

چشم سے نور گیا، تن سے تواں، جی سے صبر　　عشق میں تیرے ہوا مجھ سے جدا کیا کیا کچھ م

(۱۹۱) **فضائل علی خاں، بے قید** : از موزونانِ جہاں، فضائل علی خاں، بے قید تخلص جوانِ محمد شاہی بود۔ خوش خوراک و خوش پوشاک، بہ کمالِ خوبی بہ سر می برد۔ در شعبدہ بازی و صحبت داری کامل بود۔ طبعِ دردمند داشت۔ مثنویِ او بسیار مشہور است۔ با یکے از بتانِ ہند تعشق پیدا کردہ بود۔ از گردشِ روزگار ہم راہ نوّاب عمدۃ الملک بہ الٰہ آباد رفت از فراقِ محبوب چوں ماہیِ بے آب و آہوانِ بے صحرا می تپید و وحشت می نمود۔ روزے از برائے دل بریِ او نوّاب موصوف جمعے از اہلِ نشاط جمع نمودہ بہ آں طوائف اشارہ کرد کہ ایں را از نازِ دل ربایانہ بہ دام آرید، شاید کہ دلِ ایں عزیز واشود و اندوہ و غم فراموش کند۔ غرض از آں جمعے یک نازنیں آمدہ ایشاں را بہ ہزار فریب و عشوہ رام کرد۔ دراں مقدمہ حسبِ حالِ خود مثنوی گفتہ و بسے دُرہائے معانی در و سفتہ، لیکن، تماشا دراں جاست کہ چوں ایشاں کامِ دل حاصل نمودہ، بر سرِ زانوے آں پری رو، سر گراں شدند و بہ خواب رفتند، در خواب محبوبۂ اوّلینِ خود را دیدند کہ چنیں می گوید:

(از مثنوی)

عجب خواب دیکھا میں اُس خواب میں　　ہوا جس سے میں پیچ اور تاب میں

ہوا تھا جنھوں سے میں اوّل جدا | سو گیا دیکھتا ہوں وہی دل ربا
کہ جو چاہتی تھی مجھے دل سیتی | جدا بھی ہوا تھا میں مشکل سیتی
سو کہتی ہے یوں میرا دامن پکڑ | کہ چھوٹے ترے غم سے میرا جگر
شب و روز رونا مرا کام ہے | ترے نام لینے سے آرام ہے
پھرے میرے یوسف تو کس کی گلی | تری چاہ میں میں ہوئی باؤلی
یہاں تو جو چاہے سو کر میرے ساتھ | قیامت کو دامن ترا میرے ہاتھ

چوں از خواب بیدار شد کسے گفت کہ کسے در تلاشِ صاحب ست۔ پس بیروں آمد، قاصدے دید کہ نامہ در دست داشت۔ چوں نامہ را دید، معلوم گرد کہ ازاں محبوبہ است۔ بیانِ آں نامہ چنیں نظم نمودہ :

جو دیکھا لفافے پہ لکھا ہے یہ | کہ کھولو شتابی برہ کی گرہ
لکھا بعدِ یا جامع الفارقین | سلامت رہو قاتل الشاہدین
تمھاری خوشی سے یہاں خیر ہے | سدا ہجر کے باغ کی سیر ہے
بہت پھول لالا دکھائے مجھے | ترے داغ سے کچھ نہ بھائے مجھے
سدا غم کی چوپڑ بچھا کر نحیف | برہ کو میں کرتی ہوں اپنا حریف
سو کچّے ہی پڑتے ہیں ہر حال میں | کئی جگ گئے بیت اِس حال میں
نہ پوچھی جو تم اب تلک میری سار | تو جیتی ہوں میں اپنی قسمت سے ہار
کہو کون ہے وہ جواہر مثال | بسے کس کے ہیرے میں اے میرے لال
جو تم آکے دیکھو برہ کی قماش | کہ سر جنگ کیا کیا دیے کر تلاش
جو دیکھا تھا تم رنگ سرخ و سفید | مرے تاجِ سر اب نہ رکھیو امید
دو بھویں کہ شمشیر جن کی غلام | برہ کو نہڑ کر کریں ہیں سلام
مرے من ہرن بوجھ کر جی کی بات | کرو شاخِ آہو او پر مت برات

جو ہارا ہو پھر غم اُسے دیجیے — جو ماندہ ہو برہم اُسے کیجیے
کروں کیا نکلتی نہیں جان ہے — کہ یہ میری غلطی کا تاوان ہے
زیادہ نہیں اس سے کچھ مُدّعا — یہی مُدعا تھا لکھا والدعا

قریبِ پانصد بیت گفتہ است، لیکن در اوّل خوب ست کہ غمزہ و اداہائے زناں نے بیانِ حسنِ آں ہا کردہ، و چوں آخر احوالِ دیوانگیِ خود آوردہ، در حالتِ دیوانگی پریشاں گفتہ۔ از اشعارِ او ہمیں یک شعر بہ گوش خوردہ۔ دریں حروفِ فا کہ آوردہ ام قیدِ نامِ ایشاں کردہ شد، والا نہ، از روئے تخلص در حروفِ با می بایست، سہو شدہ۔ از وست:

گرہ میں ایک دل رکھتے تھے آج اُس کو بھی رو بیٹھے — ہوا تھا زلف سے سودا پر آنکھوں نے بہا ڈالا

غرض نسخہ خوب بود۔ خدا ایش بیامرزد۔

(۱۹۲) فدوی : فدوی لاہوری۔ مردے بود بر خود غلط۔ برائے مباحثہ و مجادلہ بہ فرخ آباد پیشِ میرزا رفیع سلّمہ اللہ آمدہ ہنگامہ برپا نمود۔ بعد از ذلتِ بسیار بہ وطنِ خود برگشت۔ یوسف و زلیخا بہ زبانِ ریختہ گفتہ بود، و بہ ہمہ عالم می نمود، ہر کسے کہ از و لطف بر می داشت از و محظوظ می شد۔ حالا معلوم نیست کہ زندہ است یا مردہ۔ از وست:

مژہ کی نوک سینے میں نگاہِ یار لے ڈوبی
کہ جیسے بھال تودے میں سری یک بار لے ڈوبی

نہ پوچھو رنگ منہدی کا کفِ قاتل پہ اے یارو
کسی کے خوں میں اُس کے ہاتھ کو تلوار لے ڈوبی

میر فتح علی، شیدا ہجوِ او خوب کردہ است۔ قصۂ بقّال و بوم حسبِ حالِ او درج نمودہ است۔

متاخّرین

(۱۹۳) فرحت : محمّد فرحت اللہ، المتخلّص بہ فرحت، سلّمہ اللہ قاضی زادۂ

مرشد آباد، نبیرۂ شاہ مدار ست۔ رطب و یابس بسیار دارد، ازاں جملہ ایں چند بیت ترقیم می نماید۔ از وست :

نہ ایک عرش پہ تنہا ظہور ہی تیرا
نگاہ کیجیے جیدھر کو نور ہی تیرا
قدم شمردہ رکھوں کیوں نہ خار دشت اوپر
مری نگاہ کو پاسِ حضور ہی تیرا

زندگی میں تو رہے صدمے دلِ غمناک پر
بعد میرے دیکھیے کیا ہو قیامت خاک پر

چمن میں باتیں اُس غنچہ دہن کی جس گھڑی چلیاں
خجالت سے جھکا کر منہ کو اپنے رہ گئیں کلیاں
جفائے دل براں کا کیوں گلہ کرتا ہی عاشق ہو
نہیں لگتی ہیں فرحت مجھ کو یہ باتیں تری بھلیاں

ہر گھڑی جی میں مرے جلوۂ قدوسی ہی
طور سینہ ہی مرا اور یہ جی موسی ہی
آہ یہ کون سی ہی راہ کہ در پیش نظر
ہر قدم منزلِ مقصود سے مایوسی ہی
اور کو کیوں کے میں چاہوں کہ سوا تیرے خیال
روز و شب دل میں مرے دربے جاسوسی ہی

اِس چشم سے کب ابرِ تنک مایہ بر آئے
دریا کے تئیں موج سے جس کی حذر آئے
دل چھوڑ کے تجھ کو تو کہاں آئے مری پاس
پر اُس کے کچھ احوال کی مجھ تک خبر آئے

رباعی فخریہ بر حسب و نسبِ خود گفتہ :

اک عمر ہوئی ہی کہ نہیں یہ سوتا
مدت سے بہت غم میں رہے ہی روتا
ظالم تو دعائے بد سے اُس کی ڈرنا
ہی شاہِ مدار کا یہ فرحت پوتا

(۱۹۴) **فدوی** : مرزا بھچو، المتخلص بہ فدوی جوانے ست از مستعدانِ زمانہ، در مثل و محاورہ بندی یگانہ۔ سخنش را مذاقِ عالی و طبعِ روانش را نظمِ متوالی، مقبولِ انام، خوش طبع و شیریں کلام۔ اصلش از شاہ جہان آباد، از شاگردانِ شاہ عشق، دام افضالہ۔ دیوانِ اوائل را بہ آب شستہ بعد از اں خوب تر گفتہ۔ بہرہ از علمِ موسیقی و ستار نوازی قدرے نیز حاصل کردہ۔ دردمند و عاشق مزاج، در یک جا قرار نہ می کند، گاہے در عظیم آباد و گاہے بہ مرشد آباد،

دل میں کس بات سے ملال گیا
یار تیرا کدھر خیال گیا

ایک دن بھی نہ اُس کو دیکھا حیف
یوہیں اب کا تمام سال گیا

تجھ سے ہوتے ہیں درد مند جدا
گو کرے کوئی بند بند جدا

سانورے گورے سب تماشا ہیں
اپنی اپنی یہ ہے پسند جدا

گلہ آپس میں آگے بھی کبھو تھا
تکلف برطرف ایسا ہی تو تھا

بہ رنگِ آئینہ جو عیب جو تھا
وہ پانی پانی اُس کے رو بہ رو تھا

ٹک اثر ہو زبان میں پیدا
پھر سبھی کچھ ہے آن میں پیدا

زندگی کا نہ کچھ مزہ پایا
کیوں ہوئے تھے جہان میں پیدا

رفتہ رفتہ اپنے جوہر یار دکھلانے لگا
آستیں کا سانپ نکلا یہ تو جی کھانے لگا

کیا تسلی کر گیا تھا یار اس دل کی مرے
یہ تو کچھ جاتے ہی اُس کے اور گھبرانے لگا

دل پڑا ہے یہ شمع ساں اپنا
سر جلائیں کہاں کہاں اپنا

ساتھ پھرتے ہیں بہت مائل لگے
دیکھتا کیا ہے اِنھیں قاتل لگے

مجھ سوختہ دل کو تو نہ کہہ پیکرِ طاؤس
جلتے ہیں مرے داغوں کے آگے پرِ طاؤس

دل ہے اپنا نہ جسم و جاں ہے اپنا ؎
اپنا کسے سمجھیے کہاں ہے اپنا

اپنی تو نظر میں فدوی اللہ سوا ——
یاں ہے اپنا نہ کوئی واں ہے اپنا

یار وملے اب کوئی کسی سے کس طور ؎
منصف ہو ذرا دل میں کرو اپنے غور

جوں آئینہ کب تلک یہ خاطر داری ——
منہ پر کچھ اور پیٹھ پیچھے کچھ اور

کیا ملیے یہ آشنا گھڑی کے ہوں گے ؎
آخر دشمن پھر اپنے جی کے ہوں گے

اِن سنگ دلوں سے کیا توقع فدوی ——
یہ کس کے ہوئے ہیں جو کسی کے ہوں گے

گلشن میں کہاں یار جسے دیکھیں گے ؎
بن اس کے تو ہرگز نہ اِسے دیکھیں گے

قاصد نے تو ملنے کی توقع کھو دی ——
کیوں پھڑکے ہے آنکھ ہم کسے دیکھیں گے

گاہے بہ فیض آباد می ماند۔ الحال، شنیدہ ام کہ در بنگالہ پیش نگر سیٹھ بہ سر می برد۔ با فقیر حاضر و غائب دوستی دارد۔ خدایش سلامت دارد۔ از وست:

گو تجھ کو نہ اعتبار ہوئے ۔۔۔ کافر ہو جسے قرار ہوئے
بیگانگی ہمیں نہیں تجھ سے تری طرح ۔۔۔ ہم سب طرح ترے ہیں سمجھ تو کسی طرح
جوں شمع گو کہ سر سے بلا رات ٹل گئی ۔۔۔ دیوانے فکر آج کی کر کل کی کل گئی
دل سے یہ دور رہے آج کی شب ہو گی صبح ۔۔۔ شبِ فرقت ہی خدا جانیے کب ہو گی صبح
دم غنیمت ہی شبِ وصل کوئی دم ہنس لے ۔۔۔ وقت رخصت کے تو فدوی یہ غضب ہو گی صبح
ساقی منا کے اب کے بھی تو نے بہار کو ۔۔۔ محروم ہی رکھا دلِ اُمّید وار کو
حکمت ہی عین طبعِ مکدر کو جام مے ۔۔۔ پانی بٹھا ہی دیوے ہی آخر غبار کو
پڑ جائیں مثلِ شیشۂ مے آبلے ابھی ۔۔۔ رو کر اگر نہ دل کے نکالوں بخار کو
فدوی مرا ہی کام ہی روز اُٹھ کے جس طرح ۔۔۔ رکھتا ہوں تھام تھام دلِ بے قرار کو
کس دل جلے کی تیرے تئیں بد دعا لگی ۔۔۔ ای شمع اب تو آہ ترے سر پہ آ لگی
بندے کی بندگی کا کسی کو یقیں نہیں ۔۔۔ پیارے خدا کے واسطے بول اُٹھ خدا لگی
فدوی توکل جو یار کے پھرتا تھا اُس پاس ۔۔۔ اُس نے کہیں کہا تھا کہاں کی بلا لگی
محفل میں شمع سن کے یہ بولی پتنگ سے ۔۔۔ خانہ خراب تجھ کو بھی یاں کی ہوا لگی

ہماری کب آبرو کے اوپر اس ابر کے تئیں فلک نظر ہی
رکھی اِن آنکھوں نے شرم یا رب! جگر جگر ہی دگر دگر ہی
ملے وہ غیروں سے مہروش جا ہمیں کب آتا ہی رشک اُس کا
یہ ڈھلتی پھرتی ہی چھاؤں فدوی کبھی اِدھر ہی کبھی اُدھر ہی

کچھ تو دل میں ترے نفاق پڑا ۔۔۔ جو اب آنا اِدھر کا شاق پڑا
خمِ مے کی طرح ترا دل ہیں ۔۔۔ جوش کھاتا ہی اشتیاق پڑا
یار ایسا نہ پائے گا فدوی ۔۔۔ دیکھ لینا گر اتفاق پڑا

ہر چند ہلال تیرے ابرو سا نہیں ✓ پر دل سے سپہر کے یہ باتیں نہ گئیں
کج بحثی کرے ہے اپنی اِس رفعت پر —— ناخون نہ دے خدا رذالے کے تئیں

غیروں سے وہ آہ گرم جوشی ظالم ✓ اور ہم سے ملے تو یہ خموشی ظالم
سودے میں ترے تو ہم کہیں کے نہ رہے —— پھر کس کے لیے یہ خود فروشی ظالم

کیوں اُن سے کہیں کہ چشم و دل سمجھیں گے ✓ یا آپ ہی ہو کے منفعل سمجھیں گے
دل آنکھوں کو دوں دے ہے آنکھیں دل کو —— یہ جانیں انھوں کا کام مل سمجھیں گے

تری ہم نے تاثیر بس آہ دیکھی نہ آیا وہ کافر بہت راہ دیکھی

میں اپنی جاں تلک حاضر ہوں پر تو اس کو کیا جانے
مرے دل میں تو یہ کچھ ہے ترے دل کی خدا جانے

ہمیں تو عینِ راحت ہے جو کچھ تیری عنایت ہے
گرفتارِ جفا ہوئے جفا کو جو جفا جانے

کون اُسے یہ کہہ سکے کیوں قتل عالم کو کیا کیا کسی کا ڈر پڑا ہے جی میں آیا سو کیا
گالیاں کیوں کر نہ دیوے تو نے فدوی چھیڑ چھیڑ ایک تھے وہ تھا ہی اُس کو اور بھی بدخو کیا

(۱۹۵) **فرصت**: شاعرِ خوش تقریر، زباں دانِ دل پذیر، گوہرِ کانِ فتوّت، میرزا الف بیگ، المتخلّص بہ فرصت متوطّن الہٰ اباد ست۔ بندہ اورا نہ دیدہ، مگر از یارانِ آں دیار شنیدہ کہ درآں جا مثلِ او کسے نیست۔ فصیح بیان و شیریں زباں۔ غالب کہ اصلش از شاہ جہان آباد ست، از کلام او ہویدا و ظاہر ست۔ علی الخصوص در غزل قطعہ از و بہ کمالِ خوبی می تراود۔ سلامت باشد۔

از دست:

اُس کو طرزِ جفا خوش آتی ہے مفت میں اپنی جان جاتی ہے
اک عمر خاکِ کوے بتاں سجدہ گاہ کی تب رفتہ رفتہ اُس بتِ کافر سے راہ کی

شاکی ہیں تیرے ظلم کے ہاتھوں سے کتنے یار
اپنا ہی سخت جی ہے کہ ہرگز نہ آہ کی

بنٹ مضطر ہوں جب سے وہ گیا ہے
خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے

بنا تجھ کو کوئی دستِ بریدہ
یہ اپنے حق میں کانٹے بو گیا ہے

شمشیر کھینچ قاتل آیا جو میرے سر پر
مرنے کی آرزو میں گردن ہیں اپنی خم کی ق

فرمایا تب یہ اُس نے اے کشتۂ محبّت
مہلت ہے ایک ساعت کر شرح اپنے غم کی

میں نے کہا کہ یہ غم وہ غم ہے جس کے لکھتے
کاغذ کی چھاتی پھاٹی کٹ گئی زباں قلم کی

میں کس طرح سے تجھ کو احوالِ دل سناؤں
جی میں ہزار باتیں فرصت ہے ایک دم کی

(۱۹۶) **فخر** : میر فخر الدّین، فخر تخلّص، مردے ست مؤدّب و متواضع از تلامذۂ میرزا محمد رفیع سودا۔ خلفِ اشرف علی خاں، صاحبِ تذکرۂ فارسی۔ اکثر ہمراہِ میرزا می باشد، و غزل ہائے ایشاں را ترقیم می نماید۔ غرض مردِ خوبے ہست۔ سلامت باشد:

بات کیجے غیر سے اور ہم سے منہ کو موڑ لیجے
ٹک خدا سے ڈریے اِن وضعوں کو اپنی چھوڑ دیجے

منہ نہ موڑے گا یہ عاصی گر یوہیں منظور ہے
لیجیے سنگِ جفا اور شیشۂ دل توڑ دیجے

توڑنا دل کا تمھارے آگے تو آسان ہے
پر ہمیں تب جانیں جب ٹوٹے بھی دل کو جوڑ دیجے

اگر وہ اٹھ گئے یاں سے تو پھر کس سے کہے گا تو
جو کہنی ہے تو کہہ اے فخر ایسے میں ہیں وہ بیٹھے

(۱۹۷) **فراق** : میاں ثناء اللہ، فراق تخلّص۔ برادر زادۂ میاں ہدایت، از شاعرانِ حال ست۔ در شاہ جہان آباد می ماند۔ شنیدہ ام کہ شعرِ خود بہ خدمتِ خواجہ میر، درد می گزراند۔ مربوط می گوید۔ از دست:

دلِ دیوانۂ عاشق کو ناصح رنج راحت ہے
جراحت پر مری جو سنگ ہے سنگِ جراحت ہے

(۱۹۸) **فارغ** : فارغ تخلص۔ ہندو بچہ ہست، وکالت پیشہ، از شاگردانِ میاں حاتم و از مریدانِ مولوی فخر الدین۔ حالا، در شاہ جہان آباد استقامت دارد۔ از تازہ گویان ست :

اشک آنکھوں سے جو نکلا سو دو گوہر نکلا بعد مدت کے مری چشم کا جوہر نکلا

(۱۹۹) **شاہ فصیح**، افصح : شاہ فصیح، افصح الفصحا و ابلغ البلغا، مردے ست از شاگردانِ میرزا بیدل۔ بزرگانش از مردمِ طالقان اند، کہ بہ طرفِ توران زمین ست۔ عمرش قریبِ صد سال رسیدہ است۔ بہ کمالِ درویشی در لکھنؤ تکیہ ساختہ، و زانو بہ توکل دادہ، بہ سر می برد۔ دیوانِ فارسی دارد بہ مذاقِ تصوف، بہ طورِ استادِ خود۔ از سببِ پیری و افیوں کہ بسیار تناول می نماید قاق شدہ است۔ قوتِ برخاستن نہ دارد۔ و در سالِ یک ہزار و یک صد و نود و دو بہ رحمتِ حق پیوست۔ خدایش بیامرزد۔ افصح تخلص در فارسی می نماید، لیکن، چوں شاہ فصیح مشہور اند، برائے ایں در ردیف فا نوشتہ شد :

کر یاد تجھے جدھر گئے ہم ہم تو نہ رہے کدھر گئے ہم
زاہد سوے کعبہ ہم سوے دیر ایدھر نہ گئے اُدھر گئے ہم
کیا بلا شوخ کی قامت دیکھی ہم نے جیتے ہی قیامت دیکھی
سرمۂ چشمِ جہاں ہیں ہونا خاکساری کی کرامت دیکھی

جب ہوئے تجھ سے جدا جیتے ہیں کیا مرتے ہیں
زندگانی ہے کہاں موت کے دن بھرتے ہیں

⁘

حرف (ق)

متقدّمین

(۲۰۰) **قادر**: میر عبدالقادر، قادر تخلص از باشندگانِ حیدرآباد ست. بیشتر مرثیه از و مشهور ست. مردِ مقدّس و اہلِ دل بود۔ از اوائل مذاقِ درویشی داشت، چوں عمرش از پنجاه متجاوز گردید، با یکے از مشائخ آں دیار که نسبِ وے به شیخ شهاب الدّین سهروردی می پیوست، خرقه پوشید و از دنیا عزلت گزید۔ غفر اللہ لہ۔ ایں رباعی از وست:

م ہر چند ہمن سب سے اُٹھایا ہی ہات ؎ اِس پہ بھی نہ آزاد کہائے ہیہات
م عالم سنے ہر ایک یہ کہتا ہو گا ؎ دکّھن میں ہی قادر اجھون در قیدِ حیات

متوسّطین

(۲۰۱) **قدر**: قدر تخلص. شخصے بود در زمانِ محمّد شاه، غفر اللہ لہ۔ از تذکرۂ میر تقی معلوم شد که مردِ اوباش وضع، از قیدِ مذہب و ملّت آزاد، گاہے در کوچه و بازار به نظر می آمد۔ ایں شعرِ او بسیار مشہور ست، چناں چه مطربانِ ہند اکثر می خوانند:

آج آئے ہو تو رہ جاؤ سجن رات کی رات ؎ لیلۃ القدر سے بہتر ہی ملاقات کی رات ن

عبث تو بے کسی اپنی پہ کیوں ہر وقت روتا ہی
نہ کر غم ای دوانے عشق میں ایسا ہی ہوتا ہی

(۲۰۲) **قبول** : غنی بیگ، قبول تخلّص از مردم کشمیر بود۔ احوالِ او در تذکرۂ خانِ آرزو مسطور ست۔ شاعرِ فارسی بود، چوں دید کہ ہنگامۂ ریختہ گرم ست، خود ہم بہ طورِ خود می گفت۔ از وست :

نم
حاضری بن محل نہیں کھاتا	بیگمی ہے پنیر منعم کا

(۲۰۳) **قلندر** : بدھ سنگھ، قلندر تخلّص۔ آبا و اجدادش دولتِ بسیار داشتند۔ او بہ یکے از بتانِ ہند عاشق شدہ، از قومِ خود گسیختہ، قلندر وش بر آمد۔ حالا معلوم نیست کہ کجاست۔ طبعِ موزونے دارد۔ از وست :

چھپا ہے مانگ بیں دل جا کے اب میں ڈھونڈوں کدھر
کہ آدھی رات اِدھر ہے اور آدھی رات اُدھر

قلندر وقت مرنے کے جو یار آیا تو کیا حاصل	جو اتنی عمر گزری تھی تو یہ بھی دم گزر جاتا
جی میں جو قلندر کے کبھی آئے گا	ما	دل اپنے کو چھین تجھ سے لے جائے گا
یہ روز کا تیرے چیں بر ابرو رہنا	سب طاق اوپر دھرا ہی رہ جائے گا

(۲۰۴) **قائم** : نخلِ حدیقۂ فصاحت و غنچۂ بوستانِ بلاغت، شمعِ بزمِ سخن دانی و چراغِ خانۂ نکتہ رانی، ترقیِ فکرش دائم، شیخ محمد قائم۔ شاعرے ست خوش گو۔ شاہینِ طبعش تیز بال و شہبازِ فکرش بہ اوجِ کمال۔ خوبیِ اشعارش چوں حسنِ محبوباں دل پزیر، و ربطِ الفاظش مسلسل مانندِ زلفِ خوباں بے نظیر۔ در اوائل مدّتے داخلِ جرگۂ خواجہ میر، درد ماند، آخر بہ شاگردیِ میرزا محمد رفیع، سودا قائم گردید۔ متوطّنِ چاند پور، ندنیہ۔ چوں از ابتدائے جوانی در شاہ جہان آباد آمدہ، بہ سر برد، بنا براں محاورۂ او درست گشت۔ طرزش بہ طرزِ طالب آملی می ماند۔ مثنوی ہائے بسیار گفتہ و بسے دُرہائے معانی سفتہ کہ کسے کم گفتہ۔ فقیر او را نہ دیدہ، و اکثر خوبی ہائے وے شنیدہ۔ الحال،

در ضلع مراد آباد ست - خدایش سلامت دارد :

مثنوی ہجو سرما :

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید — صبح نکلے ہے کانپتا خورشید
چرخ کی اطلسی قبا یہ ہمیش — نہیں یہ کہکشاں ہے دانۂ کیش
ان دنوں چرخ پر نہیں یہ مہر — گود میں کانگڑی لیے ہے سپہر
دن کی کٹتی ہے دھوپ میں اوقات — کالی کملی میں رات کاٹے رات

مطلعِ سرِ دیوان :

ہرگز نہیں مقدور تری حمد زباں کا — برہان ہے دعوے کی مرے عجز بیاں کا
جب تک کہ ہے تو، ہم ہیں ترے ساتھ ہمیشہ — جوں موج کہ نت لازمہ ہے آبِ رواں کا
م جلوہ ہر رنگ میں ہے اُس بتِ ہرجائی کا — یہ پریشاں نظری جرم ہے بینائی کا
م چھوڑ تنہا مجھے یارب انھیں کیوں کر گزری — غم جنھیں آٹھ پہر تھا مری تنہائی کا
عہد سے اُس صنم کے بر آیا نہ جائے گا — یہ ناز ہے تو ہم سے اٹھایا نہ جائے گا
م کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ — کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا
میں کیا کہوں کہ جو کچھ مجھ پہ زیرِ دام ہوا — وہیں یہ جان لے جو تڑپا نہ اور تمام ہوا
بے دماغی سے نہ اُس تک دلِ رنجور گیا — مرتبہ عشق کا یاں حسن سے بھی دور گیا
ن دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا — آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا
ن ہر دم آنے سے میں بھی نادم ہوں — کیا کہوں پر رہا نہیں جاتا
ن یہ کہیو تو قاصد کہ ہے پیغام کسی کا — پر دیکھیو لینا نہ کہیں نام کسی کا
خوباں کے طرف رکھنے کا بندہ ہوں میں قائم — ملتے ہیں کہیں نام ہے بدنام کسی کا
ہم نے ہر طرح ترے ہجر میں دل شاد کیا — ہچکی گر آئی تو جانے کہ ہمیں یاد کیا
کوہ اور دشت میں بھی ہم نہ ہوئے آسودہ — ماتمِ قیس کیا یا غمِ فرہاد کیا

میں اِس چمن سے اور یہ مجھ سے چمن گیا — لے دل میں اپنے حسرتِ سرو و سمن گیا
شیریں تو ساتھ خسرو کے جوں چاہیے کرے عیش — پتھر تھا تیری چھاتی پہ سو کوہ کن گیا
روؤں گا زیرِ سایۂ دیوار بیٹھ کر — جس دن تری گلی میں کہیں داؤ بن گیا
ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر — روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ ہی من گیا

ہمارے دردِ دل کے تئیں یہ کب بے درد بوجھیں ہیں
ہم اپنے جی سے عاجز ہیں انھوں کو عیش سوجھیں ہیں

دریا ہی پھر تو نام ہے ہر اک حباب کا — اُٹھ جائے گر یہ بیچ سے پردہ حجاب کا
دل وہیں ہوئے گا میرا وہ جہاں ہوئے گا — پر خدا جانیے وہ ہرزہ کہاں ہوئے گا
زلف دیکھی تھی کس کی خواب میں رات — ہم سحر تک تھے پیچ و تاب میں رات
خوب نکلے ہم اُس کے کوچے سے ق — ورنہ آئے تھے اک عذاب میں رات
لیک خالی سی کچھ لگے ہے بغل —— دل گرا شاید اضطراب میں رات
اب تو نہ گل نہ گلستاں ہے یاد — اُس کے مکھڑے کی ہر زماں ہے یاد
آہ اے پیرِ چرخ قائم نام — یاں جو رہتا تھا اک جواں ہے یاد
بے شغل نہ زندگی بہ سر کر — گر اشک نہیں تو آہ سر کر
کچھ طرفہ مرض ہے زندگی بھی — اِس سے جو کوئی جیا سو مر کر
یاں کیوں نہ کسی کو آئے افسوس — حالت تو مری ہے جائے افسوس
دیتے تو دیا میں، دل و لیکن — چارہ نہیں اب سوائے افسوس
ن نہ دل بھرا ہے نہ اب نم رہا ہے آنکھوں میں — کبھی روئے تھے سو خوں جم رہا ہے آنکھوں میں
میں مر چکا ہوں پہ تیرے ہی دیکھنے کے لیے — حباب وار تنک دم رہا ہے آنکھوں میں
ن نہ محو ہوں کہ مثلِ حباب آئینہ — جگر سے اشک نکل تھم رہا ہے آنکھوں میں
خوش رہ اے دل اگر تو شاد نہیں — یاں کی شادی پہ اعتماد نہیں

تیرے دامن تلک ہی پہنچوں اور — خاک ہونے سے کچھ مراد نہیں
میں کہا عہد کیا کیا تھا رات — ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں

مجھے اس اپنی مصیبت سے ہے فراغ کہاں — کسی سے چاہوں کہ صحبت رکھوں دماغ کہاں

پاس میں تجھ غم کے میں اپنی بھی غم خواری نہ کی — جان دے گزرا یہ ظاہر دل کی بیماری نہ کی
دم بہ دم اس رنجشِ بے جا کو کیا کہتے ہیں شوخ — دل دیا تجھ کو تو کچھ میں نے گنہ گاری نہ کی
بعد خط آنے کے اُس سے تھا وفا کا احتمال — لیک واں تک عمر نے اپنی وفاداری نہ کی

دل مرا دیکھ دیکھ جلتا ہے — شمع کا کس پہ دل پگھلتا ہے
ہم نشیں ذکرِ یار کر کچھ آج — اس حکایت سے جی بہلتا ہے
گندمی رنگ جو ہے دنیا میں — میری چھاتی پہ مونگ دلتا ہے

یاں سدا اندیشۂ بلا وقفِ جگر ریشی ہے — کیجے کیا جان مری عالمِ درویشی ہے
اپنے مذہب میں قرابت نہیں اجداد کی شرط — تجھ سے نسبت ہے جسے اُس سے ہمیں خویشی ہے

ناز و ادا کہیں کہیں عجز و نیاز ہے — کس کس طرح سے یار مرا جلوہ ساز ہے

جب میں دیکھا ہے تو اس دل کو غمیں دیکھا ہے — یہ نیا چاؤ محبت کا ہمیں دیکھا ہے
حسرتِ دل کو مری سمجھے وہی خستہ جسے — یار نے آ کے دمِ بازپسیں دیکھا ہے

گو کہیں یار بلاتا ہے وہ اب آتا ہے — پر اُسے میں تو سمجھتا ہوں وہ کب آتا ہے
شام ہوتی نہیں اک دل پہ بلا ہوتی ہے — صبح ہوتی نہیں اک جی پہ غضب آتا ہے

مر جائیے کسی سے پر الفت نہ کیجیے — جی دیجیے تو دیجیے پر دل نہ دیجیے

شب گریے سے وابستہ مری دل شکنی تھی — جو بوند تھی آنسو کی سو ہیرے کی کنی تھی

مردنِ دشوار میں یہ جانِ بے تقصیر ہے — حسرتِ دل سو طرف سے اِس کی دامن گیر ہے

گو ہم سے تم ملے نہ، تو کچھ ہم نہ مر گئے — کہنے کو بات رہ گئی اور دن گزر گئے

کیسے گُل گشتِ گلشن کی ہوس ہے — اسیری کا جگر پہ داغ بس ہے

نہ پوچھو مجھ سے گلشن کی حقیقت
برس گزرے کہ میں ہوں اور قفس ہے

زاہد درِ مسجد پہ خرابات کی تو نے
جی بھی یوہیں چاہے تھا کرامات کی تو نے

ایدھر تو میں نالاں ہوں اُدھر غیر نہ جایا
اب کس سے مری جان ملاقات کی تو نے

قائم رہِ پر خوف ہے اور دور ہے منزل
کب پہنچے گا ظالم جو نہیں رات کی تو نے

پھرے زمانہ جہاں تک ہی ہم سے یا نہ پھرے
کسی کے پھرنے نہ پھرنے سے کیا خدا نہ پھرے

فلک رُلائے تو ہے ہم کو لیک یہ ڈر ہے
کہ بلبلا سا کہیں آپ ہی بہا نہ پھرے

مرا جی تجھ کو گو پیارا نہیں ہے
پر اتنا بھی تو ناکارہ نہیں ہے

ن نہ مرنے دیتے ہم قائم کو لیکن
خداوندی سے کچھ چارہ نہیں ہے

ن بہارِ عمر ہے قائم کوئی دن
اسے جوں گل پیارے کاٹ ہنس کر

اب کے جو یہاں سے جائیں گے ہم
پھر تجھ کو نہ منہ دکھائیں گے ہم

جو شرط ہے دوستی کی پیارے
جیتے ہیں تو کر دکھائیں گے ہم

ایسا ہی جو دل نہ رہ سکے گا
ٹک دور سے دیکھ جائیں گے ہم

مجھ سا کوئی جہان میں آشفتہ سر نہیں
ہے یوں تو زلفِ یار بھی پر اس قدر نہیں

ن اے دل یہ رنگِ غنچہ نہ لے گل رخوں سے تو
اپنی گرہ میں ان کے کھلانے کو زر نہیں

اتنی اے دیدہ و دل مجھ پہ نہ بیداد کرو
دیکھیں کیا ہوئے خدا کو تو ٹک اک یاد کرو

دل مرا چھین یہ کہتا ہے وہ دلبر قائم
جی جہاں چاہے تمہارا مری فریاد کرو

کبھی دکھا کے کمر اور کبھی دہاں تجھ کو
نپٹ یہ تنگ کیا تو نے اے میاں مجھ کو

تو اتنے واسطے اے باغباں نہ کاوش کر
بہت ہے سایۂ دیوارِ گلستاں مجھ کو

داماںِ گل تلک ہے کہاں دسترس مجھے
تکلیفِ سیرِ باغ نہ کر اے ہوس مجھے

قائم میں عندلیبِ خوش آہنگ تھا ولے
زاغ و زغن کے ساتھ کیا ہم قفس مجھے

کیا جانے ہم کہاں ہیں اور دین و دل کدھر ہے
عالم میں تفرقے کے کس کی کسے خبر ہے

آج اِی گریہ خبر لے مرے دیوانے کی — کچھ رکا جاتا ہی دل گردِ سے ویرانے کی
آج کی رات جو اُس گُل کا میسّر ہو وصال — شمع روشن کروں میں خاک پہ پروانے کی
بتوں کی دید کو جاتا ہوں دیر میں قائمؔ — مجھے کچھ اور ارادہ نہیں خدا نہ کرے

ہر طرف وہ نگاہ لڑتی ہی — کبھی ایدھر بھی آن پڑتی ہی
کیا ہی کھڑا ہی وہ کہ جس کے حضور — آئینے کی قلعی اُدھڑتی ہی
قائمؔ آیا ہی پھر وہ بن ٹھن کر — دیکھیں کس کس سے یاں بگڑتی ہی

ن — اٹھائے ستم یا جفا کیا کرے — بچارا یہ دل ایک کیا کیا کرے
ن — میں جاتا ہوں کعبے کو اب دیر سے — بھلا یہ بھی دیکھوں خدا کیا کرے

نگاہوں سے نگاہیں سامنے ہوتے ہی جب لڑیاں
یکایک کھل گئیں دونوں طرف سے دل کی گل جھڑیاں

(۲۰۵) **قدرت** : بلند پایہ و قوی مایہ، درویش خصلت، میر قدرت اللہ، قدرتؔ مردے ست از متوسلانِ میر شمس الدین، فقیرؔ رحمہ اللہ۔ درویش وضع، خلیق طبع۔ رتبۂ قدرش رفیع و شیوۂ معاشش بدیع۔ سمندِ نظمش در میدانِ فارسی و ہندی چالاک و چست، و تصویرِ بے نظیرِ معانیش در استخوان بندیِ الفاظ درست۔ بندہ وے را یک بار در مشاعرہ بہ لکھنؤ دیدہ ام۔ اگرچہ از سلکِ متوسطین ست، لیکن، شہرۂ اشعارش در متاخّرین اشتہار یافتہ۔ دیوانش بہ نظر نیامدہ، مگر ہمیں غزل کہ مشہورِ عالم ست، با چند بیتِ دیگر بہ نگارش می آرد۔ شنیدہ ام کہ میرِ مذکور الحال، در مرشد آباد استقامت دارد۔ اصلاحِ سخن ظاہراً از میر شمس الدین، فقیرؔ، مرحوم گرفتہ است۔ مرد خوب ست۔ حق تعالیٰ سلامت دارد۔ از دست:

سیرِ چمن کی فرصت اِی بلبلو کہاں ہی — جو گل نظر پڑے ہی سو غارتِ خزاں ہی

بیت الحزن میں شب کہ ترا انتظار تھا — کھٹکا ہر ایک در کا مرے جی کے پار تھا
اہلِ عدم کو رمزِ فنا کا تھا کب شعور — سر مشقِ رفتگاں مرا لوحِ مزار تھا
تڑپوں ہوں خاک و خوں میں پڑا جس کے وار سے — قدرت میں کیا کہوں یہ وہی شہ سوار تھا
تشنہ لب مرتا ہے بس موجِ دمِ شمشیر کا — ای غرورِ ناز کچھ ہے فکر اس نخچیر کا
کون مے خانے سے قدرت کو نکالے کیا مجال — ہے خطِ پیمانہ سر خط اس کے تقدیر کا
برپا ہوئے سو فتنے مرے کشورِ جاں سے — کون انکھڑیاں ملتا یہ اٹھا خوابِ گراں سے
جوں بید مری آہ کبھی ہو نہ زمیں گیر — یہ سرو لگا ہے چمنِ کاہکشاں سے
منظور اگر آنکھ سے ہے کچھ، تو تری دید — مقصود اگر ہے تو ترا نام زباں سے
کس کی نیرنگی یہ شمعِ پردۂ فانوس ہے — جو شررِ دل سے اٹھا سو جلوۂ طاؤس ہے
ایک ہی پردے کی گر سمجھو تو ہے یہ سب الاپ — گر صدائے بانگ ہے ور نغمۂ ناقوس ہے
صبر و طاقت تو کبھی کی کوچ یاں سے کر گئی — اب وداعِ ننگ ہے اور رخصتِ ناموس ہے
کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے — ق کیا ہی ملکِ روم کیا ہی سرزمینِ طوس ہے
گر میسر ہو تو کس عشرت سے کیجے زندگی — اِس طرف آوازِ طبل اودھر صدائے کوس ہے
صبح سے تا شام ہوتا ہے مے گل گوں کا دور — شب ہوئی تو ماہ رویوں سے کنار و بوس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے — چل دکھاؤں تو جو قیدِ آز کا محبوس ہے
لے گئی یک بارگی گورِ غریباں کی طرف — جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر مجھے کہنے لگی — یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و مکنتِ دنیا سے آج — کچھ بھی اِن کے پاس غیر از حسرت و افسوس ہے
کل تو قدرت پائے خم رکھتے تھے تسبیحِ ریا — آج رہنِ جامِ مے یہ خرقۂ سالوس ہے
حسرت ای صبحِ چمن ہم سے چمن چھوٹے ہے — مژدہ ای شامِ غریبی کہ وطن چھوٹے ہے
جوں نقشِ قدم ہیں ترے وہ خاک نشیں ہم — تا مٹ نہ چکیں آپ سے چھوڑیں نہ زمیں ہم

نسبت ہی ہماری تری جوں سایہ و خورشید — جس جا نہیں تو ہم ہیں جہاں تو ہی نہیں ہم
سینہ اُس کا ہی دل اُس کا ہی جگر اُس کا ہی — تیرِ بیداد جدھر رو کرے گھر اُس کا ہی

متاخّرین

(۲۰۶) **قریں**: قریں تخلص از مردم کشمیر جنّت نظیر، شخصے ست از شاگردانِ میاں حسرت - طبعِ موزونے دارد - بندہ او را یک بار دیدہ ام، بہ فقیر خانہ روزِ مشاعرہ آمدہ بود - نومشق ست، سلامت باشد - از وست :

پیارے بے وفا یا با وفا ہو — غرض تم دل کے لینے کو بلا ہو
ہمارے مرنے کا وہ شوخ غم کرے نہ کرے — پہنچ کے نعش پہ آنکھوں کو نم کرے نہ کرے
کہا تو ہی کہ میں آؤں گا تیرے گھر میں قریں — غرورِ مستی سے دیکھیں کرم کرے نہ کرے

(۲۰۷) **قرباں**: از تازہ گویانِ زماں، میر جیون، المتخلص بہ قرباں - جوانِ بست سالہ، سپاہی پیشہ بود، دریں سن و سال بہ کمالِ خوبی حرف می زد - از تلامذۂ میرزا رفیع، سوداؔ سلمہ اللہ تعالیٰ - روزے در فیض آباد فوجِ فرنگی صف کشیدہ می رفت، ایں نشانۂ تیرِ قضا با یکے از رفقا ناگاہ در میانش افتاد، آں سگاں بہ عادتِ خود غوغا نمودہ، ناسزا گفتند - ہر چند ایں گرفتارانِ بلائے ناگہانی بہ عجز و انکسار پیش آمدہ عذر خواستند کہ نادانستہ بہ دام افتادہ ایم، راہ بدہید، غرض آں مغروراں ہیچ پروا نہ کردہ، زباں بہ دشنام کشادند - بعد از ردّ و بدلِ بسیار بہ مقتضائے غیرت، ناچار تن بہ قضا دادہ، دست بہ قبضہ شدند، آخر یکے زخمی شد و ایں جواں از طعنِ سنگینِ کافرانِ سنگ دل شہید گردید: ع آفریں باد بریں ہمّتِ مردانۂ او، کہ جانِ خود را قربانِ آبرو کرد - خدا ایشں بیامرزد - از وست :

کیا خیمے دوزکی صاحب جمال رکھی ہی فراش نے ڈیرے میں پال
پنکھی فروش کے نے پھرکی ہی گل سے رنڈی
پھرتا ہی کس ہوا میں دن رات باؤ ڈھنڈی

(۲۱۰) **کاکل**: شاہ کاکل ہم از سلکِ متوسطیں درویشے بود، معاصرِ میاں آبرو، کاکل تخلص می نمود۔ اوائل نوکری پیشہ بود، او اخر ترکِ لباس کرد۔ ایں دو شعر از و بہ گوش خوردہ بود۔ از وست:

وعدہ کیا تھا صبح نہ آیا وہ اب تلک کھینچوں گا اِس جفا کو نہ جانوں میں کب تلک
جب اُٹھ چلا بغل سے تو پوچھا ملے گا کب کاکل کو کھول منہ پہ بتایا کہ شب تلک

(۲۱۱) **کامل**: شیخ لطف اللہ، کامل تخلص از شاگردانِ خاکسار، نیز از متوسطیں شخصے بود۔ از وست:

وہ مرا بے مہر قاتل اس قدر خوں ریز ہی کانپتا نکلے ہی جس کے ڈر سے یارو آفتاب

(۲۱۲) **کافر**: میر علی نقی، کافر ٹپکا۔ جوانِ محمد شاہی از ملکِ متوسطین است۔ از مدتے بہ طرف مرشد آباد رفت۔ بسیار خوش رو و ظریف طبع بود۔ اوّل فارسی می گفت، تسکیں تخلص می کرد، باز براں ہم تسکیں نہ یافت، جنوں تخلص کرد۔ چوں در خدمتِ جاوید خاں، خواجہ سرا نوکر شد، ریختہ گفتن آغاز کرد۔ روزے قبلہ گاہِ ایں فقیر از راہِ ظرافت بادے فرمودند کہ شما فارسی و ہندی گفتید، الحال، عربی بگوئید و ملعوں تخلص کنید۔ بریں سخن بسیار خندید۔ وجہ تسمیۂ او این ست کہ تخلص کافر می کرد، ہر شعرے می خواند، بر دلش می خورد، می گفت کہ ایں شعر نیست بلکہ ٹپکا ست، ازیں جہت کافر ٹپکا در شعرا مشہور گردید۔ غرض عجب شخصے بود۔ خدایش بیامرزد۔ از وست:

ن کس کس طرح بتوں کی صورت نے رنگ پکڑے کافراِن انکھڑیوں نے دیکھے ہیں کیا جھگڑے

یوں بندِ قبا کھل گئے جو آن میں گل کے — کیا پھونک دیا تو نے صبا کان میں گل کے

کیا کچھ دلِ بلبل پہ کرے دیکھیے یہ عشق — سو چاک دیے جس نے گریبان میں گل کے

(۲۰۸) **قانع** : قانع تخلّص نبیرۂ ناصر خان ست۔ شعرِ ہندی و فارسی ہر دو می گوید۔ اصلش از شاہ جہان آباد ست، از مدّتے در لکھنؤ استقامت دارد۔ روزے بہ خدمتِ میرزا رفیع، سودا سلمہ اللہ آمدہ بود، فقیر ہم دراں جا نشستہ بود، از چشم ہایش وحشت پدید آمد، اغلب کہ سودائے کسے داشتہ باشد۔ از مشاہیراں نیست۔ طبعِ موزونے دارد۔ سلامت باشد۔

از وست:

شعلہ اگر اُٹھے دلِ پر اضطراب کا — جل جائے سو جگہ سے جگر آفتاب کا

حرف (ک)

متوسّطین

(۲۰۹) **کمترین** : میاں کمترین، ایہام بند، در سلک متوسّطین مردے بود نوکری پیشہ۔ در سرکارِ نوّاب عماد الملک سرفراز بود۔ موافقِ استعدادِ خود می گفت۔ ایں چند شعر از شہر آشوبِ او بہ نگارشش می آید کہ مشہور ست۔

خدا لیش بیامرزد:

ن تو خصم گن گر مشعلچن نے کیے — تو بھی نہیں رہتی دو شاخہ بن دیے

نم پلا اُس مست نفرانی کو تاڑی — اگاڑی اصطبل کے جا بچھاڑی

ن دیکھو بکوان والی کی مزاخیں — خصم کے رو بہ رو دیتی ہی شاخیں

ن بتوں کے تئیں اس قدر مانتا ہے ... یہ کافر مزاجی خدا جانتا ہے

کیا پھرتی ہے میکدے میں مٹکی مٹکی ... س ... زاہد، عابد سے دور پھٹکی پھٹکی

قاضی کا ڈر نہ محتسب کا، کافر ... یہ دخترِ رز ہے جس سے اٹکی اٹکی

(۲۱۳) کلیم : شاعرِ زبردست و مشّاقِ قدیم، میر محمد حسین، المتخلّص بہ کلیم۔ جوانِ محمد شاہی، گندم گون و دراز قد بود۔ با خانِ آرزو، مرحوم و میر محمد تقی قرابتِ قریبہ داشت۔ در فنِ شعر و شاعری استادِ سخن، بحرِ زخارِ طبعش در نثر و نظم موج زن۔ رسالہ در عروض و قافیۂ ہندی تصنیف نمودہ، و فصوص را کہ کتابِ عربی ست بہ زبانِ ریختہ ترجمہ کردہ۔ کتابے در نثرِ ہندی نیز ایجاد نمودہ، چناں چہ یک فقرۂ او بہ یاد ماندہ، قلمی می نماید۔ وقتے کہ احمد شاہ را میل در چشم کشیدند، دراں مقدمہ می گوید۔ فقرہ: "کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر، آج کے دن ہو بیٹھے ہیں اندھے ہو بصیر۔ ایسی دولت سے زنہار زنہار۔ فاعتبروا یا اولی الابصار"۔

باوجودِ ایں زور و قوتِ شاعری نمک در کلام نیافتہ۔ بنا بریں اشعارش اشتہار نہ یافت۔ غرض عجب شخصے بود۔ در شاہ جہان آباد بہ رحمتِ الٰہی پیوست۔ خدا الیش بیامرزد۔ ایں چند بیت انتخاب نمودہ، قلمی می نماید:

نم آتی ہے دل پہ قلقلِ مینا سے اب شکست ... وہ دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا

ن عرق ہے منہ پہ ترے یا گلاب ٹپکے ہے ... عجب ہے مجھ کو کہ شعلے سے آب ٹپکے ہے

تجھے ہیں آنکھوں میں کیوں کر رکھوں کہ ہے برسات ... پھر ایسا گھر کہ یہ خانہ خراب ٹپکے ہے

ن بوسہ بھی چیز ہے اے مری جان اس قدر ... جس پہ رہے ہو ہم سے بُرا مان اس قدر

ن ہم گم ہوئے ہیں ضعف سے جوں بو میانِ باغ
پھرتا ہے رنگِ گل کہ ہمارا کرے سراغ

اِس چمن میں جب سے تو ای سروِ خوش بالا نہیں
داغ ہو دل جل رہے ہیں باغ میں لالہ نہیں

کافر و مسلم کیے ہیں قتل اک شمشیر سے
ای کلیم اُس یارِ نادر سے پڑا پالا نہیں

ایما بہ نادر حسین خان ست کہ دراں وقت شہرۂ حسن او بہ عالم مشہور بود۔

سخت کھینچے گا خمار ای زاہد، اِس کوچے سے جا
خیر ہوئی ہو اس گھڑی وہ مست متوالا نہیں

نم پوچھ مت غم کی داستاں ای دل
کہ پڑا ٹوٹ آسماں ای دل

ن تم جام دو پیارے کیوں کر کریں نہیں ہم
خونِ جگر تھا تو بھی پی ہی گئے وہیں ہم

ن تو یار مل کے ہم سے جب ایک ہو گیا ہو
ق کس کو بعید جانیں کس کو کہیں قریں ہم

ن تم ہو تو ہم کہاں ہیں ہم ہیں تو تم کہاں ہو
یا تم ہی سب ہو ہم میں یا ہیں گے سب ہمیں ہم

ن نے و طنبور میں تو شور یہ معلوم ای مطرب
کسی کا دل ہوا ہی شاید اس پردے میں آنالاں

نم عمرِ رفتہ کا نہ پایا کھوج ہرگز ای کلیم
آپ کو جوں شمع میں ہر انجمن میں گم کیا

نم غرورِ حسن ممکن نہیں کسی کی داد کو پہنچے
غرض تم سن چکے احوال ہم فریاد کو پہنچے

بات اُس کی زبان پر آئی
پھر خرابی جہان پر آئی

پیر کیوں ہو گیا ہی اتنا کلیم
کیا بلا اُس جوان پر آئی

پیری کی بھی سیر کر گئے ہم
اِس پُل سے بھی گزر گئے ہم

جوں اشک کہ ہستی اور عدم میں
بس ایک قدم تھا دھر گئے ہم

واں غصے ہوئے رقیب پر تم
یاں مارے ادب کے مر گئے ہم

ن تو نہ آیا باغ میں شمشاد غم سے خم ہوا
طوق قمری کا فغاں سے حلقۂ ماتم ہوا

ن کس پریشاں نے قدم رکھا ہی پیچ و تاب سے
جادہ آتا ہی نظر جوں زلفِ کج برہم ہوا

اُس ماہ رو کی باتیں کیا دل کو بھائیاں ہیں
جو وصل کی شب اندر ہم کو سنائیاں ہیں

ای باغباں خبر لے گلشن میں بلبلوں کی
غنچوں کی لے صبوحی دھومیں مچائیاں ہیں

شمشیر اور سپر سے دھمکاؤتے ہو ہم کو
یہ ہی سپاہیوں کی یارو ادائیاں ہیں

ن گل رو تو چمن میں اچپلی سے نہ گیا ؎ یہ دل بھی گلی سے بے کلی سے نہ گیا

ن جو کوئی گیا دل کو گیا چھوڑ یہاں — دل سے تو کوئی تری گلی سے نہ گیا

دنیا کے ہاتھ سے جو دل ریش ہیں ہم ؎ اِس واسطے یاں عاقبت اندیش ہیں ہم

دنیا داری و نوکری محنت و کسب — جب کچھ نہ بنا کہا کہ درویش ہیں ہم

ن ہر چند لگاتے ہیں بتاں گل منہدی ؎ تیرے ہی قدم تلے گئی رُل منہدی

ن ہیہات کہ کس طرح کا ہوگا وہ ہاتھ — جس ہاتھ سیتی داغ ہوئی گل منہدی

(۲۱۴) کاشی ناتھ : لالا کاشی ناتھ، متوطنِ بٹالہ، پسرِ نوندھ رائے، پیش کارِ دیوانِ تن - طبعِ موزوں دارد - از دست :

مجھ دل کا ای طبیب سمجھ کر علاج کر ۔ مدّت سے ہے یہ عشق کا بیمار دیکھنا م

(۲۱۵) کھنجن : کھنجن زنے گزشتہ است - معلوم نیست کہ از کجاست - ہمیں دو شعرِ او شنیدہ شد :

عشق میں راحت ہو یا آزار ہونا ہو سو ہو ۔ کیا کریں اب یہ ہوئے ناچار ہونا ہو سو ہو

کر گریباں چاک کھنجن چل بیاباں کی طرف ۔ دیکھ لے یہ بھی مزہ اک بار ہونا ہو سو ہو

حرف (گ)

متاخّرین

(۲۱۶) گماں : دریں فصل از متقدّمین و متوسّطین بہ نظر نیامدہ، مگر از سلکِ متاخّرین - چناں چہ شاعرِ شیریں بیاں، میاں نذر علی خاں، المتخلص بہ گماں، مردے ست سپاہی پیشہ از یارانِ کوکہ خاں، فغاں - اصلش

از شاہ جہان آباد ست۔ مرثیہ و منقبت و غزل ہمہ می گوید۔ فکرِ خوبے دارد۔ روزگار موافق، زمانہ موافق ست۔ در فیض آباد بہ سر می برد۔ از بس کہ مشّاق ست، و روانیِ طبع دارد، کلامش خالی از اثر نیست۔ خدایش بہ سلامت دارد۔ از وست:

جس دم تو مجھ سے آ کے ہم آغوش ہو گیا
غم دو جہاں کا دل سے فراموش ہو گیا

قتل کرتی ہے ہمیں یہ ابروے خم دار کج
کاٹ دونا کرتی ہے ہوتی ہے جو تلوار کج

راست کہ کس نے ایا تجھ کو گماں سے بد گماں
اس سے کیوں کرتا ہے تو ہر وقت اب گفتار کج

دل پھنسا جب سے تری زلفِ پریشاں کے بیچ
تب سے آرام نہیں جان کسی آن کے بیچ

مہربانی سے کبھی تو نے نہ کی مجھ سے بات
جی نکل جائے گا میرا اسی ارمان کے بیچ

گزرے ہے تیری یاد میں دن رات بے طرح
آگ لگی ہے جی پہ مرے بات بے طرح

جاتی ہے مفت ہائے یہ فصلِ بہار حیف
ہے دفعہ ہم سے یار ہمارا ہزار حیف

مدت سے ہو رہا تھا مرا داغ داغ دل
اُس گل کے دیکھتے ہی ہوا باغ باغ دل

فصلِ گل سے پھر ہوا اب گرم بازارِ چمن
مستِ پہ سے لے کر ہوئی بلبل خریدارِ چمن

کون ہوئے گا وہ دن جو ہم قفس سے چھوٹ کر
جا کے دیکھیں گے الٰہی پھر وہ دیوارِ چمن

دیکھتا ہوں جہاں بتاں کو میں
دور ہی سے سلام کرتا ہوں

مر جاؤں گر کہے تو اپنی زباں سے مجھ کو
خاطر عزیز تیری ہے اپنی جاں سے مجھ کو

گل بھی شبنم سے نہ دیکھے یوں سحر بھیگے ہوئے
دیدۂ عاشق ہیں خوں سے جس قدر بھیگے ہوئے

سر جھکایا میں جو قدموں پہ تو غصے ہو کہا
مت رکھ اپنے چشم میرے پاؤں پر بھیگے ہوئے

مرا دل دیکھنے کو جس ستم گر کے ترستا ہے
مجھے دیکھے ہے جب روتے تو وہ بے درد ہنستا ہے

واسطے جس کے سبھی مجھ کو برا کہتے ہیں
وہ جو سنتا ہے تو کہتا ہے بھلا کہتے ہیں

ہزار افسوس تو اپنا ہمیں بدخواہ جانے ہے
میں جیسا ہوں ترا بندہ مرا اللہ جانے ہے

تری یہ تیغ میاں کاش مجھ پہ چل جائے — چھٹوں عذاب سے جھگڑا مٹے خلل جائے
میں اس لیے نہیں کہتا ہوں اپنی حالتِ دل — مبادا جی میں سمجھ کر کہیں بچل جائے
مجھے تو زیست بھی دشوار ہوگئی ہے اب — خدا کرے کہ گماں دل مرا سنبھل جائے
اُس بن نہ ہوتے ہم تیرے ہم دوشِ نقشِ پا — مل خاک میں ہوئے ہیں ہم آغوشِ نقشِ پا
اِس رشک سے کہ کوئی نہ پائے ترا سراغ — میرا غبار ہے ترا روپوشِ نقشِ پا
دل سے سودائے بتاں تھا مجھے معلوم نہ تھا — نفع میں جی کا زیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
کس صفائی سے ترا تیرِ نگہ تھا چھوٹا — زخم کا دل پہ نشاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
جستجو جس کی میں کرتا تھا خدائی کے بیچ — دل ہی میں اُس کا مکاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
قتل کر مجھ کو مری نعش پہ بولا قاتل — ہائے یارو یہ گماں تھا مجھے معلوم نہ تھا

(۲۱۷) گداز : گداز تخلص از متاخرین ست از شاگردانِ میاں حسرت۔ سپاہی پیشہ۔ گاہ گاہے در لکھنؤ بہ نظر می آمد۔ الحال، معلوم نیست کہ کجاست۔

از وست :

تجھ سے گر آئیے کہاں ملیے — اپنے ملنے کی تو بتا صورت
جب کہاں ہیں کہ تجھ پہ عاشق ہوں — مجھ کو اپنی نہ را دکھا صورت
غصے ہو کر لگا یہ کہنے گداز — مجھ پہ تو ہوگا مبتلا صورت

خواہی وہ دل داری کرے خواہی دل آزاری کرے
دل ہی نہیں باقی رہا جو ناز برداری کرے
مدہوش چشم اُس کی کریں اور زلف کھینچیں جال میں
کیوں کر رکھے دل کو کوئی کس طرح ہشیاری کرے

(۲۱۸) گریاں : گریاں، میر علی امجد، ولدِ میر علی اکبر۔ جوانے ست شائستہ، متوطنِ شاہ جہان آباد۔ اوائل اصلاح از میاں قدرت و اواخر از میر ضیا،

سلمہ اللہ گرفتہ۔ سپاہی پیشہ است، اگر روزگار فرصت می دہد شوقے بہ سخن دارد۔ سلامت باشد۔ از وست:

سنے قصہ مرا یک دم جو کوئی درد و محنت کا
نہ لیوے زندگی بھر نام پھر ہرگز محبت کا

مجھے جب دیکھنا تب ہاتھ سے مکھڑا چھپا لینا
نکالا طور اُس نے اور ہی صاحب سلامت کا

دیکھے تو جسے نگاہ بھر کر
مرجائے وہیں وہ آہ بھر کر

سبک روحی یہ پروانے کی جی کو داغ کرتی ہے
کہ دوش شمع پر رکھتا نہیں بارِ کفن اپنا

حرفِ (ل)

متقدّمین

(۲۱۹) **لطفی**: لطفی دکنی، لطفی تخلّص، از قدیم ست۔ او راست:

تجھ عشق کی اگن سے شعلہ ہو جل اُٹھا جی
دل موم کے نمنے گل گل پگھل گیا ہے

میں عشق کی گلی میں گھایل پڑا ہوں تس پر
جو بن کا ماتا آکر مجھ کو کھندل گیا ہے

حرف (م)

(۲۲۰) **مرزا**: ابوالقاسم، مرزا تخلّص از مقربانِ ابوالحسن تاناشاہ رحمہ اللہ بود۔ چوں فوجِ ہندوستاں آں ملک را تاراج کرد ایں عزیز بہ مقتضائے غیرت لباسِ فقیری پوشیدہ از جہاں عزلت گزیدہ، در کنجِ تنہائی بہ عبداللہ گنج کہ در حیدرآباد مشہور ست بقیۂ عمر بہ یادِ الٰہی بہ سر برد۔

وہماں جا مدفون گشت - خدایش بیامرزد - از وست :

عارض نہیں چندر کا ترے گال سوں اچھا ہمجھیں ہمن کلف کو نہ تجھ خال سوں اچھا
مرزا وہ نونہال کدھر سٹ گئے چمن لگتا تھا جن کے ہاتھ پہ گل ڈال سوں اچھا

(۲۲۱) **محمود بیگ** : محمود بیگ، دکنی از قدیم ست، متوطنِ بیجاپور، معاصر فخری بلکہ قرابتے نیز باوے داشت :

لوگاں کہیں پتھر سوں کچھ سخت نہیں دلیکن جو کوئی پیا سوں بچھڑا وہ سخت ہی پتھر ہے

(۲۲۲) **ملک** : ملک دکنی، او ہم از آں دیار بود - از وست :

تن من فدا کروں اُس ہشیار ساقی اوپر یک قطرہ مے چکھا کر جن بے خبر کیا ہے

(۲۲۳) **موسوی، معز و فطرت** : موسوی خاں، فطرت و موسوی تخلص شاعرِ فارسی بود - فطرت و موسوی و معز ہر سہ تخلص داشت در زمانِ عالمگیر بادشاہ - یک شعرِ ریختہ ہم از وست :

از زلفِ سیاہِ تو بہ دل دھوم پڑی ہے در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے
وہ چیز ہند مرا موسوی بہ دہ در گور صدائے بنگری و ٹیر پاؤں پروں کی چھوڑ

(۲۲۴) **محق** : محق تخلص از شاعرانِ دکن بود، لیکن از کلامش معلوم می شود کہ با مردمِ ہندوستاں تربیت یافتہ بود - از وست :

تم ہر کسی سے وعدۂ دیدار مت کرو اپنی زباں سے جھوٹ کا اقرار مت کرو

(۲۲۵) **مہر علی** : مہر علی شخصے بود از مردمِ دکن، در کمالِ ظرافت و خوش طبعی - پسرِ خطیبِ بادشاہ - معاصرانِ خود را بہ طعن و استہزا می رنجانید - با ہمہ کس بہ تمسخر پیش می آمد - چناں چہ نقل ست روزے در مجلس مذکورِ شعر بود، شخصے شعرے خواند، پدرش معنیِ او بہ طورے می گفت و ایں برعکسِ او - چوں بحث درمیاں آمد ایں عزیز با پدرِ خود گفت کہ صاحب، شما

نہ می دانید، "جانے... خلیب کا" چوں پدرش خطیب بود ایں مثل بر موقع
افتاد- خدایش بیامرزد- از وست:

م موتی دریا میں اس کے تئیں کاں لگ دہوئیں کہ تمھن کے دو بنا گوش کے ہم سر ہوئیں

متوسطین

(۲۲۶) **موزوں** : خواجہ قلی خاں، موزوں تخلّص، صوبہ دارِ قلعۂ
برہان پور در عہدِ بہادر شاہ بود- ایں شعر بہ نامِ او دیدہ شد:

ن موزوں نے راہِ عشق میں پھر اب قدم رکھا ہی مصلحت سے دُور، نہ جانوں کرے گا کیا

(۲۲۷) **میرِ میراں** : میرِ میراں، سید نواز ش خاں خطاب داشت- از وست:

نم آہ گر باغ میں وہ سروِ خراماں گزرے اشکِ قمری سے گلستان میں طوفاں گزرے

(۲۲۸) **مخلص** : رام انند رام، مخلص از شاعرانِ فارسی ست، شاگردِ
میرزا بیدلؔ مرحوم، وکیلِ اعتماد الدولہ، وزیر الممالک، مغفور- در آخر سن
شعرِ خود را پیشِ خانِ آرزو می نمود- احوالِ او در تذکرۂ خانِ مذکور مسطور ست-
گاہ گاہے بہ ندرت شعرِ ریختہ نیز می گفت- از آزارِ ضیق النفس در گزشت-
از وست:

نم آنے کی دھوم کس کے گلزار میں پڑی ہی ہاتھ ار گجے کا پیالہ نرگس لیے کھڑی ہی

(۲۲۹) **مزمّل** : میاں شاہ مزمّل مردِ فقیرے بود، حافظِ قرآں، مردمانِ
آں زماں از سببِ فضل و کمال احترامش می نمودند- فکرِ الفاظِ تازہ می کرد-
غفر اللہ لہٗ :

سیم تن جس کا نام ہوتا ہی اُس کو سونا حرام ہوتا ہی
اسمِ اعظم جو جانتے ہو تم سو مزمّل کا نام ہوتا ہی

من ہرن میرا مزمّل رم گیا		دشمنوں کے من کی چیتی ہو گئی
اے مزمّل، ناز کا گھوڑا کدا		شوخ بولا چل بے چل آگے سے چل

(۲۲۰) **مضموں** : مضموں، گلشنِ طبعش از فیضِ رشحاتِ ابرِ سخن تازہ، و عندلیبِ خاطرش بر شاخسارِ بیاں بلند آوازہ۔ در بوستانِ سخن سروِ موزوں، میاں شرف الدّین، المتخلّص بہ مضموں۔ مردے بود نوکری پیشہ، متوطنِ جاجو کہ قصبہ ایست متّصلِ اکبر آباد۔ شروعِ جوانی از اکبر آباد آمدہ بہ شاہ جہان آباد در زینت المساجد استقامت ورزید۔ ہر چند کم گو بود، لیکن خوش گو۔ از اولادِ شیخ فرید، گنج شکر، چناں چہ خود گفتہ :

'کروں کیوں نہ شکر لبوں کو مرید		کہ دادا ہمارا ہے بابا فرید'

اصلاحِ سخن از خانِ آرزو می گرفت۔ بہ سببِ نزلہ دندانش ہمہ افتادہ بود، خانِ مذکور او را شاعرِ بے دانہ می گفتند۔ نقل ست کہ میاں مضموں سفارشِ آشنائے برائے روزگار پیشِ نوّاب عمدۃ الملک نمود، نوّابِ والا جناب قبول کرد۔ آں عزیز ہمیشہ در کار و بار حاضر می ماند، چناں چہ نوّاب را گمانِ آں شد کہ تنخواہ می یابد، و ایں نوکرِ کم زباں دانست کہ شاید من نوکر شدہ ام۔ چوں مدّتِ دہ ماہ گزشت صورتِ ایں حال بہ میاں مضموں تقریر نمود، اوشاں فی البدیہ ایں شعر گفتہ پیشِ نوّاب عمدۃ الملک فرستادند۔ آں نوّابِ قدر شناس ہماں وقت تنخواہ از تاریخِ ملازمت حساب نمودہ، بخشید :

'عرضِ حال اپنی سے ہیں اہلِ شرافت بے نصیب		نہیں سخن رکھتے زباں کے بیچ گویا یہ عجیب'

غرض، عجب عزیزے بود۔ آخر ہماں جا در مسجد بہ قضائے الٰہی فوت شد۔ خدایش بیامرزد۔ ایں اشعار از وست :

ن
ہم نے کیا کیا نہ ترے غم میں اے محبوب کیا		صبرِ ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا

ہوئے ہیں ہر مژہ سیتی زبس آنسو ڈھلک دریا — کہیں کیوں کر نہ چشموں کو مری مردم پلک دریا — م

افسون مار جھٹ پٹ لیتے ہیں دل کو اٹکا — کن ساحروں سے سیکھا زلفوں نے تیری لٹکا — م

چھپ کر مخالفوں سے اس طرح آ پلنگ پر — کوئی سُنے نہ پیارے تیرے قدم کا کھٹکا — م

نہ یہی فتنہ قد و قامت ہے — ہنس کے پھر دیکھنا قیامت ہے — م

ایک تو تھا ہی وہ مہ رو خود پسند — ہو گیا دیکھ آرسی کے تئیں دو چند — نم

ہنسی تیری پیارے پھلجھڑی ہے — یہی غنچے کے دل میں گلجھڑی ہے — ن

مے کدے میں گر سراسر فعلِ نامعقول ہے — مدرسہ دیکھا تو واں بھی فاعل و مفعول ہے — نم

کرے ہے دار بھی کامل کو سرتاج — ہوا منصور سے نکتہ یہ حل آج — ن

نہیں ہیں ہونٹ تیرے پان سے سرخ — ہوا ہے خون ہمارا آکے لب ریز — ن

چلا کشتی میں جب آگے سے وہ محبوب جاتا ہے — کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی جی ڈوب جاتا ہے — نم

مرا یہ اشک قاصد کی طرح ہرگز نہیں تھمتا — کسی بے تاب کا شاید لیے مکتوب جاتا ہے — نم

اگر باؤں تو مضموں کو رکھوں باندھ — کروں کیا جو نہیں لگتا مرے ہاتھ — ن

مضموں تو شکر کر کہ ترا نام سُن رقیب — غصّے سے بھوت ہو گیا لیکن جلا تو ہے — ن

(۲۳۱) **مظہر**: از فصحائے زمان و بلغائے دوراں، میرزا مظہر جانِ جاناں، المتخلّص بہ مظہر۔ شاعرے ست مقدّس و بزرگ۔ اصلش از اکبرآباد ست۔ خوش تقریر بہ مرتبہ ایست کہ در تقریر و تحریر نمی گنجد۔ یقین و حزیں شاگردانِ او یند بسنِ شریفش نزدیکِ نود رسیدہ باشد۔ الحال، بہ طرفِ سنبھل مرادآباد استقامت دارد، و ہماں جا وعظ می فرماید۔ در سلسلۂ نقش بندیہ اکثر مردم آں دیار در خدمتِ شریفش استفادہ حاصل نمودہ، بیعت می نمایند۔ شعرِ فارسی از دیوان مرتّب دادہ اند، و علم را بہ مرتبۂ کمال رسانیدہ۔ اوّل ریختہ ہم می گفتند، چناں چہ ایں دو سہ شعر بہ نظر آمد بہ طریق تبرّگاو

تیمناً نوشتہ شد۔ خدا ایش سلامت دارد۔ از وست :

خدا کے واسطے اِس کو نہ ٹوکو | یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے نم
جواں مارا گیا خوباں کے اوپر میرزا مظہر | بھلا تھا یا برا تھا زور کچھ تھا خوب کام آیا ن
ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار | ہائے کچھ چارہ نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار نم
نرگس و گل کی دیکھو کلیاں کھلی جاتی ہیں سب | پھیر اِن خوابیدہ فتنوں کو جگاتی ہے بہار
مرتا ہوں میرزائی گل دیکھ ہر سحر | سورج کے ہاتھ چونری دینکھا صبا کے ہاتھ نم
آتش کہو شرار کہو کوئلا کہو | مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کہو نم
چلی اب گل کے ہاتھوں سے جلا کر آشیاں اپنا | نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا م
یہ حسرت رہ گئی کن کن مزوں سے زندگی کرتے | اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا
مرا جلتا ہے جی اُس بلبلِ بےکس کی غربت پر | کہ جن نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا
م کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو ہے ظالم | یہ دولت خواہ اپنا مظہر اپنا جانِ جاں اپنا
لوگ کہتے ہیں موا مظہرِ بےکس افسوس | کیا ہُوا اُس کو وہ اتنا بھی تو بیمار نہ تھا
آج مت رنگِ حنا سے کفِ پا لال کرو | اے بتاں اِس دلِ پرخون کو پامال کرو

(۲۳۲) میر مدد اللہ : میر مدد اللہ، والدِ میر حمزہ علی، رند کہ بیشتر مذکور شد۔ جوانِ محمد شاہی بود، تخلص نہ می کرد۔ گاہ گاہے دو سہ بیت می گفت، و باشعرا بسیار ربط داشت۔ در علمِ موسیقی نیز مہارتے پیدا کردہ بود، خیالِ نعمت خاں را درست می خواند۔ از وست :

ایسا نہیں وہ شوخ جسے گھر کوئی پالے | پر مجھ سا نہ ہوئے نہ اُسے ڈھونڈ نکالے
اشک آنکھ سے دل ہاتھ سے جی تن سے چلا جائے | اے وائے مصیبت کوئی کس کس کو سنبھالے
کرتے تو ہیں گھر مل یہ بتاں کعبۂ دل میں | سب خوبیاں ہی ہیں پہ خدا کام نہ ڈالے

(۲۳۳) مراد : شیخ محمد مراد، مراد تخلص، در سلکِ متوسطین شخصے گزشتہ است۔

از وست :

جاں بہ لب ہیں ہیں خماروں سے اور آتی ہے بہار — وقت ہے ساقی اگر جام ہیں صہبا کیجے

(۲۳۴) **منعم** : منعم تخلّص، برادرِ بزرگ میاں محمّد قائم، از مشاہیراں نیست، لیکن شعرِ رتبہ دار می گوید۔ از کلامش پختگی ظاہرست۔ از وست :

بھولی نہیں ہے مجھ کو بتوں کی ادا ہنوز — دل کے نگیں پہ نقش ہے نامِ خدا ہنوز
آنکھوں میں کس کے پائے نگارین کا نقش ہے — ٹپکے ہے جائے اشک جو رنگِ حنا ہنوز
تصویر اُس کی کھینچ کے ناز و ادا کے ساتھ — نازاں ہے اپنے آپ پہ دستِ قضا ہنوز
لو ہو سے عاشقوں کے گلی لالہ زار ہے — منعم وہ طفل کرتا ہے مشقِ جفا ہنوز

(۲۳۵) **میرزا محمّد** : میرزا محمّد برادرِ کلانِ میرزا فرید :

پلنگ پر ایک رات آ من ہرن سو — ہمارے من کا چیتا بھی کبھی ہو

(۲۳۶) **میرزا مہدی** : میرزا مہدی نام شخصے بود۔ از وست :

مرا احوال سن فرہاد روئے — وہ اپنا کھودنا پتّھر کا کھوئے

(۲۳۷) **مظلوم** : سیّد امام الدّین خاں، ولدِ سیّد معین الدّین خاں، سرِ چوکیِ رسالۂ والا شاہی بود، در وقتِ محمّد شاہ، غفر اللہ لہٗ۔ او ہم تذکرۂ مختصرِ معاصرینِ خود نوشتہ است۔ احوالش معلوم نیست :

جب سے سنی ہے اُس نے فصلِ بہار آتی — گلشن کے بیچ بلبل پھولی نہیں سماتی
جو تجھے گل عذار جانے ہے — اپنے دل کو بہار جانے ہے
آ کے لینا قرار زلفوں میں — یہ ترا بے قرار جانے ہے
گر برقِ تجلّی وہ ٹک اک جلوہ گر آئے — تب بھر کے نظر دیکھنا سب کا نظر آئے
تم سب سیتی ہوتے ہو بغل گیر پیارے — معلوم نہیں میری کب اُمّید بر آئے
دل داغ سے گلشن ہے، ہیں اشک سے دریا — ہر جا پہ اُسے عیش ہے ظالم جدھر آئے

(۲۳۸) **مکھن و پاک باز**: میاں صالح الدین، عرف مکھن مشہور بہ پاک باز، مکھن و پاک باز ہر دو تخلص داشت۔ پسرِ شاہ کمال، نبیرۂ شاہ جلال قدس سرہٗ شخصے بود گوشہ نشیں از سلکِ متوسطین، جوانِ محمد شاہی متوطنِ شاہ جہان آباد۔ اکثر بہ درود و وظائف مشغول بود۔ شنیدہ ام کہ در لکھنؤ آمدہ بر سوہنا و مکھن کہ قوال بچہ مشہور اند نظرِ التفاتے داشت۔ عاشق و معشوق ہر دو ہم نام، گویا خود بر خود عاشق بود۔ چناں چہ در عشقِ او خود گفتہ:

نہیں ندیاں مرے آنسو سے جو میں ہجر میں رویا — کہے ہے ساری بستی ہائے مکھن نے ہمیں کھویا

جلوے تمھارے حسن کے نِت ہیں یہ ہم کہاں — تم تو سجن ہمیشہ ہو افسوس ہم نہیں ن

نہیں یوسف کی گئی گرمیِ بازار ہنوز — روح پھرتی ہے زلیخا کی خریدار ہنوز

(۲۳۹) **موزوں**: راجا رام نراین، صوبہ دارِ عظیم آباد، موزوں تخلص از شاگردانِ شیخ علی، حزیں۔ صاحبِ دیوانِ فارسی، بسیار خوش گو، آشنا پرست و سپاہ دوست بود۔ شعرِ ریختہ کم گفتہ، بلکہ نہ گفتہ، مگر در وقتے کہ خبرِ شہید شدنِ سراج الدولہ در شہر افتاد ہماں وقت فی البدیہہ ایں شعر می خواند و از خبر داراں خبر می پرسید و می گریست۔ ہمیں شعر از و بہ یادگار ماند:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزرا

(۲۴۰) **محسن**: شیخ محمد محسن، المتخلص بہ محسن، جوانے ست بہ کمالِ علم و حلم، از اقربائے شیخ سراج الدین علی خان آرزو۔ برادر زادۂ میر محمد تقی۔ اصلش از اکبر آباد ست۔ تربیت در صحبتِ خانِ مذکور یافتہ در علم شعر مہارتِ بسیار دارد۔ الحال، در سرکارِ نوابِ فلک جناب، سالار جنگ بہادر سرفراز ست۔ از سببِ تکلیفات زمانہ مدتے شدہ مزاجش راغب بہ ایں طرف

نہ می شود۔ در ادائی آنچہ گفتہ ہماں گفتہ۔ پارۂ ازاں بہ نگارش می آرد:

محسن نہ روؤں میں تو بھلا کہہ کہ کیا کروں — اک دل بساط میں تھا سو اُس کو بھی کھو چکا

جس دن تری گلی سے میں عزمِ سفر کیا — ہر اک قدم پہ راہ میں پتھر جگر کیا

کیا جانیے وہ شوخ کدھر ہے کدھر نہیں — ہم کو تو تن بدن کی بھی اپنے خبر نہیں

جاں بہ لب ہوں میں نکل جائے نہ یہ جان کہیں — دل میں حسرت ہی رہی جاتی ہے آماں کہیں

ہرا رنگِ روٗ اس قدر زرد ہے — کہ یاں زعفراں زار بھی گرد ہے

یوسفِ مصر پہنچتا ہے کوئی — تجھ سے دل بر عزیزِ دل ہا کو

حرف تیرے عقیقِ لب کا شوخ — زندہ کرتا ہے نامِ عیسےٰ کو

ٹک آکے دیکھ نہیں کچھ بھی حال آنکھوں میں — پھرے ہے تس پہ بھی تیرا خیال آنکھوں میں

نہ پوچھ دخترِ رز کی تو مجھ سے کیفیت — لیے ہی جاتی ہے دل یہ چھنال آنکھوں میں

جب تخمِ محبت اپنے دل میں بویا — دین و دنیا سے ہاتھ ہم نے دھویا

اس عشق کا ہوئے خانہ ویراں یا رب — دونوں عالم سے ان نے ہم کو کھویا

(۲۴۱) **میر**: میرِ شعرائے ہندوستان و افصح فصحائے زماں، شاعرِ دل پذیر و سخن سنجِ بے نظیر، میاں محمد تقی المتخلص بہ میر۔ رفعتِ رواقِ کاخِ بیانش از طاقِ سپہر برتر، و گوہرِ کانِ ضمیرش از جوہرِ مہرِ عالی گوہر۔ فکرِ عالیش در عینِ خوش آبی، و طبعِ روانش بہ نہایتِ شادابی۔ چراغِ نثرش روشن و ساحتِ نظمش گلشن۔ شعرش چوں دُرِ خوش آب و اندازِ سخنش بے حساب صیقلِ ذکائے او زنگ زدائے آئینۂ خورشید، پیشِ ضیائے او روئے رخشانِ ماہ سفید۔ از استادانِ صاحب قدرت ست۔ طرزش مانا بہ طرزِ شفائی۔ برادر زادۂ سراج الدین علی خاں، آرزو، و ہم از شاگردانِ اوست۔ متوطنِ اکبرآباد۔ جوانِ محمد شاہی۔ الحال در شاہ جہاں آباد ست۔

سنِ او قریبِ شصت رسیدہ۔ تذکرۂ متقدمین و معاصرین از تالیفِ او بہ یادگار ماندہ است۔ رباعی و غزل و قصیدہ، ہجو و مدح ہمہ می گوید، لیکن آں چہ گوید از غزلیات کہ بسیار بہ انداز و طرز از و می تراود، بلکہ گرم بازاریِ او ہمین ست۔ بسیار صاحب دماغ ست، و دماغِ او را می زیبد۔ خدا ایشں سلامت با کرامت دارد۔ از وست:

کیا دن تھے وہ کہ یاں بھی دلِ آرمیدہ تھا | رو آشیانِ طائرِ رنگِ پریدہ تھا ن
قاصد جو واں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا | بے چارہ گریہ ناک و گریباں دریدہ تھا ن
تجھ سے ہر آن مرے پاس کا آنا ہی گیا | کیا گلہ کیجے غرض اب وہ زمانہ ہی گیا ن
ہم اسیروں کو بھلا کیا جو بہار آئی نسیم | عمر گزری کہ وہ گلزار کا جانا ہی گیا ن
جی گیا میر کا اِس لیت و لعل میں لیکن | نہ گیا ظلم ہی تجھ سے نہ بہانہ ہی گیا ن

ن جو اے قاصد وہ پوچھے میر بھی ایدھر کو چلتا تھا
تو کہیو جب چلا ہوں میں تب اُس کا جی نکلتا تھا

نم مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ قلقل نہ ہوئے گا | مئے گل گوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے روئے گا
ن کہاں آتے میسر مجھ کو تجھ سے خود نما اتنے | یہ حسنِ اتفاق آئینہ تیرے رو بہ رو ٹوٹا

گلی میں اُس کی گیا سو گیا نہ بولا پھر | میں میر میر اُسے کر بہت پکار رہا
شبِ ہجر میں کم تظلم کیا | کہ ہم سایگاں پر ترحم کیا
کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات | کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
ن آنکھوں میں جی مرا ہے اِدھر یار دیکھنا | عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا
صیّاد دل ہے داغ جدائی سے رشکِ باغ | تجھ کو بھی ہو نصیب یہ گلزار دیکھنا
ن جو اِس شور سے میر روتا رہے گا | تو ہم سایہ کا ہے کو سوتا رہے گا
میں وہ رونے والا چلا ہوں جہاں سے | جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

ن تو یوں گالیاں غیر کو شوق سے دے
ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہے گا

بے تاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا
جیتے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا

دل کا نہیں ٹھکانا بابت جگر کی گم ہے
تیرے بلا کشوں کا ہم نے حساب دیکھا

لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اٹھے
ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

ٹک میرِ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا

ن گزرا بنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا
خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا

ن یک قطرہ خون ہو کے مژہ سے ٹپک پڑا
قصّہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ کا

طوفِ مشہد کے تئیں جو آؤں گا
تیغِ قاتل کو سر چڑھاؤں گا

وصل میں رنگ اُڑ گیا میرا
کیا جدائی کو منہ دکھاؤں گا

کب تلک یہ ستم اُٹھائیے گا
ایک دن یوہیں جی سے جائیے گا

شکلِ تصویر بے خودی کب تک
کسی دن آپ میں بھی آئیے گا

اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدی مسجد
ق کسی ویرانے میں بنائیے گا

شرکتِ شیخ و برہمن سے میر
کعبہ و دیر سے بھی جائیے گا

گل کو محبوب میں قیاس کیا
فرق نکلا بہت جو باس کیا

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

سوجھتا کچھ نہیں ہمیں اُس بن
شوق نے ہم کو بے حواس کیا

تا بہ مقدور انتظار کیا
دل نے پھر زور بے قرار کیا

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

دل کے تئیں آتشِ ہجراں سے بچایا نہ گیا
گھر جلا سامنے اور ہم سے بجھایا نہ گیا

گل نے ہر چند کہا باغ میں رہ پر اُس بِن
جی جو اچٹا تو کسی طرح لگایا نہ گیا

کھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اُس کی میر
سمندِ ناز کو اک اور تازیانہ ہوا

مانندِ شمع آتشِ غم سے پگھل گیا — بزمِ جہاں میں روتے ہی روتے میں گل گیا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر — تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

میں غش کیا جو خط لے اُدھر نامہ بر چلا — یعنی کہ فرطِ شوق سے جی بھی اُدھر چلا

یہ چھیڑ دیکھ ہنس کے رخِ زرد پر مرے — کہتا ہے میر رنگ تو کچھ اب نکھر چلا

ن مر گیا میں ملا نہ یار افسوس — ہائے افسوس صد ہزار افسوس

رخصتِ سیرِ باغ ہم کو نہ ہوئی — یوں ہی جاتی رہی بہار افسوس

نسم گل کی جفا بھی دیکھی، دیکھی وفائے بلبل — اک مشت پر پڑے تھے گلشن میں جائے بلبل

م کی سیر جذبِ الفت گل چیں نے کل چمن میں — توڑا تھا شاخِ گل کو نکلی صدائے بلبل

ٹک لطف سے ملا کر پھر گو کبھو ہو — سو تب تلک کہ مجھ کو ہجراں سے تیرے خو ہو

ن ہم تو اسیرِ کنجِ قفس ہو کے مر چلے — اے اشتیاقِ سیرِ چمن تیری کیا خبر

م جنوں میرے کی باتیں دشت اور گلشن میں جب چلیاں
نہ چوبِ گل نے دم مارا نہ چھڑیاں بید کی ہلیاں

مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میر کی شب کو — مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو

ہو گا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میر — کیا ربط محبت سے اُس آرام طلب کو

مرتے ہیں تیری نرگسِ بیمار دیکھ کر — جاتے ہیں جی سے کس قدر آزار دیکھ کر

جاتا ہے آسماں لیے کوچے سے یار کے — آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

افسوس وے کہ منتظر اک عمر تک رہے — اور مر گئے ترے تئیں یک بار دیکھ کر

ڈھب ہیں تیرے سے باغ میں گل کے — بو گئی کچھ دماغ میں گل کے

جائے روغن دیا کرے ہے عشق — خونِ بلبل چراغ میں گل کے

سیر کر میر اس چمن کی شتاب — ہے خزاں بھی سراغ میں گل کے

رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستاں میری — نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

ترے خیال میں جیسے خیال مفلس کا — گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری

آتا ہے جی میں حالِ بد اپنا بھلا کہوں — پر آپ ہی آپ سوچ کے کہتا ہوں کیا کہوں

نازِ چمن وہی ہے بلبل سے گو خزاں ہے — ٹہنی جو زرد بھی ہے سو شاخِ زعفراں ہے

از خویش رفتہ اکثر رہتا ہے میر اُس بن — کہتے ہو بات کس سے وہ آپ میں کہاں ہے

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھیے کیا ہے کیا نہیں — تم تو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں

نازِ بتاں اُٹھا چکا دیر کو میر ترک کر — کعبے میں جا کے بیٹھ میاں تیرا اگر خدا نہیں

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آئے — اِس طرح کے رونے کو کہاں سے جگر آئے

ن نسیم مصر کب آئی سوادِ شہرِ کنعاں کو — کہ پھر بھولی نہ یاں سے لے گئی گل ہائے حرماں کو

ن گل و سنبل ہے نیرنگِ قضا مت سرسری گزرے — کہ بگڑے زلف و رخ کیا کیا بناتے اس گلستاں کو

ن کوئی کانٹا سرِ رہ کا ہماری خاک پر بس ہے — گل و گلزار کیا درکار ہے گورِ غریباں کو

ن کیا سیر اس خرابے کا بہت اب چل کے سو رہیے — کسی دیوار کے سایے میں منہ پر لے کے داماں کو

یہ رسم آمد و رفتِ دیارِ عشق بازی ہے — ہنسی ووں جائے میری اور رونا یوں چلا آئے

عمر بھر ہم رہے شرابی سے — دلِ پُر خوں کی اک گلابی سے

جی ڈہا جائے آج صبح سے ہائے — رات گزرے گی کس خرابی سے

کام تھے عشق میں بہت پر میر — ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

یہ چشم آئینہ دارِ رو تھی کسی کی — نظر اس طرف بھی کبھو تھی کسی کی

سحر بے خودی ہائے گل ہم کو لے گئی — کہ اُس سمت پیمانِ بو تھی کسی کی

دمِ نزع دشوار دی جان اُس نے — مگر میر کو آرزو تھی کسی کی

ت مر گیا کوہ کن اسی غم سے — آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہے

ن کل بارے ہم سے اُس سے ملاقات ہو گئی — دو دو بچن کے ہونے میں اک بات ہو گئی

ن کتنا خلاف وعدہ ہوا ہو گا وہ کہ یاں — نومیدی اور اُمید مساوات ہو گئی

فقیرانہ آئے صدا کر چلے　　میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لیے　　ہر اک چیز سے دل اُٹھا کر چلے
دکھائی دیے یوں کہ بے خود کیا　　ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے
کوئی نا امیدانہ کرتے نگاہ　　سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے

کہیو قاصد جو وہ پوچھے ہمیں کیا کرتے ہیں　　جان و ایمانِ محبت کو دعا کرتے ہیں
بے بسی سے تو تری بزم میں ہم بہرے بنے　　نیک و بد کوئی کہے بیٹھے سنا کرتے ہیں
اُس کے کوچے میں نہ کر شورِ قیامت کا ذکر　　ایسے ہنگامے تو یاں روز ہوا کرتے ہیں

ن دلِ پر خوں ہے یہاں تجھ کو گماں ہے شیشہ　　شیخ کیوں مست ہوا ہے تو کہاں ہے شیشہ
ن شیشہ بازی تو ٹک اک دیکھنے آ آنکھوں کی　　ہر مژہ پر مری اشکوں سے رواں ہے شیشہ
ن جا کے پوچھا جو میں کل کارگہِ مینا میں　　ق　دل کی صورت کا بھی اے شیشہ گراں ہے شیشہ
ن کہنے لاگا کہ کدھر بہکا پھرے ہے اے مست　　جس طرح کا جو تو چاہے تو یہاں ہے شیشہ
ن دل ہی سارے تھے یہ اک وقت میں جو کرکے گداز　　—　شکل شیشے کی بنائے ہیں کہاں ہے شیشہ؟

گرم ہیں شور سے تجھ حسن کے بازار کئی　　جلتے ہیں رشک سے یوسف کے خریدار کئی
کب تلک داغ دکھائے گی اسیری مجھ کو　　مر گئے ساتھ کے میرے تو گرفتار کئی

دن نہیں، رات نہیں، صبح نہیں، شام نہیں　　وقت ملنے کا مگر داخلِ ایام نہیں
بے قراری جو کوئی دیکھے ہے سو کہتا ہے　　کچھ تو ہے میر کہ اک دم تجھے آرام نہیں

نہیں وسواس جی گنوانے کے　　ہائے رے ذوق دل لگانے کے　ن
میری تغییرِ حال پر مت جا　　اتفاقات ہیں زمانے کے　ن
دمِ آخر ہی کیا نہ آنا تھا　　اور بھی وقت تھے نہ آنے کے

رنج کھینچے تھے داغ کھائے تھے　　دل نے صدمے بڑے اٹھائے تھے
کچھ نہ سمجھے کہ تجھ سے یاروں نے　　کس توقع پہ دل لگائے تھے

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں
یاں کبھی سرو و گل کے سائے تھے

اجرت میں نامہ بر کی دیتے ہیں جاں تلک تو
اب کارِ شوق اپنا پہنچا ہے یاں تلک تو

افسانہ غم کا لب تک آیا ہے مدتوں میں
سو جائیو نہ پیارے اِس داستاں تلک تو

دیکھیں تو تیری کب تک یہ کج ادائیاں ہیں
اب ہم نے بھی کسی سے آنکھیں لڑائیاں ہیں

ٹک سن کہ سو برس کی ناموسِ خامشی کھو
دو چار دل کی باتیں اب لب پہ آئیاں ہیں

کام آنے کا نہیں ایک بھی یار آخرِ کار
ہاتھ سے جائے گا سر رشتۂ کار آخرِ کار

چشمِ وا دیکھ کے ٹک کیجو چمن میں نرگس
آنکھوں میں جاتی رہے گی یہ بہار آخرِ کار

ڈوبے اچھلے ہے آفتاب ہنوز
کبھی دیکھا تھا تجھ کو دریا پر

مدت سے لگ رہی تھیں آنکھیں درِ حرم سے
پردہ اُٹھا تو لڑیاں نظریں ہماری ہم سے

ان دنوں یاروں کی نظروں سے نہاں رہتے ہو
خوش رہو میر مری جان جہاں رہتے ہو

ر ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے
خونابہ کشی مدام کی ہے ہم نے
یہ مہلتِ کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر
مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

ر مدت کے بعد جی بہ حال آتا ہے
خاطر پہ جہاں جہاں ملال آتا ہے
وے ووں گئے جان یوں چلی جاتی ہے آہ
رہ رہ کے ہمیں یہی خیال آتا ہے

متاخّرین

(۲۴۲) **مصیب** : وارثِ رقمِ دقائق و حارثِ اجمِ حقائق، حارسِ محروسۂ رسوم و حاکمِ محکمۂ علوم، در گلشنِ فضل و کمال عندلیب، حضرت شاہ قطب الدّین، المتخلّص بہ مصیب۔ برادرِ بزرگوارِ شاہ اجمل کہ پیشتر مذکور شد۔ از فرزندانِ شاہ خوب اللہ الہ آبادی۔ فاضل و عالم، شاعرِ عربی و فارسی۔ گاہ گاہ ہے برائے خاطرِ ریختہ گویانِ آں دیار ریختہ ہم می فرمود۔ از چندے

برائے زیارتِ مکّۂ معظمہ رفت، بعد از مراجعتِ منزلِ مقصود جاں بہ جاں آفریں سپرد، نوّر اللہ مرقدہٗ - از وست:

سیاہ بخت کے گھر کون ہے جو لائے چراغ — مرے مزار پہ جلتا ہے دل بہ جائے چراغ
مشکل کہ پہنچے اُس صفِ مژگاں میں دل مصیب — کیوں کر سپاہی جائے فرنگی کی باڑھ میں

(۲۴۳) **محزون**: مولوی غلام حسین، المتخلّص بہ محزوں، الہ آبادی، عالمِ بے نظیر و فاضلِ خوش تقریر، مبارزِ میدانِ دلائل، چابک سوارِ عرصۂ فضائل۔ شاعرِ فارسی بود۔ بندہ باوے ملاقات نہ کردہ، لیکن اکثر از زبانِ یارانِ آں دیار وصفِ آں بزرگوار شنیدہ۔ در اوائل چندے ریختہ ہم گفتہ۔ طبع دردمند داشت، از کلامش ظاہر ست۔ اصلش از شاہ جہان آباد بود، برائے تحصیلِ علم دراں شہر آمدہ، استقامت نمود۔ از بس کہ مدّت ہا ماند، مشہور بہ الہ آبادی شد۔ از مدّتے جاں بہ جاں آفریں سپرد۔ رحمہ اللہ:

زمیں پر مت پٹک اس کو نہ ہے یہ سنگ نہ سل ہے — ارے او بے مروّت یہ کسی کم بخت کا دل ہے
کوئی نہ منع کرو اُس کو مے پرستی سے — اجی یہ نامِ خدا عالمِ جوانی ہے
یہ نہیں ممکن کرے زاری دلِ ناکام کم — گرچہ آنکھوں میں نہیں باقی ہے بہرِ نام نم
جب سے دل اٹکا ہے زلفوں میں نہیں کرتا ہے آہ — صید کو لینے نہیں دیتا یہ کافر دام دم
بات کہتا غیر سے اور دیکھنا ہر دم ہمیں — سب سمجھتے ہیں پیارے یہ تری ایہام ہم

(۲۴۴) **منّت**: میر قمر الدّین، المتخلّص بہ منّتؔ، از نجیب زادہائے قصبۂ بسولی۔ ہم راہِ نوّابِ عماد الملک بہ کمالِ خوبی بہ سر می برد۔ حق تعالیٰ سلامت دارد۔ از وست:

منّت ایسے کو دل دیا تو نے — اے مری جان کیا کیا تو نے

(۲۴۵) **منشی**: شیخ غلام احمد قادری، المتخلّص بہ منشیؔ، ساکنِ دادری،

سرکارِ نارنول کہ قصبہ ایست از دار الخلافۂ شاہ جہاں آباد، از شاگردانِ میرزا مظہر جانِ جاناں۔ پیشتر واقف تخلّص داشت، چوں از شاہ واقف واقف شد، منشی نمود۔ در انشا پردازی خیلے مربوط است۔ شعرِ فارسی خوب می گوید و ریختہ ہم۔ از چندسے وارد فیض آباد ست۔ خوش اوقات و پاکیزہ صفات۔ تلاشِ حرفِ تازہ می نماید۔ خدا سلامتش دارد۔ از وست:

سجن تیرِ نگہ سے کر مرے دل کو نشاں اپنا کہ میں قرباں کیا ہے تجھ کماں ابرو پہ جاں اپنا
چرالیتا ہے نقدِ حسن کو آئینہ آنکھوں میں خدا کے واسطے ٹک کر حیا کو پاسباں اپنا
مگر پیاسا ہے زخمِ دل تری بیداد کا ظالم کہ تر کرتا ہے آبِ تیغ سے ہر دم دہاں اپنا
نہ پہنچے مجھ کو آفت ہرگز اس گردوں کی گردش سے زمینِ خاکساری کو کیا میں آسماں اپنا

(۲۴۶) **مسافر:** مسافر تخلّص نمی دانم از کیست و کجائی ست۔ ایں قدر می دانم کہ از معاصرینِ من ست۔ یک شعر از و بہ گوش خوردہ۔ از کلامش چاشنیِ تصوّف می آید۔ از وست:

اب چھوڑ کر کنشت جو کعبے کو جائیے واں بھی یہی صنم ہو تو کیا منہ دکھائیے

(۲۴۷) **محب:** شیخ ولی اللہ، المتخلّص بہ محب۔ مردے ست نوکری پیشہ، خوش اندیشہ۔ اصلش از شاہ جہان آباد ست از شاگردانِ مرزا محمد رفیع سودا۔ سخنِ او خالی از لطف نیست۔ پیشِ مہرباں خاں بہ طرفِ فرّخ آباد بہ سر می برد۔ از وست:

عارض اُس کے تھے عرق سے یوں سحر بھیگے ہوئے جس طرح شبنم سے دو گل برگِ تر بھیگے ہوئے
اشک سے مژگاں ہے نم تجھ تک پہنچتی نہیں نگاہ مانع پرواز ہیں طائر کے پر بھیگے ہوئے

(۲۴۸) **مفتوں:** میاں کاظم علی، المتخلّص بہ مفتوں از جوانانِ الٰہ آباد ست۔ گاہ گاہ فکر می نماید۔ سلامت باشد۔ از وست:

شکایت کیا رقیبوں کی کروں اُس لاابالی سے　　سمجھتا ہی نہیں کچھ نیک و بد وہ خُرد سالی سے

(۲۴۹) **ممتاز** : شاعرِ دردمند و گداز، حافظ فضل علی المتخلّص بہ ممتاز۔ سررشتۂ طرزِ کلامش استوار و گلِ فکرِ بیانش رشکِ لالہ زار سخنش شاعرانہ و طرزش استادانہ۔ مردے ست حافظِ قراں از شیخ زادہائے شاہ جہاں آباد و از تلامذۂ میرزا محمد رفیع، سودا سلّمہ اللہ۔ شنیدہ ام کہ الحال، بہ طرفِ دکن رفتہ۔ یک مثنوی مسمّٰی بہ لاٹھی نامہ خوب گفتہ کہ سلسلۂ اوراتا بہ عصائے کلیم رسانیدہ، و بسے مانندِ شاخِ گل بر و گل ہائے فکر دوانیدہ۔ چند بیتے ازاں بہ یاد دست، نوشتہ می شود۔ من مثنوی:

ہوتی ہے دنیا میں جو کچھ تحفہ چیز　　سب سے ہے ممتاز کو لاٹھی عزیز
کوچ و مقام اُس کا ہے سب اپنے ہاتھ　　جب کہیں چلیے تو ہے بے عذر ساتھ
ہاتھ میں رکھتے ہیں اُسے ہوش مند　　ڈرتے ہیں سب اُس سے درند اور گزند
کھینچ نہ سکیے جہاں شمشیر و تیغ　　اُس کو لگا بیٹھیے واں بے دریغ
اتنا کم آزار اور ایسا شفیق　　اور بھی کوئی ہے کسی کا رفیق
کس میں یہ توفیق ہے کیجو خیال　　ہاتھ پکڑ گرتے کو لیوے سنبھال
چوب نہیں دل بر خوش خو ہے وہ　　یار ہے وہ قوّتِ بازو ہے وہ
اُس کے گھرانے کو جو کیجے خیال　　چھوٹے بڑے جتنے ہیں سب فی کمال
کوئی تو ہے خامۂ معجز طراز　　کوئی ستم گر ہے نیِ نغمہ ساز
کوئی تو ہے ہم سرِ تیغ و قلم　　نامِ بزرگاں بہ بزرگی علَم،
اُس کے گھرانے کو بڑائی قدیم　　دال ہے اعجازِ عصائے کلیم
بیہدہ رکھنے سے وہ وارستہ ہے　　راستی اپنی پہ کمر بستہ ہے

غرض ازیں قبیل بسیار گفتہ و درہائے معانی سفتہ۔ من اشعارہ:

ہزار مرتبہ دیکھا ستم جدائی کا
ہنوز حوصلہ باقی ہے آشنائی کا

عشق کے غم سے کوئی عیش مقدم نہ سمجھ
یہ عجب طرح کی شادی ہے اسے غم نہ سمجھ م

ڈروں میں کس لیے رنجش سے پیار میں کیا تھا
میں اب خزاں کو جو رووں بہار میں کیا تھا

جفائے یار نے کس طرح کر دیا مایوس
اور اپنی خاطرِ امیدوار میں کیا تھا

ترے ہی واسطے آئے عدم سے ہم یاں تک
وگرنہ ہستیِ ناپائیدار میں کیا تھا

کوئی ہزار دعا مانگے یا کرے تعویذ
لکھا ہوا نہ مٹے کوئی کیا کرے تعویذ

میں تیرے داغ کو رکھتا ہوں اس لیے دل میں
کہ آشنا کا دیا آشنا کرے تعویذ

کیوں کے سرسبز ہو شاہیؔ و گدائی کی ہوس
رہ گئی آہ مرے دل میں خدائی کی ہوس

بال و پر توڑ کے جب تو نے قفس کو سونپا
وہیں آخر ہوئی صیّاد رہائی کی ہوس

طالبِ وصلِ بتاں پھر بھی ہوا ہے ممتاز
دل میں باقی ہے کچھ اک داغِ جدائی کی ہوس

گزرا کبھی شاید کہ وہ بے باک چمن میں
آتا ہے نظر جامۂ گل چاک چمن میں

اک روز میں ممتاز سے پوچھا کہ تو چل باغ
ق
ٹک غنچۂ گل دیکھیے ادراک چمن میں

اتنا ہی کہا سن کے مری بات کو بھر آہ
—
بن یار کروں سیرِ چمن خاک چمن میں

ہمارے رونے میں دل سے بخار اٹھتا ہے
کہ جیسے پانی کے چھڑکے غبار اٹھتا ہے

ہے ان دنوں دلِ نالاں فرنگ کا گھڑیال
رہے رہے کبھی آپ ہی پکار اٹھتا ہے

عشق میں عرضِ تمنا مانعِ دیدار ہے
میرا ہی دستِ دعا منہ پر مرے دیوار ہے

دل کے لے جانے سے کچھ خاطر پر اپنی تو نہ لا
چپ تو رہ ممتاز پھر دیوے گا آخر یار ہے

یاد اس شوخ کی اس دل میں بھری رہتی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ اس گھر میں پری رہتی ہے

گو کہ آنسو نہ رہے تو بھی ہے یاں نم باقی
چشمہ ہر چند کہ ہو خشک تری رہتی ہے

مت ہنر پہ تو ہو نازاں مددِ بخت ہی شرط
قابلیت جو ہے ممتاز دھری رہتی ہے

جو کیفیت نہ ہو مے میں تو کیا خمار میں ہے
جو رنگ و بو نہ ہو گل میں تو کیا بہار میں ہے

جلا پتنگ تو روتی ہے اُس کے حال پہ شمع بلا سے یہ بھی کہیں طور اپنے یار میں ہو
نہ کر تو جبر نصیحت کا ہم پہ اے ممتاز سخن تو کہتے ہیں اُس سے جو اختیار میں ہو
بے نیازی عشق کی وہ کچھ تمھارا ناز یہ اُس کا کیا انجام ہوگا جس کا ہے آغاز یہ

(۲۵۰) **محترم** : از موزونانِ جہان و خوش گویانِ زماں، خاں صاحب مہرباں، محترم خاں، المتخلّص بہ محترم - جوانے ست خوش معاش و یار باش، نوکری پیشہ - ہم راہِ برادرِ خود، خواجہ محمّدی خاں کہ صاحب رسالہ در سرکارِ نوّاب قاسم علی خاں بہادر بود، عمدہ روزگار ماندہ - ہمہ برادرانش شوقِ شعر دارند - دراں میاں از ہمہ طرزِ کلامش مؤثّر - از شاگردانِ شاہ رکن الدّین عشق تخلّص - با فقیر بسیار آشناست - خدایش بہ سلامت دارد - از دست :

جو دل سے گرے اہلِ دلو تم ہی کہو وہ کدھر کا دنیا کا نہ دیں کا نہ اِدھر کا نہ اُدھر کا
آہ ہم سے سیر کو کہاں جائیں یار بن سونی ہیں سبھی جائیں
کوئی تیرا خیال جاتا ہے دل کو ہر چند یار سمجھائیں
ملنے کی میاں ترے ہوس کر رہ جاتا ہے ہائے دل ترس کر
سو بار گر لبوں پہ آ میری جان پہنچے تو بھی نہ دیکھنے کو وہ بدگمان پہنچے
پیغام تو جنوں کے آنے لگے ہیں مجھ تک شاید بہار کے دن نزدیک آن پہنچے
جس نے دیکھی ہو یار کی صورت کب خوش آئے بہار کی صورت
محترم کیا بیاں کروں تجھ سے ق اس دلِ داغ دار کی صورت
خون ہو کر سرشک ہوتا ہے اُس میں ہے جی تی ہے یار کی صورت
پوچھوں اُس کو اگر میں دامن سے شکل بگڑے نگار کی صورت
یعنی مٹتی نہیں ہے آنکھوں سے ہائے رے ہائے یار کی صورت

(۲۵۱) **مجنوں** : مجنوں تخلّص شخصے ست در عظیم آباد - طبع موزوں دارد -

شعرِ خود را پیشِ میر ضیا، سلّمہ اللہ می گزراند - از مذاقِ کلامش بوے دردمندی می آید - از وست:

جی مرا از بس ترا محوِ خیالِ نور تھا
دل سے جو شعلہ اُٹھا تھا سو چراغ طور تھا

دل میں سو سو بار اُس کے روبرو جاتا مجھے
اِس میں سودائی کہے یا کوئی دیوانہ مجھے

کتنا سمجھاؤ کوئی شوخ مرا سمجھے گا
مجھ پہ جو کچھ کہ گزرتی ہے وہ کیا سمجھے گا

خط تو بھیجا ہے پر اب خوف یہی ہے دل میں
میں نے کیا اُس کو لکھا اور وہ کیا سمجھے گا

اب تو بھولا ہے تو باتوں پہ بتاں کی مجنوں
پہ کوئی دن کو مرے یار بھلا سمجھے گا

تیری تو گرد کو بھی نہ ہرگز صبا لگی
اے میری خاک تجھ کو کہاں کی ہوا لگی

نہ دل ہے نہ جگرِ داغ دار پہلو میں
بسا ہے آکے کوئی بے قرار پہلو میں

جب سے آیا ہے وہ مکھڑا نظر آئینے کو
تب سے اپنی بھی نہیں ہے خبر آئینے کو

بھول کر منہ کے تئیں اپنے کہیں دیکھا تھا
بے خودی ہے اِدھر اُس کو اُدھر آئینے کو

سر سے لے پاؤں تلک آب ہوا جاتا ہے
لگ گئی واے یہ کس کی نظر آئینے کو

کچھ اور تو نہ اپنے دل کا سراغ پایا
پھر پھر اُسی جگہ پہ سینے میں داغ پایا

گریاں ہوا رہنے ایک زمیں آسماں رہوں
مانندِ ریگِ شیشۂ ساعت جہاں رہوں

ڈرتا ہی میں تھا سبب دل دار کی آنکھوں سے
مارا نہ مجھے آخر کس پیار کی آنکھوں سے

(۲۵۲) **منشی**: عجائب رام، منشی تخلّص، از شاگردانِ شاہ قدرت در مرشد آباد بہ سر می برد - از مردانِ ہماں دیار ست - گاہ گاہ فکرِ شعر می نماید - ظاہراً منشی ہم باشد - از وست:

تیرے دل سے گرہ کینہ کوئی تب کھولے
غوطہ گر یار سکے آب گہر میں ناخن

(۲۵۳) **مستمند**: از موزونانِ جہاں، یار علی خاں، ساکنِ شاہ جہان آباد، صاحب طبع و دردمند، المتخلص بہ مستمند - از شاگردانِ میرزا فدوی - از وست:

بھلی لینے خبر صیّاد آیا موئے جب ہم اُسے تب یاد آیا

نزع تک وصل کی ہی یار امّید ہی مثل ایک دم ہزار امّید

لگی ہی جس قدر میرے دلِ بے تاب میں آتش نہ دیکھی ہوگی تو نے شمع ایسی خواب میں آتش

(۲۵۴) **مائل** : میاں محمدی، مائل تخلّص از ساکنانِ شاہ جہان آباد ست۔ الحال، در مرشد آباد استقامت دارد، وشعرِ خود را پیشِ شاہ قدرت می گزراند۔ فکرِ معقولے دارد۔ سلامت باشد:

جلوہ گر تو نے مدرسے ہی میں تو ای جانانہ تھا دیر بھی دیکھا تو تیرا خاص خلوت خانہ تھا م

حال کہنے کی نہ دی گریے نے فرصت رات کو آج پھر کہیو اُسے مائل وہ کیا افسانہ تھا م

کیوں نکالے ہی مجھے ہر گھڑی اپنے گھر سے میرے رہنے سے تجھے کیا ہی خلل جاؤں گا م

غیر کے پاس کھڑا تھا میں کہا جا یاں سے لگا کہنے کہ تجھے کیا ہی بے چل جاؤں گا م

تو تو مجھ پر ہو کے غصّہ ایک دم سوتا رہا شمع کے مانند ساری رات میں روتا رہا م

معلوم کچھ نہیں دلِ غم خوار کی خبر کیا جانیے کہ کیا ہی مرے یار کی خبر م

بازاریوں نے گو تجھے کچھ کچھ کہا تو کیا کب معتبر ہی کوچہ و بازار کی خبر م

کیا کیا کہوں میں تجھ سے دلِ زار کی ہوس مشہور ہی جہان میں بیمار کی ہوس م

ہونے دے قیمت آگے ہی ای دل لگا نہ جا دیکھیں کہاں تلک ہی خریدار کی ہوس م

کہتا نہ تھا کہ باز آ ہر دم کی اس ہنسی سے آخر گیا نہ ظالم اک بے گناہ جی سے م

کچھ تعجب نہیں گر مر گیا تیرا مائل یار کیا لگتا ہی انسان کے مرجانے کو م

مارا مجھے تو فکر نہ کر تو کہ یہ تو بات مشہور ہی کہ مار کے پیچھے سنوار ہی م

(۲۵۵) **منتظر** : منتظر تخلّص۔ شخصے ست در مرشد آباد۔ احوالش معلوم نیست۔ ہمیں مطلع بہ گوشش رسیدہ:

حبب کہ برقع سے ترے منہ کا تل آئے باہر دید کو اُس کی سویدائے دل آئے باہر

بندہ معنیِ ایں مطلع ہیچ نہ فہمیدہ ، برائے نام قلمی نمودہ ، الاّ دریں شعر سوائے مناسبتِ خال و سویدائے دل معنی او ربطِ کلام پیدا نیست ۔

(۲۵۶) **معین** : شہرستانِ معانی و باغستانِ سخن دانی طبعش بہ غایت متیں، نظمش نہایت مبیں، شیخ محمّد معین الدّین المتخلّص بہ معین از شہر بدایون ست۔ طرزِ کلامش شاعرانہ و طبعِ دقّت پسندش بر نکتہ چینی دیوانہ۔ اکثر با شعرائے معاصرین بحثش دارد۔ چناں چہ یک بار بہ شعرِ فقیر اعتراضِ بے جا نمود، ہر چند فہمانیدم نہ فہمید۔ سندِ میرزا رفیع دادم قبول نہ کرد۔ گفت دیوانِ میرزا من صحیح دارم، درو ایں طور نیست ۔ غرض ہر جا کہ ہم چنیں لفظ مے یابد دیوانِ استادِ خود را موافقِ طبعِ خود درست می کند، و سخنِ خود را سر سبز مے نماید۔ چوں از شہر بدایون ست حق بہ جانبِ اوست، لیکن با وجودِ ایں ہمہ خود آرائی و خود پسندی مثلِ او ہم صاحب طبع پیدا نیست۔ مثنوی و قصیدہ و ہجو ہمہ خوب می گوید۔ ہجوِ کشمیری و قصیدۂ در مقدّمۂ آب بُرد کہ ہندی ڈوبا می گویند بسیار بہ آب و تاب گفتہ۔ مدّتے در الہ آباد بہ سر بردہ ، الحال، شنیدہ ام کہ بہ طرفِ خیر آباد ست ۔ خیر آباد باشد۔ از وست:

دیں جگہ تیری جفا کو دلِ صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا تجھ بتِ بے باک میں ہم

نقشِ پا کی نمط اے راحتِ جانِ عاشق
تیرے قدموں سے جدا ہو کے ملے خاک میں ہم

تختۂ دل نہیں ہے جو رے نکلے ہے نت قاصدِ اشک
پُرزے حال اپنے کے بھیجے ہیں تجھے ڈاک میں ہم

ایں مضموں بسیار خوب ست لیکن، بندشش درست نیست ، ہر کہ محاورہ دانست می داند۔

خوش ہم عریانی سے اپنی ہیں بہ رنگِ بوئے گل
نکلے جاتے ہیں ٹھہرتے نہیں پوشاک میں ہم

'خوش ہم عریانی' ناموزون ست ، چراکہ میم بار را چناں چسپیدہ است

کہ عین چوں چشمِ غزال از میاں رم کردہ است ، و ایں سخت عیب ست ۔ نیز از وست :

نہ پھرے نالوں سے راتوں کو معین دن اپنے — آہ کب تک رہیں گے گردشِ افلاک میں ہم
یہ جان تاب و تپِ عشق سے جلی افسوس — کسی نے آن کے اک دم خبر نہ لی افسوس
. . . . — نہ آیا یار دو پہری بھی اب ڈھلی افسوس

مصرعِ اولیٰ از خاطر رفتہ است ۔ ایں محاورہ درست نیست ، مردمِ شاہ جہان آباد " دو پہر ڈھلی " می گویند ، نہ " دوپہری " مگر مردمِ بیرونجات ۔

اُٹھائے دیتے ہیں اہلِ محلہ اس کو آج — معیں سے چھٹتی ہی پیارے تری گلی افسوس
بی تاب ہو پتنگ جو فانوس میں ہو شمع — یارب کوئی اسیرِ بتِ خانگی نہ ہو

مضمونِ خوبے یافتہ مگر لفظِ " بتِ خانگی " نامانوس ست فقیر در ہیچ جا نہ شنیدہ ۔

میاں یہ آرسی ہر اک کو منہ دکھاتی ہے — تو ایسی قحبہ سے کیوں انکھڑیاں لڑاتا ہے

(۲۵۷) **مجنوں** : شاہ مجنوں ، مجنوں تخلص ، نومسلم ، نبیرۂ بشن ناتھ کہ دیوانِ محمد شاہ بود ۔ پدرش نیز ہماں مذہب داشت ، ایں غریب مسلماں شدہ ، لیکن ، تا حال بوئے کفر و نفاق از دلش نہ رفتہ ۔ سر و پا برہنہ باحالِ پریشاں می گردد ۔ پیشتر حسرت تخلص داشت ، لعدہٗ حافی نمود ، چوں بہ صحبتِ میر انشاء اللہ رفت مجنوں تخلص کرد ۔ خود را از شاگردانِ میر تقی می شمارد ، لیکن ، ہماں مثل ست " خرِ عیسیٰ اگر بہ مکہ رود ؛ باز آید ہنوز خر باشد " ۔ از وست :

پھر اب یہ جو چلا ہے کل وہ دن قرار ٹھہرا — کہتا ہے مجھ سے چل بے تو کب کا یار ٹھہرا
بوسے کے بدلے گالی دے بیٹھا مجھ کو جھٹ سے — تو اپنے منہ سے آپ ہی بے اعتبار ٹھہرا

(۲۵۸) **مخلص** : بدیع الزماں خاں ، المتخلص بہ مخلص جوانے ست

حسین، عمدہ روزگار، اصلِ او از شاہ جہان آباد ست۔ مدّتے در خدمت فرّاش خانۂ سرکارِ نوّابِ عالیہ سرفراز بود، از چندے معزول شدہ، بہ وطنِ خود رفت۔ از شاگردانِ شاہ واقف۔ جستہ جستہ خوب می گوید۔ با فقیر نیز آشنا ست۔ خدا سلامت دارد:

ہاں نکلتا ہو کبھی نالہ جگر سے باہر — اِن دنوں تیری ہے تاثیر اثر سے باہر
شب کو خورشید صفت صبح کو مانندِ ہلال — دیکھنا اُس کا تو ہے شام و سحر سے باہر
لے جا تو دل کو یوں تو ترا اعتبار ہے — پر شرط اس زمانے میں قول و قرار ہے

(۲۵۹) **محمدّ علی خاں**: محمدّ علی خاں، ولدِ نعیم اللہ خاں، مشہور بہ بہ مرزائی، مردے ست بہ کمالِ قابلیّت و انسانیّت، خوش معاش و عمدہ روزگار، در سرکارِ نوّابِ عالیہ اکثر بہ خدماتِ دور دست سرافراز می شود۔ در علمِ موسیقی ہم دستے بہم رسانیدہ، و ذوقے پیدا کردہ۔ بیشتر مشغول بہ ہمین ست، گاہ گاہے دو سہ شعر ہم می گوید۔ حق تعالیٰ سلامت دارد:

جو کوئی کسی کو یار کلپائے گا — س یہ یاد رہے وہ بھی نہ کل پائے گا
اِس دورِ مکافات میں سُن ای غافل — بیداد کرے گا آج کل پائے گا

(۲۶۰) **محشر**: مرزا علی نقی، محشر تخلّص، از کشمیر ست، در بلدۂ لکھنؤ استقامت دارد، لیکن واقعی کہ تخلّص قیامت دارد۔ سلامت باشد۔ از دست:

دریا میں لے کے لاش کو میری بہا دیا — قاتل نے میرے قتل کا یہ خوں بہا دیا

(۲۶۱) **مصحفی**: بہارستانِ باغِ سخن دانی و چمنستانِ گلزارِ معانی، شیخ ہمدانی، المتخلّص بہ مصحفی۔ طبعِ روانش جدولِ کتابِ فصاحت و

فکرِ بیانش مسطرِ بیاضِ بلاغت۔ رنگینیِ نظمش سرخیِ بابِ گلستاں، و پیچیدگیِ الفاظش چوں سنبلِ بوستاں۔ از نجبائے امروہہ، مولدش اکبر پور کہ قصبہ ایست متصلِ دہلی، وطنِ بزرگانش از قدیم۔ الحال، در شاہ جہاں آباد بہ پیشۂ تجارت بہ سر می برد۔ از دیوانِ او دو سہ جزو بہ نظر درآمدہ، قصیدہ و غزل و مثنوی ہمہ خوب۔ کلامش بیشتر شاعرانہ۔ از تخلصِ او معلوم می شود کہ مردے صالح ست۔ برائے حجّام پسر مثنویِ خوب گفتہ، چناں چہ ایں چند شعر قلمی مے نماید۔ از مثنویِ اوست:

زبس آئینہ رو ہے طفلِ حجّام　　نہیں بِن دیکھے اُس کے دل کو آرام
جو دیکھے انگلیاں وہ گوری گوری　　بنے خورشید پانی کی کٹوری
وہ جس کے روبہ رو ناگاہ آیا　　اُسے حیرت نے آئینہ دکھایا
ملا جب آئینے کو ایسا نائی　　بتائی چار ابرو کو صفائی
نہ کھینچے خامۂ مو اُس کی تمثال　　کہ وہ ہے عاشقوں کی ناک کا بال
سُنے ہے مصحفی اب تو بھی فی الحال　　منڈا کر سر کو ہو جا فارغ البال

من غزلیاتہ:

برہم زنِ تقریر نہیں پیر و جواں کا　　جوں غنچہ میں عقدہ ہوں پر اپنی ہی زباں کا
پیری میں اور بھی ہوئے غافل ہزار حیف　　بے اختیار لے گئی ہم کو یہ خوابِ صبح
گُل کترے نہ بلبل مری فریاد کے آگے　　سرسبز ہو شاگرد کب استاد کے آگے
ایک دن رو کے نکالی تھی میں واں کلفتِ دل　　اب تلک دامنِ صحرا ہے غبار آلودہ
تلخ ہو بولنے میں اُس کے ادا ہے کچھ اور　　چھیڑ کر گالیاں کھانے میں مزہ ہے کچھ اور
مار ڈالا ہے مجھے زلف کی دکھلا کے لٹیں　　بے وفا تس پہ بھی کہتا جفا ہے کچھ اور
دلا تا چند آہ و نالہ بس کر　　کوئی دم تو بھلا ضبطِ نفس کر

کوئی خوابیدہ ہم سے جاگتے ہیں
نہ اتنی سعی ای بانگِ جرس کر

جہاں کا گل بنے وہ شوخ یارب
مجھے تو اُس چمن کا خار و خس کر

ہے اُس کی آئینے میں خط و خال پر نظر
کرتا ہے کب ہمارے وہ احوال پر نظر

قلیاں ہوا ہے جب سے لبِ یار کا ندیم
مشتاقِ بوسہ رکھتے ہیں مہنال پر نظر

اک حشرِ تازہ ہووے گا دیوانِ حشر میں
جب ہم کریں گے نامۂ اعمال پر نظر

یارِ یہ دونوں اگر کم ہوں تو کم ہی بہتر
نہ ترا پیار بھلا اور نہ ستم ہی بہتر

اور نا فہم مری جان کوئی کیا سمجھے
کہ سمجھتے ہیں تری بات کو ہم ہی بہتر

آ چکا خط پہ سرِ مو نہ گیا ناز ہنوز
ہے اسی ڈھب پہ نگاہِ غلط انداز ہنوز

بے پر و بال کیا تو بھی قفس میں مجھ کو
چین دیتی ہی نہیں شوخیِ پرواز ہنوز

ہوں میں ای مصحفی آئینہ تہِ زنگ دلے
مجھ سے غافل ہے مرا آئینہ پرداز ہنوز

ہے دل بردوں میں تو ہی عاشقوں کا اک خوں ریز
لہو بھرا ترا دامن ہے ہم کو دست آویز

اُٹھا غبار تو وہ بھی ہوا مشابہِ خط
سوائے ہند کے دیکھی نہ خاک قابلِ خیز

بادل سے برستے ہیں مرے دیدۂ تر روز
ساون کا سا گزرے ہے میاں مجھ پہ تو ہر روز

اغیار کی مجلس میں جو تم جاتے ہو شب کو
آ رہتی ہے اِس بات کی ہم تک بھی خبر روز

ای مصحفی اُس کوچے میں دل بس کہ لگا ہے
جاتے نہیں اور کرتے ہیں ہم عزمِ سفر روز

شوق سے لکھیے اگر جانبِ جاناں کاغذ
ہو کبوتر کی طرح آپ پر افشاں کاغذ

دل بہ دل راہ جنھیں ہوتی ہے وہ آپس میں
بھیجتے رہتے ہیں نت غیر سے پنہاں کاغذ

پُرزے پُرزے جو کوئی ہو سو لکھے نامۂ شوق
بھیجنا یار کو ایسا نہیں آساں کاغذ

ہوئی ہے بس کہ یہ فصلِ بہار دامن گیر
چلیں چمن سے تو ہوتا ہے خار دامن گیر

سمجھ کے رکھیو قدم دل جلوں کی تربت پر
مباد ہو کوئی تیرا شرار دامن گیر

دفعتاً ای پیکِ نگہ دیدۂ تر ہے در پیش
دن ہیں برسات کے اور رہ میں خطر ہے در پیش

دلِ حیراں کی مرے دیکھیے صورت کیا ہو　　اب تو واں آئینہ ہی آٹھ پہر ہی درپیش

کرے ہی جوں جوں اپنے حسن کی وہ شوخ آرائش　　ہمارے عشق کی ہوتی ہی یاں اُتنی ہی افزائش

نہیں کچھ مصحفیؔ اتنا تو مفلس سوچتے کیا ہو　　بہ طورِ امتحاں کیجے کبھی اُس سے بھی فرمائش

دیکھ لیتے ہیں ہم اِس سے گاہ گاہے روئے گل　　تا ابد رہیو سلامت چاکِ دیوارِ قفس

ہی نہاں داغِ جگر زخمِ نمایاں کے تلے　　جس طرح لالہ کہیں ہو گلِ خنداں کے تلے

آشیاں بندی کی تکلیف نہ کر ہم کو ہوس　　گر رہیں گے کسی دیوارِ گلستاں کے تلے

(۲۶۲) مجذوبؔ

: فصاحت بیان و بلاغت نشاں، بہار پیرائے عبارت خوش اسلوبی، چمن آرائے معانیِ مرغوب، میرزا غلام حیدر، المتخلص بہ مجذوب، خلف استادِ استاداں، میرزا محمد رفیع، سوداؔ، سلمہ اللہ تعالیٰ۔ اگرچہ دیر آشناست، لیکن با ہر کہ آشناست آشناست۔ علوِّ طبیعتش باوجودِ سخن دانی بہ خاموشی مربوط، و مزاجش بہ کمالِ کم گوئی مبسوط۔ الحق:

خاموشی کہ داشت علی از کمال داشت　　آبِ گہر بہ موجِ صدا نیست آشنا

گاہ گاہ از غزل و شعر فکری می نماید۔ خدا ایش سلامت دارد۔ از وست:

اشک آنکھ میں ہو عشق سے تا دل میں غم رہے　　یہ گھر ہی وہ خراب جو آتش سے نم رہے

چھوٹے اگر قفس سے تو خاموش عندلیب　　صیاد نے سنا یہ ترانہ تو ہم رہے

چمن میں حسن کی مے جب وہ گل اندام لے آیا　　ادھر غنچہ صراحی اور اُدھر گل جام لے آیا

عجب قسمت ہی اپنے دل کی بازارِ محبت میں　　جو کوئی صبح اِس کو لے گیا تو شام لے آیا

خوباں سے جو دل ملا کرے گا　　دھڑکا ہی یہی کہ کیا کرے گا

شکر ہم اس طرح جہاں سے چلے　　یاد ہی کچھ نہیں کہاں سے چلے

چاہوں مدد کسی سے نہ اغیار کے لیے　　میں بھی تو یار کم نہیں دو چار کے لیے

طوبیٰ کے نیچے بیٹھ کے روؤں گا زار زار　　جنت میں تیرے سایۂ دیوار کے لیے

مجذوب بہرِ سُبحہ وہ منّت تھی شیخ سے — پھر یہ ہمیں سے عجز ہی زنّار کے لیے

ہمیں کیا لطف ہی منہ دیکھنا واں یار کا اپنے — جہاں وعدہ اُسے عالم سے ہو دیدار کا اپنے

کیا ہی دل نے مستغنی وصالِ یار سے ہم کو — تصور دل میں نت رہتا ہی اُس دلدار کا اپنے

گھر امن کا اُسی کو ملا آسماں تلے — جس نے جہاں میں آن کے مسمار کی ہوس

بتاں قربانیِ عشّاق کی تمہید کرتے ہیں — لگا منہدی کو ہاتھوں میں یہ ظالم عید کرتے ہیں

کہو کس طرح تم سے بحث کر میں پیش لے جاؤں — تمھارے ہی سخن کی مل کے سب تائید کرتے ہیں

بھڑک اُٹھتا ہی شعلے کی طرح ہر نخل ای بلبل — چمن میں گر ترے نالے کی ہم تقلید کرتے ہیں

خط بھی نکلے گا ترے ای ماہ دن دو چار میں — غیر کی معلوم ہو گی چاہ دن دو چار میں

اب تو مجذوب اُس صنم کے قول پر بھولا ہی تو — یاد آئے گا اب تجھے اللہ دن دو چار میں

آہ میں اپنی ثمر ڈھونڈے ہی ای مجذوب تو — سرو میں ہم نے لگیں اب تک پھلیاں دیکھیاں

عداوت سے تمھاری کچھ اگر ہوئے تو میں جانوں — بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہوئے تو میں جانوں

تمھارا ہم سے جو عہدِ وفا ہی اُس کی تم جانو — مرے بیاں میں کچھ نوعِ دگر ہوئے تو میں جانوں

نہ اندیشہ کرو پیارے کہ شب ہی وصل کی تھوڑی — تم اپنی زلف کو کھولو سحر ہوئے تو میں جانوں

اشراف یا کمینہ طلب گار ہو کوئی — دوں گا اُسی کو دل جو طرح دار ہو کوئی

نہ سایۂ چمن میں، نہ صیّاد کے حضور — یا رب مری طرح نہ گرفتار ہو کوئی

دیکھوں ہوں میں نقاب میں رخسار گاہ گاہ — حق کا منظر پڑے ہی یہ اسرار گاہ گاہ

ہر وقت کی طلب سے مبادا اُسے ہو قدر — دل مانگتا ہی مجھ سے وہ عیّار گاہ گاہ

گزرے ہی یوں خیالِ وطن جوں کرے ہی یاد — خوگردۂ قفس گل و گلزار گاہ گاہ

طاقت کہاں کہ حال کہے اب طبیب سے — ٹھنڈی بھرے ہی سانس یہ بیمار گاہ گاہ

رسوا تو یہ ہوا ہوں کہ ناصح کی بات کا — کر بیٹھتا ہوں دل میں میں اقرار گاہ گاہ

آئے بھی مسیحا مری بالیں پہ تو کیا ہو — بیمار یہ ایسا تو نہیں جس کو شفا ہو

مجذوب ترے عجز و تکبر سے ہوں نالاں | بندہ کبھی ہو بیٹھے ہے تو گاہ خدا ہو
جور و جفا پہ یار کی دل مت نگاہ کر | اپنی طرف سے ہوئے جہاں تک نباہ کر
مجذوب گر ہے خواہشِ عشقِ بتاں تجھے | ایمان و دین و دل کو تو پہلے تباہ کر
ہم سے ہو خفا غیر سے نرباہ کرے ہے | یوسف تو مرا اوروں کی اب چاہ کرے ہے
زلفوں کی گرہ دینے سے کچھ فائدہ ای یار | ناحق تو مری عمر کو کوتاہ کرے ہے
اعجاز جو تجھ لب کے کرے گوش فلک پر | عیسیٰ کے رہیں سُن کے نہ پھر ہوش فلک پر
پھرتا تجھے خورشید جو دیکھے بہ سرِ بام | گردش کو کرے اپنی فراموش فلک پر
تیری ہی سن کے رہتا ہوں میں سخت ایک دو | ہیں غیر میرے سامنے کیا رخت ایک دو
خط آئے پر یہ کثرتِ عشاق پھر کہاں | مجذوب سے رہے کوئی کم بخت ایک دو
بد کہنے کو کسی کے معیوب جانتے ہیں | اپنے تئیں کو یارو ہم خوب جانتے ہیں
خاطر میں کون لائے میرا سخن کہ مجھ کو | سودا کا سن کے بیٹا مجذوب جانتے ہیں

(۲۶۳) **مدّعا**: میر عوض علی، اصلش از شاہ جہان آباد ست۔ مردِ بشاش و بشاش، کشادہ پیشانی، خوش معاش، متواضع و یار باش۔ شاعرِ بے نظیر و منشیِ خوش تحریر، مخزنِ اشعارِ غرّا، معدنِ انشا و املا، المتخلّص بہ مدّعا۔ طبیبِ خوش نصیب، بہ حذاقت قریب۔ بہ عنایاتِ یزدانی از راہِ قدر شناسی و نکتہ دانی خانِ عالی شاں، خلفِ حافظ رحمت، عنایت خاں غفر اللہ لہ، سہ صد روپیہ می داد۔ چندے در بریلی اقامت داشت، الحال معلوم نیست کہ کجاست۔ از اشعارِ ریختۂ او کم بہ نظر آمدہ، مگر، ایں چند بیت کہ در تہنیتِ شادیِ خانِ بلند مکاں، محبت خاں، سلمہ اللہ در زمینِ قصیدۂ لیک ٹیک گفتہ، چناں چہ بہ نگارش می آید۔ بعضے مضامینِ تازہ یافتہ، در زبانِ افاغنہ بستہ است۔ خدایش سلامت دارد۔ از وست:

پھر ہے بادل شدگاں درپئے آزار فلک — متصل چھڑکے ہے ناسور پہ چھاتی کے نمک

در شادی:

ماہ نے کھول دیا ہے کفِ سیمیں اپنا — دوسرا ہاتھ جو پایا تو بجایا دستک
نشۂ عیش سے ہے سرو یہاں تک سرشار — کہ لیا چاہے ہے غنچے کے نمکداں سے گزک
حسن کے خلوتیاں بزمِ حنابندی میں — شعلے سے باندھیں ہیں پروانے کے پاؤں کفک
محفلِ عیش میں بلبل نے بجائی شہنا — گوشۂ باغ میں غنچے نے اٹھائی ڈھولک

در مدحِ معشوقاں:

غمزہ یہ گرم کہ ہو برق زنِ خرمنِ عمر — عشوہ یہ ظلم کہ ہو رہ زنِ قومِ زدک
چشمِ آشوبِ قیامت سے لکھائے محضر — صفِ محشر کو الٹ مارے ہے ہر ایک پلک
شعلۂ حسن کی گرمی سے عرق ریز جبیں — دیکھی ہوگی کبھی مہتاب میں موتی کی ڈھلک
قلقلِ شیشہ یہ کہتا ہے کہ مت بیٹھ خموش — جام مارے ہے صفِ بادہ کشاں پر چشمک
ساقیِ شوخ کہے ہے کہ غنیمت ہے وقت — ساغرِ عمر تو لب ریز ہے مت جائے چھلک
شیخ اگر کچھ بھی ہے غیرت کی ترے دل میں ترنگ — ساغر و شیشہ اٹھا سبحہ و سجادہ پٹک
جشنِ نوابِ فلک رتبہ محبت خاں ہے — جس کی شادی میں ہیں سب جمع بزرگ و کوچک

سرودِ روہیلہ ہا:

لختے زادوں کو جو دیکھو تو بہ ہنگامِ سرود — مچ رہا ہے یہی غل رشتہ ہلک ہلک

تعریفِ اسپِ ممدوح:

وہ جو گل گون سواری کا ہے تیری مخصوص — کیا کہوں وصف یہاں عقل چلی جائے بہک
مہِ نو نعل ہے اور کاہکشاں بہر قطاس — اس کی مدرس ہے فلک پر یہ مرصع اور تنگ
کیا بیاں جلدی کا اس کی ہے کہ جوں مرغِ دعا — ہاتھ اٹھانے میں گیا فرش سے لے عرش تلک
گر مصور کرے تصویر کو اس کی منظور — قبضۂ وہم سے اڑ جائے ہے بے شبہہ و شک

ازیں قبیل تعریف ہر یکے نمودہ، بعدِ قصیدۂ میرزا رفیع، سودا دریں زمیں الحق کہ خوب گفتہ است۔

(۲۶۴) **محبتؔ** : نوابِ ذی شاں، نواب محبت خاں، خلفِ حافظ الملک، حافظ رحمت خاں۔ المتخلص بہ محبت۔ باوجودِ اسبابِ امارت طبعِ موزوں بہ تواضع مقروں دارد۔ بعضے اوقات کہ آں منبعِ جود و سخا قدردانِ شعرا بہ مضمونِ تازہ مائل می شود، بہ اصلاحِ خواجہ حسن یا میاں حسرت جرات نمودہ، اشعارِ برجستہ ادا می نماید۔ اکثر با صاحب سخنانِ زماں از روے خوش خلقی صحبت می دارد۔ از مغتنماتِ وقت ست۔ سلمہ اللہ:

آپ کچھ غیروں کو چھپ چھپ کے رقم کرتے ہیں — یہ جو ہے جھوٹ تو ہم ہاتھ قلم کرتے ہیں
مذکور جو مجلس میں ہوا دوش کسی کا — سنتے ہی ٹھکانے نہ رہا ہوش کسی کا
تھا ارادہ تو نہ آتے اب کے ہم تیری طرف — پر کریں کیا جو پڑا اپنا قدم تیری طرف
غور کیجو ٹک محبت کی نگہ سے حسرتیں — نزع میں بھی دیکھتا ہے دم بہ دم تیری طرف
زلف سے تیری اتصال ہوا — خوش مرا آج بال بال ہوا
عاشقوں میں مجھے لکھا تو نے — آج چہرہ مرا بہ حال ہوا
غیر کے گھر قدم رکھا تو نے — دل محبت کا پایمال ہوا
دیکھتے تھے جو کہ ہم عشق اب تجھے دکھلائے گا — کوئی دن میں آپ تو اپنے کیے کو پائے گا
جوں ہمارا دل نہیں لاتا تھا نگیوں میں تری — اس کے کوچے میں تو اے دل اب تجھے لے جائے گا
کی کس نے دلا تجھ پہ یہ بیداد بغل میں — سنتا ہوں جو ہر شب تری فریاد بغل میں
اس یار سے کچھ مجھ کو نہیں شکوہ جفا کا — جو ہے سو یہ اپنا ستم ایجاد بغل میں
کیا دیوے گا کوئی ہمیں تعلیمِ محبت — رکھتے ہیں ہم اس فن کا تو استاد بغل میں
درویش کی خوبی تو تونگر میں نہیں ہے — اکسیر میں جو کام ہے سو زر میں نہیں ہے

دل برتو مرا کل سے نہیں ناصح مشفق
آج اور تماشا ہے کہ دل بر ہیں نہیں ہے
نہیں ملتا ہے تو مجھ سے بتِ خودکام کس باعث
نہ ملتا تھا تو پھر مجھ کو کیا بدنام کس باعث
یوں دیکھتا ہوں زلفِ سیہ فام کی طرف
گھبرا کے صید دیکھے ہے جوں دام کی طرف
جی چاہے بوسہ دے مجھے جی چاہے اور کچھ
دیکھو پرا اپنے دیکھ کے تو نام کی طرف
ہوا سردار پر منصور کے ہونے سے یوں ظاہر
کہ بعد از مرگ بھی عاشق کی سرداری نہیں جاتی
جو چاہے ہوش تو بے ہوش ہو جامِ محبت سے
یہ بے ہوشی ہے ایسی جس سے ہشیاری نہیں جاتی

(۲۶۵) مدہوش : صاحبِ ہوش و گوش، میر نبی جان، المتخلص بہ مدہوش، نبیرۂ حضرت خواجہ محمد باسط، قدس سرہٗ۔ جوانے ست خوش رو و نیک خو، از شاگردانِ میر سوز، سلمہ۔ ہنوز ابتدائے مشق ست، اگر زمانہ فرصت می دہد، گاہ گاہے دو سہ شعر می گوید۔ با فقیر بسیار آشنا ست۔ سلامت باشد۔ از وست :

لیا جس ناز سے تو نے مرا دل
خدا جانے ہے اس کو یا ترا دل

(۲۶۶) مشتاق : میر حسن، متخلص بہ مشتاق از سلکِ متوسطین، مولدِ وے شاہ جہان آباد ست۔ اکثر شعرا در اطرافِ شہر مشہور اند۔ با فقیر در نصف آباد ملاقات شدہ است، در احاطۂ ایلچ خاں مسکن دارد۔ گاہ گاہے در بازار برخوردہ می شود۔ ظاہرا بہ پیشۂ معلمی جاے قرار دارد۔ عمر شش قریب بہ شصت رسیدہ باشد، لیکن، با ایں بزرگی بہ عجز و انکسار پیش می آید۔ غرض منصف مزاج ست۔ چند اشعار اد بہ دست آمدہ بود، بہ طورِ متوسطین می گوید :

نہ لطف نہ کچھ مہر نہ کچھ پیار ہی دیکھا
ظالم سے جو دیکھا سو میں آزار ہی دیکھا
مشتاق کو کیا غم ہے خدا جانیے یارو
جب دیکھا اسے ہم نے تو بیمار ہی دیکھا

جو ناز ساتھ آگئے نازک مزاجیاں تھیں
اب تو وہ رفتہ رفتہ بیداد ہو چلی ہیں

ہم غریبوں کی اگر تو نے نہ کی غم خوارگی
جو رضا تیری پیارے بندگی بے چارگی

نہیں اس قدر دل لگانے کی دہشت
جو کچھ ہم کو ہے اس زمانے کی دہشت

ملا تو ہوں تجھ سے مری جان لیکن
ابھی دل میں ہے روٹھ جانے کی دہشت

چلے تم میرے چشم و دل سے ای سرو رواں کیدھر
مکاں پیدا کیا ہے دوسرا ای میری جاں کیدھر

غنیمت جان لے مشتاق یہ رنج و تعب اپنا
جہاں دم چل بسا یاں سے تو پھر آہ و فغاں کیدھر

پاسِ خاطر ہم غریبوں کی کہاں منظور ہے
تو تو اپنے حسن ہی پر مہرباں مغرور ہے

جی میں خطرہ بھی نہیں تیرا اگر زنہار لطفِ یار آئے
سینہ و دل حسرتوں سے یاں تلک معمور ہے

یار جب تک کہ آشنائی ہے
ہم ہیں اور تیری بے وفائی ہے

اپنی ہم بندگی یہ بھولے تھے
پھر جو دیکھا تو واں خدائی ہے

حرفِ (ن)

متقدّمین

(۲۶۷) **نوری** : ملا نوری، از قاضی زادہا ے قصبۂ اعظم پور بود۔ با ملاّ فیضی کمال ربط داشت۔ شعرِ فارسی می گفت، گاہ گاہے ہندی ہم می گفت۔ از تذکرۂ محمد قائم ہمیں یک شعر یافتہ شد، قلمی می نماید۔ از وست:

ہر کس کہ خیانت البتّہ بہ ترسد
بے چارۂ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

(۲۶۸) **نامی** : نامی تخلص از نام داران دیارِ دکن ست، بہ زبانِ شہرِ خود دیوانِ خوبے دارد۔ چوں بنیادِ ریختہ اوّل از زبانِ دکن ست بنابریں

صاحب سخنانِ ایں فن و معنی شناسانِ مغز سخن طرزِ زبانِ ہر دیار را معیوب نہ می دانند و پیرویِ معانی می کنند۔ حاصلِ کلامؒ از کلامِ نامی بوے دردمندی ہویداست۔ رحمہ اللہ۔ از وست :

مجھ کو برہ کے پنتھ میں کاہل نکو کرو | یعنی اپس کی یاد سے غافل نکو کرو
ہم دل دیا تمھن کو لبھاو نکو ہمن | دل ہاتھ لو مرا مجھے بے دل نکو کرو
کاٹو جلاؤ راکھ کرو راضی ہیں ہمن | سب کچھ کرو پر ایک کٹھن دل نکو کرو
اوراں ترے ہیں یار ہمن ہیں ترے غلام | اوراں کے ساتھ نامی کو شامل نکو کرو

(۲۶۹) **نوری** : سید شجاع الدین دیگر نوری تخلص، از ساداتِ بلدہ گجرات ست۔ نوکری پیشہ، مدتے بہ علاقہ روزگار در حیدرآباد بہ سر بردہ از بس کہ قابلیت داشت، و مردمِ آں دیار دراں وقت قابل دوست بودند، رفتہ رفتہ بہ تعلیم پسرِ وزیرِ سلطان ابوالحسن، تانا شاہ مقرر گشت، و عروجے بہم رسانید۔ آخرالامر، حاسدانِ آں دیار او را بہ محبتِ وزیرزادہ متہم ساختند، بے چارہ از آں جا غربت گزیدہ، در بلدہ سرہند استقامت ورزید، چندے بہ سر بردہ، بہ رحمتِ الٰہی پیوست۔ غفراللہ لہ۔ از وست :

نوری اپس کے دل کی کسی سے نہ کہہ سکا | حاصل بھلا اب اِس سے دوانے جو تھا سو تھا م

(۲۷۰) **ندیم** : از شعراے قدیم، میرزا علی قلی، ندیم تخلص متوطنِ شاہ جہاں آباد۔ مردے بود بہ کمالِ قابلیت شعرِ فارسی و مرثیہ و ریختہ بہ خوبی می گفت، چناں چہ اکثر مرثیہ ہاے او مشہور اند۔ رحمہ اللہ۔ از وست :

جدائی میں تری ہم کیا کہیں کس طرح جلتے ہیں | بہ جاے مو بدن سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں م

بے قرارِ عشق کو ہے زندگی نقصِ کمال
مر چکے سیماب تب کہتے ہیں یہ اکسیر ہے م

متوسّطین

(۲۷۱) ناجی : محمّد شاکر، ناجی تخلّص، معاصرِ میاں آبرو، اوائلِ سلطنتِ محمّد شاہ، مردے ظریف طبع بود۔ اکثر از لطائف و ظرائف مردماں را بہ خندہ می آورد، و خود نہ می خندید۔ مگر، تبسّمے می کرد۔ متوطّنِ شاہ جہان آباد بود۔ تلاشش صنعتِ ایہام بسیار داشت کہ رائج الوقتِ متوسّطین بود۔ خدا ایشں بیامرزد۔ ازوست :

نمکین حسن دیکھ کر پی کا — رنگ گل کا لگا مجھے پھیکا ن
دیکھ موہن تری کمر کی طرف — پھر گیا مانی اپنے گھر کی طرف نم
رکھیو مت چشم کرم دولت سے اپنے خورد کی — لب صدف کے تر نہیں ہر چند ہے گوہر میں آب ن
تری نگاہ کی گرمی سے ای کماں ابرو — ہمارے سینے میں تودہ ہوا ہے تیروں کا ن
پیالہ پیوے ہے سو نہوروں سے — کھولے ہے لب ہزار زوروں سے نم
کریو کرم ای دوستاں پھر ہم کہاں اور تم کہاں — نہیں دیکھ سکتا آسماں پھر ہم کہاں اور تم کہاں
آج تو ناجی سجن سے کرے اپنا عرض حال — جینے مرنے کا نہ کر وسواس ہونا ہو سو ہو
غم نہیں گر دل بری سے دل کو لے جاتا ہے وہ — پاس میرے تب تو آتا ہے جو دل پاتا ہے وہ
تبسّم یہ رقیبوں سے خلل ہے — تری بھاویں یہ ہنسی میری اجل ہے
کیا فردا کا وعدہ سرو قد نے — قیامت کا جو دن سنتے تھے کل ہے
ہوا جب آئینے میں جلوہ گر تب میں لیا بوسہ — جو آیا اپنے قابو میں تو پھر منہ دیکھنا کیا ہے
نرگس کے تئیں میں ہرگز لاتا نہیں نظر میں — دیکھی ہیں میں نے پیارے آخر تمھاری آنکھیں
مجھ کو باتوں میں لگا کیا جانیے کیا کہہ گیا — لے چلا جب دل کے تئیں منہ دیکھتا میں رہ گیا
ڈوب گئے کئی ملک جب کھولی لبِ دریا یہ زلف — حیف ناجی کو نہ پوچھا کس لہر میں بہ گیا

م جو کوئی کچھ کہے تو پگھل جائے — شمع رو ہی ہمارا موم کی ناک

م نہ سیرِ باغ نہ ملنا نہ میٹھی باتیں ہیں — یہ دن بہار کے ای جان مفت جاتے ہیں

م ہمیں تو بوسہ نہ دینے کہا نہ کہ کے دیا — جنھوں سے وعدہ کیا ہی اُنھیں جتاتے ہیں

م اُس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں — عارضی میری زندگانی ہی

م تجھ کو کیوں کر جدا کروں ای جان — زندگانی بہت پیاری ہی

م جان ہی جیوڑا ہی دل بر ہی — پر یہ مشکل کہ طالبِ زر ہی

م لبِ جاں بخش آ گئے تیرے سخن — جو مسیحا کا نام لے خر ہی

م اِن بتوں کو ہم فقیروں سے کہو کیا کام ہی — یہ تو طالب زر کے ہیں اور یاں خدا کا نام ہی

م سخن سن اُس بتِ کافر ادا کا — جیا ہوگا کوئی بندہ خدا کا

م نہ پوچھو خود بہ خود ہی عارضِ خورشید کی خوبی — لیا ہی ذرہ ذرہ حسنِ مہ رویاں سے کر جدا

م بلند آواز سے گھڑیاں کہتا ہی کہ ای غافل — کٹی یہ بھی گھڑی تجھ عمر سے اور تو نہیں چیتا

(۲۷۲) نادر: نادر تخلص مردے در عہدِ محمد شاہ، غفر اللہ، در کوٹلۂ فیروز شاہ می ماند۔ بہ ندرت سخن می گفت، اشعارش کم بہم می رسد۔ مثل مشہور ست کہ النادر کالمعدوم۔ فکرش پر مایہ و سخنش با استاداں ہم پایہ۔ خدایش بیامرزد۔ از وست:

م زلف کو کہنا پریشاں عقل کی دوری ہی یہ — ہر گرہ میں اس کی دل ہی گانٹھ کی پوری ہی یہ

م دل بر کہیں ہو چشم سے عاشق کے دور نہیں — دل مل رہے ہیں چشم کا ملنا ضرور نہیں

م لیتی ہی جا ہی مکھڑے سے خورشید رو کے زلف — اتنی بڑی ہوئی ہی یہ ذرہ شعور نہیں

(۲۷۳) نور اللہ: میرزا نور اللہ از مردم شاہ جہان آباد بود کہ بر یک فرنگی بچہ تعشق بہم رسانیدہ، آوارہ می گشت، یعنی کارش بہ سودا کشیدہ بود۔ دگر احوالش معلوم نیست۔ از وست:

کبھی تو آ کے مرے دل کے داغ کو دیکھو — یہ یوں جلے ہے کہ جیسے چراغ کو دیکھو

(۲۷۴) مرزا مدّو: علی نواز خاں، عرف مرزا مدّو از عمدہ رفقایانِ عمدۃ الملک بودند، چناں چہ الحال، در ہمیں شہر موجود اند این شعر بہ نامِ او شنیدہ شد۔ خدایش سلامت دارد:

بہار آئی سنی اڑتی خبر سی — چمن میں آج ہے بلبل کی برسی

(۲۷۵) نزار: خواجہ محمّد اکرم، المتخلّص بہ نزار، از شاگردانِ میر تقی ست۔ فقیر او را نہ دیدہ، ہمیں غزل بہ نامِ او شنیدہ، چناں چہ بہ نگارش می آرد۔ از وست:

کیا کہیے غرض صبر کا مقدور نہیں ہے — اک زخم نہیں دل پہ کہ ناسور نہیں ہے

ہر طرح کی باتیں ہیں تری بزم میں پر ایک — افسانہ مرے حال کا مذکور نہیں ہے

آنا ہے تو آ جا مری بالیں پہ وگر نہ — کوئی دم میں سنے گا کہ یہ رنجور نہیں ہے

کیا پرسشِ احوالِ جگر سوختۂ عشق — اِس مملکتِ حسن میں دستور نہیں ہے

نزدیک ہے مرنے کے وفا کشتہ نزار اب
ٹک دیکھتے چلیے تو بہت دور نہیں ہے

(۲۷۶) نثار: میر عبدالرّسول نثار، از نجبائے روزگار و از شرفائے نام دار۔ مردے ست سنجیدہ و فہمیدہ، اصلش از اکبر آباد ست و بزرگانش در عصرِ فرّخ سیر بہ اقتدار بہ سر می بردند۔ بندہ او را در شاہ جہان آباد دیدہ بود۔ از یارانِ میر محمّد تقی ست طبعش و فکرش مسرّت افزا سلمہ اللہ۔ الحال، احوالش معلوم نیست کہ کجاست، ہر جا کہ ہست سلامت باشد۔ از وست:

جو ہے یعقوب یوسف دیکھنا منظور آنکھوں سے — تو اتنا پھوٹ کر مت رو کہ جائے نور آنکھوں سے

ٹک دیکھ تو چمن کا کیسا ہی ڈھنگ تجھ بن — منہ سے اُڑا ہی گل کے گلشن میں رنگ تجھ بن نم

ہر سمت صد تمنا تڑپے ہی خاک و خوں میں — ہی صحنِ خانہ میرا میدانِ جنگ تجھ بن نم

یاں گل رکھے پھرے ہی دستار پر تو اپنی — واں عاشقوں کے سر پر پڑتے ہیں سنگ تجھ بن نم

جی کرتے نثار اُس پہ ڈرون ہمیں ہیں کہ وہ شوخ — اِس بھی حرکت سے کہیں بیزار نہ ہوئے

ہاتھ سے اِن جامہ زیبوں کے نکل جائیں گے ہم — یہ گریباں دامنِ صحرا کو دکھلائیں گے ہم نم

کیا ہوا ہم بھی جو دنیا میں یہ ناشاد رہے — تو سلامت رہے اور یہ تری بیداد رہے

مے نہ مینا میں رہے ایسے نہ فانوس میں شمع — شیشۂ دل میں مے جوں د پری زاد رہے

انتہا شوق کا پاؤں تو لکھوں اے قاصد — کہیو کچھ حال زبانی جو تجھے یاد رہے

ہم اُس جفا شعار کے آفت رسیدہ ہیں — پہنچے نہ آسماں کا ستم جس کی گرد کو

متاخّرین

(۲۷۷) نثار: محمّد پناہ خاں، نثار تخلّص۔ جوانے ست مؤدّب و متواضع۔ با فقیر بسیار دوستی دارد۔ بیشتر کہ بہ فیض آباد می ماند اکثر در فقیر خانہ بہ روزِ مشاعرہ می آمد۔ اگرچہ دراں ایام شعر نہ می گفت، لیکن گوشِ دل بر سخن ہائے رنگیں داشت۔ ہم راہِ نوّاب برم خاں الحال در شاہ جہان آباد مقیم ست۔ شنیدہ ام کہ مشقِ سخن از اصلاحِ حضرت خواجہ میر، درد دام افضالہٗ می نماید۔ اشعارش مشہور نہ شدہ است، سوائے دو سہ بیت ازو بہ گوش نہ رسیدہ۔ نو مشق ست۔ خوب خواہد گفت:

آنکھوں سے بختِ دل کو آنسو نکال دے ہی — مردے کو جس طرح سے پانی اچھال دے ہی

(۲۷۸) نعیم: نعیم اللہ، المتخلّص بہ نعیم۔ از شاگردانِ میاں محمّد حاتم۔ مردے ست متوطّنِ شاہ جہان آباد۔ می گویند کہ بسیار بہ خود غلط ست۔

بندہ او را نہ دیدہ است، واللہ اعلم۔ دیوانِ مختصر دارد۔ از کلامِ او چنیں معلوم می شود کہ فکرش سرسری ست، بہ عالمِ اعلیٰ نہ رسیدہ است مگر، بعضے جستہ جستہ خوب می گوید۔ ایں غزلش مشہورِ عالم ست:

کیا فائدہ جو غیر سے وہ ہم کنار ہے
ہم سے تو اب تلک وہی دار و مدار ہے

بن دیکھے اُس کے جان تو دوں گا میں ای اجل
مدت سے مجھ میں اور یہ اُس میں قرار ہے

یہ جور اگر اور یہ بیداد رہے گا
تو کاہے کو عالم میں کوئی شاد رہے گا

یہ گالیاں دے دے کے ترا آنکھیں دکھانا
مجھ کو تو لبِ گور تلک یاد رہے گا

جان بھی اودھر گئی جس طرف کو قاتل گیا
میں بھی جاتا ہوں اُدھر جس سمت میرا دل گیا

گر کہے گا کچھ ہمیں ہم بھی کہیں گے کچھ نہ کچھ
گالیاں دے دے کے غیروں کو بہت تو ہل گیا

آیا نہیں ہے اُس کا جو پیغام اب تلک
اِس واسطے نہیں مجھے آرام اب تلک

بلبل تجھے ہے صحبتِ گل اور سیرِ باغ
ہم کو وہی قفس ہے وہی دام اب تلک

اپنے ہی کچھ نصیب کا شاید قصور ہے
ورنہ وہی ہے صبح وہی شام اب تلک

کھپا ہے جب سے ترا یہ جمال آنکھوں میں
ترا ہی مجھ کو رہے ہے خیال آنکھوں میں

خیال کر کے ترے مو کمر کو روتا ہوں
وہ کیوں نہ روئے پڑے جس کے بال آنکھوں میں

کس سے لگائیں دل کوئی محبوب ہی نہیں
اور سچ کہو تو کام یہ کچھ خوب ہی نہیں

کبھو دل سے نعیم کو اپنے
یاد کرتے ہو یار سچ کہیو

گو فرض کیا ہم نے غمخوار بہت ہوں گے
ہم سا نہ کوئی ہوگا یوں یار بہت ہوں گے

دیکھ آئینہ خانے میں گر تجھ کو نہیں باور
تجھ سے تو جہاں میں بھی دلدار بہت ہوں گے

شاکی ہے ابھی سے دل تو وعدہ خلافی کا
ایسے تو کئی آگے اقرار بہت ہوں گے

ایک دن بھی نہ کیا تو نے گزر حیف اِدھر
ہم ترے واسطے یک عمر سرِ راہ رہے

اب تو کرتے ہو میاں ہم سے محبت لیکن
دیکھیے دل کے لیے پر بھی یہی چاہ رہے

حال سنتا ہی نہیں ہے کسی شیدائی کا | باوجود آپ ہی عاشق ہے دو زیبائی کا
مجھے جو گور میں بھی یاد وہ گل فام آئے گا | تو حیراں ہوں وہاں بھی کس طرح آرام آئے گا
جو ایسی بے قراری میں خبر اُس کی نہیں لاتا | تو پھر ای نامہ بر کس دن تو میرے کام آئے گا

(۲۷۹) نثار : میاں امان اللہ، معمار، المتخلص بہ نثار۔ مردے از مردم شاہ جہان آباد ست۔ تازہ گوست۔ اکثر الفاظ را بہ عمارتِ عبارت کرسی نشیں می کند و کارِ ریختہ و غزل را بہ خوبی در ہر بیت بہ سرانجام می رساند۔ تا حال در ہماں شہر ست۔ ہمیں یک شعرِ او بہ گوشش خوردہ :

غیر دروازے پہ بیٹھا راہ ہی تکتا رہا | شب کو وہ کوٹھوں ہی کوٹھوں گھر ہمارے آرہا

(۲۸۰) نالاں : از موزونانِ جہاں، محمد عسکری، المتخلص بہ نالاں متوطنِ شاہ جہان آباد ست۔ از تازہ گویانِ آں دیار۔ ہماں جا مسکن دارد۔ از شاگردانِ میاں حاتم :

تھا منتظر کہ یار کا پیغام آگیا
قاصد تو آج زور مرے کام آگیا

(۲۸۱) ندا : از مردم شرفا و نجبا میر مرتضی اسلم اللہ، المتخلص بہ ندا۔ متوطنِ دہلی۔ بسیار متواضع آشنائے درست۔ طبعِ موزونے دارد، و اکثر بہ وضعِ خود می گوید۔ سلامت باشد :

صنم کا طاقِ ابرو دل عبادت گاہ جانے ہے
بڑا کافر ہے بت خانے کو بیت اللہ جانے ہے

⁂

حرف (و)

متقدّمین

(۲۸۲) **ولی** : از سلک متقدّمیں غفراللہ لہم، درویشِ خفی وجلی، شاہ ولی اللہ، المتخلّص بہ ولی، مشہور و معروف مردے بود از خاکِ گجرات۔ بریک صنمے عاشق شدہ، در وقتِ محمّد عالم گیر بہ ہندوستانِ جنّت نشاں آمدہ، در خدمتِ شاہ گلشن قدّس اللہ سرّہٗ۔ استفادہ حاصل نمودہ، از توجّہِ آں بزرگوار مقبولِ اعلیٰ و ادنیٰ گردید۔ تعریفش از احاطۂ تحریر و تقریر بیرون ست۔ بنائے ریختہ را چنیں مستحکم نمود کہ الحال از بلندیِ طاقِ سپہر افزود۔ چوں دکنی ست اکثر بہ زبانِ خود حرف زدہ است۔ ابتدائے ریختہ از وست، اوّل استادیِ ایں فن بہ نامِ اوست۔ تیمّناً و تبرّکاً بہ قلم می آرد۔ رحمہ اللہ:

دل کو گر مرتبہ ہو درپن کا — دیکھنا مفت ہے سریجن کا م
یاد کرنا ہر گھڑی اُس یار کا — ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا
دیکھنا ہر صبح اُس رخسار کا — ہے مطالعہ مطلعِ الانوار کا
آرزوے چشمۂ کوثر نہیں — تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا

جب تجھ عرق کے وصف میں جاری قلم ہوا — عالم میں ناؤں اُس کا جوا ہر رقم ہوا
طاقت نہیں کہ حشر میں ہوئے وو داد خواہ — جس بے گنہ پہ تیری نگہ سوں ستم ہوا

اگرچہ حسبِ ظاہر میں ہے فرقت درمیاں لیکن — تصوّر دل میں میرے جلوہ گر ہے صبح و شام اُس کا
نم نہ پوچھو عشق میں جوش و خروشِ دل کی ماہیّت — بہ رنگِ ابر دریا بار ہے رومال عاشق کا

م پھر میری خبر لینے وو صیاد نہ آیا
شاید کہ اُسے حال مرا یاد نہ آیا

ہمیشہ ہے بہارِ سروِ آزاد
نہ جائے دولتِ حسنِ خداداد

جب آیا مستِ ساقی جام لے کر
گیا یک بارگی آرام لے کر

نہ جانوں خط ترا کس بے خطا پر
چلا ہے آج فوجِ شام لے کر

میں اُس کو جوں نگیں کرتا ہوں سجدہ
جو کوئی آتا ہے تیرا نام لے کر

م صنم کے لعل پر وقتِ تکلّم
رگِ یاقوت ہے موجِ تبسّم

نہ دو آزار میرے دل کو ای آرامِ جاں سمجھو
یہ خوبی کچھ نہیں رہتی سدا ای مہرباں سمجھو

م زندگی جامِ عیش ہے لیکن
فائدہ کیا اگر مدام نہیں

جوں گل شگفتہ رو ہیں سخن کے چمن میں ہم
جوں شمع سربلند ہیں ہر انجمن میں ہم

اک بار ہنس کے بول سجن ورنہ حشر تک
جوں برق بے قرار رہیں گے کفن میں ہم

م سن کے احوال مرا ناصحِ مشفق نے ولی
ہاتھ سے ہاتھ ملا درد سے سینہ کوٹا

تل ہیں دل کو ملائے لیتے ہیں
پھر گویا اِن تلوں میں تیل نہیں

جب تک نہ دیکھا تھا تجھے دل بند تھا اوراق میں
تیری بھواں کو دیکھ کر جزدان چھوڑا طاق میں

نم عجب کچھ حال رکھتا ہے شبِ خلوت میں مہ رو سے
سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

م اک بار مری بات اگر گوش کرے تو
ملنے کو رقیبوں کے فراموش کرے تو

ن ای جانِ ولی وعدۂ دیدار کو اپنے
ڈرتا ہوں مبادا کہ فراموش کرے تو

م دیکھوں ہوں جسے وو مبتلا ہے
خوباں کی نگاہ میں بلا ہے

نم دل چھوڑ کے یار کیوں کے جائے
زخمی ہے شکار کیوں کے جائے

ہے حسن ترا ہمیشہ یک ساں
جنّت سے بہار کیوں کے جائے

م غنیمت بوجھ ملنے کو ولی کے
نگاہِ پاک بازاں کیمیا ہے

نہ تنہا حسنِ خوباں دل ربا ہے
ادا فہمی سخن دانی بلا ہے

نہ وہ بالا وہ بالی بلا ہی / بلاے عاشقاں نازو ادا ہی
غرور حسن نے تجھ کو کیا ہی اِس قدر سرکش / کہ خاطر میں نہ لائے تو ترے ہاں گر ولی آئے ن
آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہی اُس کو / کرتی ہی نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی نم
عالم میں ترے ہوش کی تعریف میں کی ہی / ایسا تو نہ کر کام کہ مجھ پر سخن آئے نم
ولی اُس گوہرِ کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی / مرے گھر اِس طرح آتا ہی جوں سینے میں راز آئے م

سُن ولی رہنے کو دنیا میں مکانِ عاشق
کوچۂ زلف ہی یا گوشۂ تنہائی ہی نم

متوسّطین

(۲۸۳) **واحد**: محمّد واحد، متخلّص بہ واحد، اوائلِ سلطنتِ محمّد شاہ طفلے بود، شیریں می گفت۔ در صغرِ سن درگزشت۔ متوطّنِ شاہ جہان آباد، در محلّۂ بیجبل مسجد سکونت داشت۔ از متوسطاں بود۔ ازوست:

سورج کی بھانت آئینۂ دل صفا کرے / اک قرصِ نان پر جو کوئی اکتفا کرے

(۲۸۴) **وحشت**: غنچۂ گلستانِ سخن، میر ابوالحسن، صاحب ہمّت، المتخلّص بہ وحشت، مردے بود از سلکِ متوسطیں، نبیرۂ تیر انداز خاں مرحوم۔ سپاہی پیشہ، بہ علاقۂ نوکری بہ سر می برد۔ مشقِ شعر بہ مشورۂ میرزا رفیع، سودا، سلّمہ اللہ می کرد، در ایّامے کہ مشاعرہ در شاہ جہان آباد بہ خانۂ خانِ آرزو مقرّر بود۔ مدّتے شد کہ بہ قضاے الٰہی فوت شد۔ جوانِ اہل بود۔ رحمہ اللہ:

قاتل اگر کہے کہ سکتا ہی چھوڑیو / خنجر تو ایک دم کے لیے منہ نہ موڑیو نم
لگتا ہی مجھ کو آج یہ سارا جہاں خراب / شاید کہ مر گیا ہی کوئی خانماں خراب ن

کہیں یہ جھوٹ دیکھا ہی تجھے جب میں بلاتا ہوں
صریحاً تو چلا جاتا ہی اور کہتا ہی آتا ہوں
ایک جاگہ یہ نہیں ہی مجھے آرام کہیں
ہی عجب حال مرا صبح کہیں شام کہیں

(۲۸۵) ولایت : میر ولایت اللہ خاں، حقائق و معارف آگاہ، مقبولِ درگاہِ الٰہ، صاحبِ کمالاتِ وافیہ و حالاتِ شافیہ، مفتخر الاعیان، میر ولایت اللہ خاں۔ گوہرِ دریاے سیادت و جوہرِ تیغِ شرافت، چراغِ بزمِ ہدایت، المتخلّص بہ ولایت، ابنِ میر باقی۔ اصلش از خوست ست۔ از مریدانِ حضرت خواجہ جعفر قدّس سرّہٗ۔ بندہ در شاہ جہان آباد اکثر آں بزرگ را بہ مجالسِ فقرا دیدہ، در عالمِ پیری رخش مثلِ ماہ می درخشید، در لباسِ فقیری شاہانہ معاش می نمود۔ عالم عالم اکرام و احترامش می کردند۔ طبعِ شریفش مائلِ تصوّف بسیار بود، چہ از فارسی و چہ از ریختہ ہمہ بہ تصوّف و توحید بر طرزِ خود فرمودہ است۔ عارفے می باید کہ مغزِ کلامش را دریافت نماید۔ قریبِ دوازدہ سال شدہ باشد کہ بہ رحمتِ الٰہی پیوست۔ یک رباعی از و قلمی می نماید۔ مشتے نمونہ از خروارے۔ غفر اللہ لہٗ۔ ازوست :

در بحرِ محیط غیر پانی کیا ہی
ظاہر ہی جو کچھ ہی یاں نہانی کیا ہی
گر پیاسا ہی پی، پیرؔ، نہا، غوطے مار
باہر تو یہ جز خاک فشانی کیا ہی

متاخّرین

(۲۸۶) وفا : مقبولِ خاطرِ اربابِ صفا، لالا نول رائے، المتخلّص بہ وفا۔ از تذکرۂ محمّد قائم چناں ظاہر گشت کہ جوانے ست نوخاستہ، بہ زیورِ علم و عمل آراستہ۔ ہوش و گوش و فہم و ذکا، صاحبِ علم و حیا، لطافتِ مزاجش از گل زیادہ، مانندِ بلبل دل از دست دادہ۔ برادر خردش اجاگلاب رائے

دیوانِ مدار المہام امیر الدولہ، نوّاب نجیب خاں مرحوم بود، لیکن این عزیز مصروفِ اکتساب و غریقِ مطالعۂ کتاب۔ طلبِ ہر کمال دامن گیرِ حال۔ طبعِ دردمند داشت۔ عاشق مزاج بود۔ اکثر فکرِ فارسی و ریختہ می نماید۔ خدا بر عمرش بیفزاید۔ از وست:

کہے ہے کس سے دل احوال اپنا ۔۔۔ پڑا ہے یاں ہمیں جنجال اپنا
ہوئے گا دل سے محوِ غمِ یار کب تلک ۔۔۔ کیوں ہم نشیں یہ جائے گا آزار کب تلک
کہنے لگا وو سن کے مرا نالہ و فغاں ۔۔۔ یارب جیا کرے گا یہ بیمار کب تلک
کس گلِ تازہ نے اِس باغ میں کی جلوہ گری ۔۔۔ ہم زرِ داغ سے جس کے نہ خریدار ہوئے
پوچھو ہو کیا کہ حال ترا کس طرح سے ہے ۔۔۔ کیا جانتے نہیں ہو میاں جس طرح سے ہے
ہوتے تو دل سبھی میں گرفتار ہو گیا ۔۔۔ اب چھوٹنا پہ زلف سے دشوار ہو گیا
دینا تو دل نہ آپ کو منظور تھا ولے ۔۔۔ جب مل گئی یہ آنکھ میں ناچار ہو گیا
کچھ خیریت نظر نہیں آتی مجھے کہ آج ۔۔۔ لگتے ہیں اُس کے کان سے اغیار دم بہ دم
اپنی ہی چشم کے تئیں تابِ نظر نہیں ۔۔۔ ورنہ وہ آفتاب کہاں جلوہ گر نہیں
حسنِ عمل پہ اپنے نہ بھول اِس قدر کہ شیخ ۔۔۔ واں کے معاملے کی کسی کو خبر نہیں
کس تیغِ برق جلوہ کو دیکھا کہ اب تلک ۔۔۔ اُن بن ہے التیام سے زخمِ کہن کے تئیں
الفتِ دل کیا زیادہ ہم سے ہے اغیار کی ۔۔۔ ریجھ ہی لیکن نرالی ہے کچھ اپنے یار کی
آنے کا مرے وو سن کے چرچا ۔۔۔ نکلا نہ تمام روز گھر سے
دل کو کہیں ہے جی میں گرفتار کیجیے ۔۔۔ یعنی کسی صنم کے تئیں یار کیجیے
گر مانگتا ہے جی کے تئیں دیجیے دفا ۔۔۔ کیا چیز ہے کہ دوست سے انکار کیجیے
رفیقِ ہرزہ گو ہے دشمنِ جاں ۔۔۔ بلدرہ زن کو ہے نالہ جرس کا
دکھ نہ دے اس قدر وفا کے تئیں ۔۔۔ آخرش وہ بھی جان رکھتا ہے

اپنی غرض کو ہم تو سبھی دکھ سہیں گے لیک
ہوتی ہی گالیوں سے تمھاری زبان خراب م

بس کہ اپنے انقلابِ بخت سے ڈرتے ہیں ہم
بستر گل پر بھی لرزاں ہی قدم دھرتے ہیں ہم م

کل کا وعدہ کر لیا ہی اُس نے ای محرم تو کیا
یاں تو بے تابی سے دل کی آج ہی مرتے ہیں ہم م

حال دل کیوں کے کہوں اُس سے وفا غیروں میں
جی دھڑکتا ہی کہ کوئی پسِ دیوار نہ ہو م

راضی وہ ہو کے رات سہج میں مچل گیا
عنقا پھنسا تھا دام میں لیکن نکل گیا م

مے کشوں نے مے میں پایا بھنگیوں نے بھنگ میں
جل رہا ہی وہ طرح پانی کی ہر اک رنگ میں م

شعلہ زن ہی ہمیشہ داغ اپنا
بجھ نہیں جانتا چراغ اپنا م

یاں تلک از خویش رفتہ ہوں کہ مدام
آپ کرتا ہوں میں سراغ اپنا م

نہ کشتی پار ہی بہ کر گئی اپنی نہ وار آئی
ہوئے ہیں غرقِ دریا اُس گھڑی جب عین دھار آئی م

ساتھ تجھ سے کے اگر مہر و وفا کی ہم نے
عفو کر عفو کہ ای شوخ خطا کی ہم نے م

(۲۸۷) میر مبارک علی: میر مبارک علی، ولدِ شاہ قدرت اللہ، قدرت۔

پیشِ پدرِ خود در مرشد آباد سکونت دارد:

ہوئی ہی مشتعل میرے دلِ بے تاب میں آتش
نہ دیکھی تھی کسی نے اب تلک سیماب میں آتش

(۲۸۸) وحشت: میر بہادر علی، از یارانِ میاں حسرت، المتخلّص بہ وحشت۔

سیّد زادۂ خوش اوقات و نیک صفات۔ جوانِ وضع دار، در پیشۂ سپہ گری استوار۔ اکثر در تعیناتی بہ طرفِ گورکھپور بہ جہتِ روزگار بہ سر می برد۔ طبعِ موزونے دارد۔ با فقیر بسیار آشناست۔ بہ فرمایشِ یارانِ آں دیار بارہ ماسۂ دیگر مانند بکٹ کہانی گفتہ است۔ حق تعالیٰ سلامت دارد۔ از وست:

شب و روز وصل کو رو دیئے کہ عجب وہ لیل و نہار تھا
کبھی ہم سے یار کو لطف تھا کبھی ناز تھا کبھی پیار تھا

مرا دل ہوا اشک ٹپک گیا جگر آہ و نالہ سے پک گیا
تو نظر سے جو ہیں سرک گیا میں اجل سے وو ہیں دوچار تھا

جب تک کہ کہیں نہ تھا ٹھکانا دل کو مرا — دشوار تھا اک قدم بھی جانا دل کو
کوچہ ترا دیکھا ہی سو جانے کے لیے — اب لحظہ بہ لحظہ ہی بہانا دل کو

(۲۸۹) واقف : شاہ واقف، المتخلص بہ واقف۔ عارفِ اسرارِ طریقت، و واقفِ رموزِ حقیقت، کاشفِ مکاشفاتِ وجدانی، سالکِ مراتباتِ وحدانی۔ اصلِ وے از شاہ جہان آباد ست۔ در اوائل کہ مشقِ سخن در عالمِ مستی و بے باکی داشت بسیار بہ صفا حرف می زد، الحال بہ سببِ فضیلت عقابِ فکرش چناں بر سپہرِ معانی بلند پرواز شدہ کہ بہ نظرِ ہم چو ما پست نظراں نہ می آید۔ ازاں جملہ انچہ بہ فہم می رسد قلمی می نماید۔ حق تعالیٰ طائرِ بیانش را چوں ہلال از تیز بالی روز بہ روز بلند تر گرداند۔ در وقتے کہ بہ سرکارِ نوّاب شجاع الدولہ بہ تہمتِ نقش نویسی ناحق گرفتار شدہ بود، دراں مقدّمہ حسبِ حالِ خود ایں غزل گفتہ :

دَوْر آیا ہی کہ ہوں شاہ و گدا پھرے ہیں — بے خطا پھرے ہیں اور اہلِ خطا پھرے ہیں

تمام غزل ہمیں طور ادا کردہ است۔ طرزِ کلامش مانا بہ طرزِ ناصر علی و جلال اسیر ست۔ الحال ازیں فنِ شعر گزشتہ، مصروف بہ خواندنِ منطق و معانی و رمل و نجوم ست۔ خدا بہ انصرام رساند۔ با فقیر بسیار دوستی دارد سلّمہ اللہ تعالیٰ:

خیالِ وعدہ ترا بس کہ شب نظر میں رہا — تمام رات مرا جی صدائے در میں رہا
جلایا مجھ کو مرے ضبطِ آہ نے جوں شمع — اُٹھا جو شعلہ جگر سے تو پھر جگر میں رہا
چمن سے کون باتیں اپنے جانے کی سناتا ہی — کہ گل کا ایک رنگ آتا ہی اور اک رنگ جاتا ہی
اشک سے آتشِ دل ہم تو بجھاتے ہی رہے — آہ پر نالے تو اور آگ لگاتے ہی رہے

نقشِ قالی کی طرح سو کے نہ چونکے ہم آہ
ٹھوکروں سے تو بہت یار جگاتے ہی رہے

کہیو اے بادِ صبا واہ میاں واہ میاں
جی سے جاتے رہے ہم اور تم آتے ہی رہے

مانع ہوئے آنے سے جو مجھ کو ترے در کے
رویا سرِ بازار میں سر سر زانو پہ دھر کے

جب دیکھیے اُس کو یہی حسرت رہے دل میں
جوں نورِ نظر ٹک مری آنکھوں سے نہ سرکے

کوئی علم پہ نازاں ہے کرامات پہ کوئی
اک رو یہ ہم ہیں کہ ادھر کے نہ اُدھر کے

دیتے ہی نہیں چین مجھے چشم و دل اُس بن
بہکانے کا کیا دوس جو دشمن ہوئے گھر کے

صبا کہیو چمن کی عندلیبانِ غزل خواں کو
کرو تم چہچہے ہم دام میں ہو جائیں زنداں کو

ڈھلا دن آج کا بھی اور نہ آیا تو تو پھر ہم نے
چراغِ آہ سے روشن کیا شامِ غریباں کو

جنت و سایۂ طوبیٰ نہیں درکار مجھے
بس ہے اے یار ترا سایۂ دیوار مجھے

ہوسِ سیرِ چمن لے تو چلی ہے یاں سے
پر کسی دام میں مت کیجو گرفتار مجھے

کبھی ایسا بھی اے خدا ہوگا
وہ صنم ہم سے آشنا ہوگا

روز و شب مجھ کو ہے یہی دھڑکا
نہ ملوگے ملوگے کیا ہوگا

خوب رو ہو کے باوفا ہوئے
میں نہ مانوں اگر خدا ہوئے

جب کہ یاد آتا ہے گلشن میں مرا گل رو مجھے
خنجرِ راہِ بےخودی ہوتی ہے گل کی بو مجھے

یہ دل پھر آہ مژگانِ بتاں سے بے طرح اٹکا
مجھے جس خار کا ڈر تھا سو پہلو میں مرے کھٹکا

وداعِ یار سے دل پر ملال ہے سو ہے
زباں سے گو نہ کہا جی کا حال ہے سو ہے

نہ پوچھ حسنِ سلوک آہ مجھ سے اُس بت کا
وہی ستم وہی ایذا کی چال ہے سو ہے

تم تو شب وعدے پر اپنے گھر سے چل کر رہ گئے
صبح ہوتے ہوتے ہم جوں شمع جل کر رہ گئے

اَن منے ملنے کا اُس کے یاد آتا ہے سماں
اک قدم رکھا تو دس جاگہ مچل کر رہ گئے

جب تک وہ مقابل بتِ مغرور نہ ہوئے
بےتابیِ دل کوئی طرح دور نہ ہوئے

سرگوشی سے جو سامنے کرتا ہے مرے بات
ڈرتا ہوں اسی کا کہیں مذکور نہ ہوئے

درد جو بے اختیار ہم سے ہم آغوش ہی
یاد سے واقف تو آج کس کی فراموش ہی

غیر کی جا تو اگر ہم سے بھی ای یار ملے
عکس سے اپنے بھی پھر آنکھ زنہار ملے

سب سے ملتے تو ہو ظاہر ہیں یہ دھڑکا ہی مجھے
کہیں مجھ سا نہ کوئی اور گرفتار ملے

واقف سے ملتے جو کوئی ٹوکے تجھے تو کہہ
بھولا ہوں راہ پوچھوں ہوں آیا تھا کام کو

کروں میں شکوہ اگر تیری بے وفائی کا
جہاں میں نام نہ لے کوئی آشنائی کا

ابھی حواس بھی ثابت مجھے نہیں آئے
خدا کے واسطے مت نام لے جدائی کا

صد نالۂ جاں کاہ گرہ در تہِ لب ہی
کیا جانیے کیا آج مرے دل پہ تعب ہی

غرّہ نہ ہو قربِ کرمِ یار پہ واقف
اِس ابر کے دامن میں نہاں برقِ غضب ہی

نہ قاصد ہی پہنچ سکتا ہی اب وہ ان تک نہ گام اپنا
الٰہی مضطرب ہوں کس طرح بھیجوں پیام اپنا

بہت موقوف شکوے وصل پر تھے اُس جفا جو کے
کیا سو یک نگہ نے اُس کی قصہ ہی تمام اپنا

دام سے زلف کے پھر دل کو چھڑایا نہ گیا
سر سے اِس بختِ سیہ کا مرے سایہ نہ گیا

اچپلاہٹ اِسے کہتے ہیں کہ شوخی سے وہ شوخ
میری آنکھوں کے تصور میں سمایا نہ گیا

ہجرِ جاں کاہ کس طرح گزرے
یا رب آہ کس طرح گزرے

تو کہیں میں کہیں بھلا اوقات
اپنی دل خواہ کس طرح گزرے

صبح پر وصلِ یار کی ٹھہری
آہ پھر انتظار کی ٹھہری

کیا طرح اُس گلی میں کہہ تو صبا
میرے مشتِ غبار کی ٹھہری

مت بگڑ اُس سے بس کر ای واقف
اب تو دارو مدار کی ٹھہری

روزِ خزاں چمن میں جو دیکھا ہزار نے
اک مشتِ پر پڑے تھے تلے شاخسار کے

آوارہ ہو گئے دل سے شکیب و قرار و صبر
یا رب کہاں بسیں گے یہ اُجڑے دیار کے

یارانِ ہم نشین و رفیقانِ دوست دار
ق سب آشنا ہیں زندگیِ مستعار کے

جب مند گئی یہ آنکھ تو ای دوست بعدِ مرگ
پھٹکے ہی یاں کون کسی کے مزار کے

صبا گلشن میں جائےگی تو یہ کہہ دیجیو گل سے
تجھے ای بے وفا کیا فائدہ ہی خونِ بلبل سے

شکیب و طاقت و صبر و توان و دین و دل اپنے
سبھی آوارہ ہوکر اُٹھ گئے تیرے تغافل سے

خون آنکھوں سے ہم جو رو دیے ہیں
تیری مژگاں کے کانٹے بوئے ہیں

جو صنم تجھ سے دل لگاتے ہیں
سو وہ ہم سے خدا کے کھوئے ہیں

کبھی کبھی جو کرم کی نگاہ کرتے ہو
غرض کہ جان مرے دل میں راہ کرتے ہو

ہمارا تھوڑے دنوں میں یہ حال پہنچایا
بھلا رقیب سے کیوں کر نباہ کرتے ہو

یہ کون ڈھب ہی کہ واقف سے ہیں نہیں واقف
وہی نہ جس پہ کرم کی نگاہ کرتے ہو

میں تو کیا تھا سونپ کے دل کو وفا کے ہاتھ
ای آہ چڑھ گیا یہ کہاں سے جفا کے ہاتھ

جب ہم سے قولِ وعدۂ دیدار کا ہو ذکر
مارے ہی میرے ہاتھ پہ تب منہ چھپا کے ہاتھ

کہوں کیا اُس کے وعدے کی حقیقت پوچھتے کیا ہو
وہی شام و سحر ہی اور وہی امروز و فردا ہی

توقع زندگی کی دوستاں رکھیے گا کم ہم سے
کہ جوں نقشِ قدم چھٹتا نہیں کوچے صنم ہم سے

ہی جس کی خرمی سے زندگانی اپنی وابستہ
خفا رہتا ہی سو ساعت بساعت دم بہ دم ہم سے

پیار کی باتوں سوا ہم بھی تو رہ سکتے نہیں
دل میں آتا ہی کہ کچھ کہیے پہ کہہ سکتے نہیں

ہر آن ہم سے کیوں ہی عبث بدگمان تو
اپنا سا اور کو نہ سمجھ میری جان تو

اک روز کی جدائی میں مرتے ہیں یا نہیں
یک بار یہ بھی کر لے مرا امتحان تو

کیا کیا کہا تھا کیوں کے لیا تھا ہمارا نام
قاصد خدا کے واسطے پھر کر بیان تو

نہ پوچھو فتنہ برپائی کو میرے سرو قامت کی
اُٹھا مجلس سے وہ اور اہلِ مجلس پر قیامت کی

یہ دل پھر آہ مژگانِ بتاں سے بے طرح اٹکا
مجھے جس خار کا ڈر تھا سو پہلو میں مرے کھٹکا

نہ آیا پھر نظر جب سے گیا جوں عمرِ رفتہ تو
بنارس کی ہیں گلیوں میں بہت بھولا بہت بھٹکا

جگر میں آہ ہی آنکھوں میں نم ہی
خدا جانے یہ کس کا تازہ غم ہی

اِن رقیبوں سے گئے گزرے ہیں کیا ای یار ہم
وہ شریکِ بزم ہوئیں اور نہ پائیں بار ہم

جو صنم خاطر نہ رکھے عاشقِ رنجور کی
ایسے ملنے سے بھلی صاحب سلامت دور کی

مژگاں تری اِدھر سے کدھر پھر کے رو کریں
اب کس کے دل میں دیکھیے ناخن فرو کریں

ہر چند وہ جمال ہے آنکھوں کے سامنے
لیکن کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں

تیری نگہِ لطف سے وابستہ ہیں یاں ہم
جوں عکس ذرا پھیرنے میں رو کے کہاں ہم

گہ اُٹھتے گہے بیٹھتے ناطاقتیوں سے
جوں سایہ جہاں تو گیا ای دوست وہاں ہم

دیارِ عشق میں ٹک دیکھ تو کیا ہے ستم واقف
کریں ہیں متہم اُس سے نہیں ہیں جس سے ہم واقف

(۲۹۰) وارث: محمد وارث الٰہ ابادی، المتخلّص بہ وارث۔ فقیر او را نہ دیدہ، بعضے از یارانِ آں دیار شنیدہ کہ مردے ست طالبِ علم، ریختہ و فارسی می گوید۔ طبعِ موزونے دارد، بہ جاے تخلّص کہ وارث ست اکثر بہ الفِ ندا خود را یاد می کند، یعنی وارثا در ہر مقطع می آرد۔ از سببِ بُعد و کم شہرتی اشعارش بہ گوش نہ خوردہ، انچہ میسر آمد نوشتہ شد۔ حالا در شہرِ خود یعنی بہ الٰہ اباد مقیم ست۔ سلامت باشد۔ از وست:

بتا تو ہاں مرے ظالم مثالِ نقشِ قدم
تری گلی میں کوئی گر کے پھر اُٹھا بھی ہے

الٰہی خیر ہو قاصد تو جلد آتا ہے
ہمارے خط کا جواب اُس نے کچھ لکھا بھی ہے

ہم کو تو رند کہتے ہو پر آپ شیخ جی
کیا کچھ شکار کرتے ہو ڈاڑھی کی آڑ میں

وارث چھٹے ہے کب تپشِ عشق مجھ سیتی
پیوست ہو گئی ہے مرے ہاڑ ہاڑ میں

خوبیِ کلام از کلام ظاہر ست، احتیاجِ شرح و بیاں نیست:

اک عمر تجھے چاہیے اُس سیر کو وارث
عالم کا تماشا جو میں اک آن میں دیکھا

(۲۹۱) وہم: غنچۂ گلشنِ کیاست و فہم، میر محمد علی، المتخلّص بہ وہم جوانے ست بسیار اہلِ دل، واہلِ دل، خوش وضع، نیک خصال۔ فرزندِ ارجمندِ میر تقی،

المتخلّص بہ خیال کہ بہ فرمائشِ فردوس آرام گاہ قصّۂ بوستانِ خیال گفتہ است۔ بست و سہ جلد دارد۔ القصّہ تمام عمر دراں قصّہ صرف نمود۔ کارے کردہ است کہ مقدورِ بشر نیست۔ چوں تخلّص پدرش خیال بود، بنابریں تخلّصِ خود وہم کردہ است۔ از سببِ فکرِ روزگار کم بہ ایں طرف راغب می شود۔ در انتخاب نمودنِ اشعار ذہنے و شعورے خوب دارد۔ چوں از یارانِ بندہ است تعریفِ او بہ زبانِ خود گفتن خوش نما نیست، بر ہمہ ظاہر ست۔ خدا سلامتش دارد۔ از وست:

خدا ہی دوستو حافظ ہے اب مرے دل کا
ہوا ہے دشمنِ جاں یار بے سبب دل کا

کچھ اس سے تو متعرّض نہ ہو کہ آنے کا
تری گلی میں یوہیں پڑ گیا ہے ڈھب دل کا

جا کہے اُس سے اتنا اب کوئی
ہے ترے غم سے جاں بلب کوئی

صبر و ہوش و قرار و تاب و تواں
چل بسے رفتہ رفتہ سب کوئی

مرتے ہیں تب تو پاتے ہیں آرام
نہیں مرتا ہے بے سبب کوئی

حرف (ہ)

متقدّمین

(۲۹۲) ہاشم: ہاشم تخلّص در دکن شاعرے گزشتہ۔ از وست:

دکھن اور ہند کے دل برہمن سوں بے حجاب اچھے
کہ مکھڑے چاند سے پرجن کے خط کے پیچ و تاب اچھے صنم

(۲۹۳) ہاتف: ہاتف تخلّص نیز از دکن ست۔ از وست:

تمری انکھیاں اور زلف سی کافر ہوا سارا جہاں
اسلام اور تقویٰ کہاں زہد اور مسلمانی کہاں صنم

متوسّطین

(۲۹۴) **ہدایت** : سیّد ہدایت علی خاں، صوبۂ عظیم آباد - ابتدائے سلطنتِ محمّد شاہ، غفر اللہ - ہدایت تخلّص می نمود - یک شعر ازو بہ گوش خوردہ - رحمہ اللہ :

کرتا نہ اگر آ کے مرا پردہ دری رنگ
ہرگز یہ مرے عشق کا سر فاش نہ ہوتا

(۲۹۵) **میر منگیا** : میر منگیا شخصے از نجبائے دہلی بود، بر شخصے تعشّق داشت - پا لیشں ہا در زا دلنگ می کرد - طبعِ موزونے داشت، گاہ گاہے دو سہ بیت می گفت - از مشاہیر نہ بود - حاسدان و رقیباں بہ جرمِ عشق وے را کشتند - یک رباعی ازو بہ گوش خوردہ - خدایش مغفرت کناد - از وست :

شیشہ مری زندگی کا توڑا دل نے
میری ایذا سے منہ نہ موڑا دل نے
مارا آخر مجھے نہ چھوڑا دل نے
کام اُس بتِ سنگ دل سے ڈالا مجھ کو

متأخّرین

(۲۹۶) **ہدایت** : میاں ہدایت اللہ، شمعِ انجمنِ فصاحت و بلاغت، المتخلّص بہ ہدایت - مردے ست متواضع و مؤدّب، مثل و محاورہ بند، عالی طبع و درد مند، شاعرِ دل پزیر، سخن سنج بے نظیر - اصلِ وے از شاہ جہان آباد ست - در زمرۂ حضرت خواجہ میر، درد - چندے ہم راہ سبدھ رائے، یک دل تخلّص کہ شاعرِ فارسی گو بود در بنارس اُفتادہ بہ سر بردہ - در تعریفِ بنارس مثنویِ خوبے گفتہ - حالا در خدمتِ خواجہ میر، درد گوشہ نشینی اختیار کردہ - خدایش سلامت دارد - از وست :

شہیدِ تیغِ ابرو ہی اسیرِ دامِ گیسو ہی   ہدایت بھی تو کوئی زور ہی شہد اشکستہ ہی   ن
یاد کرتے ہی زلف کی ہی قہر   پھر گئی دل پہ سانپ کی سی لہر   نم
تیری زلفوں کی کچھ چلی تھی بات   روتے ہی روتے گزری ساری رات   نم
حیرت میں ہوں کہ تیرے تئیں اے شبِ وصال   ظاہر میں دیکھتا ہوں کہ عالم ہی خواب کا   ن
بھلا بتا تو مری جان کچھ ہدایت نے   ق   تمھارے جور سے شکوہ کبھی کیا ہوگا   نم
مگر یہی نہ کہ بے اختیار ہو کے کبھی   کچھ اور بس نہ چلا ہوگا رو دیا ہوگا   نم
تم تو فریاد کسی کی نہ فغاں سنتے ہو   اپنے مطلب ہی کی سنتے ہو جہاں سنتے ہو
آئینہ سا ہی مکھ ترا روشن   چشمِ بد دور چشمِ ما روشن
اے ہدایت شبِ جوانی کا   ق   کچھ ہوا تجھ پہ ماجرا روشن
صبحِ پیری نمود ہوئی تیری   چل مسافر کہ دن ہوا روشن
موجبِ صد عیش و عشرت ہم کو تیری دید ہی   مل گئے جس دن گلے تیرے اسی دن عید ہی
خدا جانے صنم آئے نہ آئے   بھروسا کیا ہی دم آئے نہ آئے
غنیمت ہی کوئی دم سیرِ گلشن   پھر اپنا یاں قدم آئے نہ آئے
باتیں اشارتوں ہی سے کرتی ہیں انکھڑیاں   بیمار ہیں نہیں انھیں طاقت جواب کی
گویا کہ تیرے ہجر میں مر گیا ہوں رات   تعبیر جز وصال نہیں میرے خواب کی
کوچے میں ترے جو آن کر بیٹھ گئے   ر   یاں تک روئے کہ چشمِ تر بیٹھ گئے
جس طرف کو تو نے آنکھ اٹھا کر دیکھا   مانندِ حباب گھر کے گھر بیٹھ گئے
جی تو کرتا نہیں کوچے سے ترے جانے کو   گر تری اس میں خوشی ہی تو بھلا جاتا ہوں

(۲۹۷) ہاتف : مرزا احمد، المتخلص بہ ہاتف شخصے ست۔ در شاہ جہان آباد۔ در عالمِ درویشی بہ شغلِ شعر و رباعی بسر می برد۔ اکثر مخمس تضمین می کند۔ ہمیں یک شعر ازو بگوش خوردہ

مت پوچھ ہم نشیں کہ جہاں میں کہاں رہے   دل جس جگہ کہ لگ گیا اپنا وہاں رہے

حرف (ی)

متقدّمین

(۲۹۸) **حکیم یونس** : حکیم یونس از قدیم ست۔ احوالش معلوم نیست :

ہر معطّر اب تلک صحرا تمام ۔۔۔ اِس زمیں اوپر کوئی گل ہو گیا (ن)

سو گیا جب سے جگایا تھا مجھے ۔۔۔ بخت میرا جاگ اُٹھا تھا سو گیا (ن)

متوسّطین

از ایہام بندانِ آں دیار مسموع شدہ، معلوم نیست کہ از کیست۔ معانیِ پُر پیچ دارد :

توحید عشق کی ہوں اثبات کو نہ پوچھ ۔۔۔ باقی رہا فنا سے جس نے جپی ہے مالا

یعنی لفظِ ما و لا ہر دو نفی ست و نفیِ نفی اثبات می شود۔

(۲۹۹) **یک رنگ** : مصطفیٰ قلی خاں، یک رنگ، در گلشنِ بہارِ سخن آب و رنگ، و در چمنِ گلزارِ معانی بلبلِ خوش آہنگ۔ مصطفیٰ قلی خاں، المتخلص بہ یک رنگ، مردِ عمدہ بود در عہدِ فردوس آرام گاہ، نبیرۂ خانِ جہاں لودھی، در سلک ملازمانِ بادشاہی منسلک بود۔ معاصرِ میاں آبرو۔ خدا لیش بیامرزد۔ از دست :

ہاتھ اُٹھا جور اور جفا سے تو ۔۔۔ یہی گویا سلام ہے تیرا (ن)

اس قدر کیا ہے حمایت غیر کی ۔۔۔ ہم بھی تو تم سے کبھی تھے آشنا (ن)

خلق یک رنگ کی ہوئی دشمن
جب سے تیرا وہ دوست دار ہوا

مجھے مت بوجھ پیارے اپنا دشمن
کوئی دشمن بھی ہوئے اپنی جاں کا

اگر آئے مرے گھر وہ پیارا
کروں اُس ماہ کو پتلی کا تارا

بڑا دشمن ہوا وہ شوخ یک رنگ
کیا کیوں عشق میں نے آشکارا

حق کہے جو کوئی سو مارا جائے
راستی ہے گی دار کی صورت

وصل اور ہجر اُس صنم کا مجھ پہ یک ساں ہو گیا
درد میرا ہی مجھے آخر کو درماں ہو گیا

مجھ کو اِس دل سے توقّع تھی مدد کی وقت پر
تیرِ خوباں کا تو وہ یک رنگ پیکاں ہو گیا

بنا بر مصلحت ہی یہ جو تم سے
رہا ہوں روٹھ دن دو چار یک رنگ

کیوں تیغ کھینچتے ہو میاں ہم میں دم نہیں
پنہاں نگہ تمھاری یہ گیتی سے کم نہیں

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے
میرا صبر و قرار جاتا ہے

گر خبر لینی ہے تو لے صیاد
ہاتھ سے یہ شکار جاتا ہے

چاہتا تھا کہ کہے عشق کی باتیں یک رنگ
کیا کرے ہائے اُسے طاقتِ گفتار نہیں

برگِ حنا اوپر لکھو احوالِ دل مرا
شاید کبھو تو جا لگے اُس دل ربا کے ہاتھ

کیا جانیے وصال ترا ہووے کسے نصیب
ہم تو ترے فراق میں اے یار مر گئے

نہ تو ملنے کے اب قابل رہا ہے
نہ اپنا وہ دماغ و دل رہا ہے

مت تلوّن اُس میں سمجھو آپ سا
مصطفیٰ خاں عاشقِ یک رنگ ہے

سنتا نہیں تو بات کسی ہی کی اے سجن
تیرا غرور تجھ کو نہ جانوں کرے گا کیا

زبانِ شکر ہے مہندی کا ہر پات
رکھے ہے خوب رو ظاہر کرامات

خیالِ چشم و ابرو کر کے تیرا
کوئی مسجد گیا کوئی خرابات

عبث تو بے کسی پر اپنی کیوں ہر وقت روتا ہے
نہ کر غم اے دوانے عشق میں ایسا بھی ہوتا ہے

چند بیت در مرثیۂ امام علیہ السّلام خوب گفتہ است، و آں این ست:

زخمی بہ رنگِ گل ہیں شہیدانِ کربلا — گلزار کی نمط ہے بیابانِ کربلا (ن)

کھانے چلا ہے زخمِ ستم شامیوں کے ہاتھ — دھو ہاتھ زندگی سیتی مہمانِ کربلا (ن)

اندھیری ہے جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ — ہے سر بریدہ شمعِ شبستانِ کربلا (ن)

(۳۰۰) **یک رو**: یک رو تخلّص مردے بود از شاگردانِ میاں آبرو، لیکن، فکرش عالی معلوم می شود۔ ہمیں یک شعر از و شنیدہ ام:

ہیں دل پہ میرے داغ ترے ہجر کے کئی — گننے میں جن کے عمر مری سب گزر گئی (ن)

(۳۰۱) **یک دل**: میر عزت اللہ، یک دل تخلّص، سیّدِ عالی نسب بود۔ عاشقِ سخن، اکثر با شعرا دوستی داشت۔ شعر کم می گفت، بیشتر فکرِ مدح و منقبتِ ائمۂ اطہار، صلوات اللہ الملک الغفّار، بہ شوق و ذوقِ تمام نظم می نمود، چناں چہ ایں منقبت مشہور از دست۔ خدایش بیامرزد:

نو گلِ باغِ اِنّما کی قسم — سروِ گلزارِ ھل اتیٰ کی قسم (ن)

میرِ میدانِ لا فتیٰ کی قسم — میں تو عاشق ہوں مرتضیٰ کی قسم (ن)

دل فدا ہوں مجھے خدا کی قسم (ن)

(۳۰۲) **یار**: میر احمد، محبوبِ روزگار و یارِ طرح دار، میر احمد المتخلّص بہ یار، ولد میر شاہ اللہ یار، متوطنِ شاہ جہان آباد۔ جوانے بود بہ کمالِ وجاہت و ملاحت کہ یوسفِ ثانی تواں گفت۔ دراں زماں عالم عالم فریفتۂ رخِ نیکو و آشفتۂ زلف او بود۔ در وقتِ احمد شاہ ہنگامۂ حسنِ او گرم بود۔ ایں ہمہ شعرائے متوسطیں مانندِ پروانہ دلِ خود را بر شعلۂ حسنش می سوختند، و او نیز بہ ایں ہا صحبت می داشت۔ اکثر اصلاحِ سخن از میر محمد تقی، سلّمہ اللہ می گرفت۔ طبعِ موزونے داشت، گاہ گاہے دو سہ بیت می گفت۔ از

کتبِ عربی تا شرحِ ملّا خوانده بود۔ میر ضیا سلّمہ اللہ بہ او نظرِ الفت داشتند، چناں چہ تا حال ہر وقت کہ یادِ او می کنند می گریند۔ غرض کہ در عینِ نوجوانی از جہانِ فانی در گزشت۔ رحمہ اللہ:

اِس چمن میں ناتواں میں سب کے اوپر بار تھا
خوش رہو اے بلبل و گل ہم کہیں ہی خار تھا

جائے سنگِ لوحِ تربت نصب کیجو آئنہ
تا کوئی جانے کہ یہ حسرت کشِ دیدار تھا

آفریں اے دستِ گستاخِ محبّت آفریں
یہ گریباں ایک مدّت سے گلے کا ہار تھا

(۳۰۳) یقیں: شاعرِ دردمند و حزیں، انعام اللہ خاں، متخلّص بہ یقیںؔ، ولدِ اظہر الدّین خاں۔ جوانے بود در عہدِ محمّد شاہ، غفر اللہ لہٗ۔ از تلامذۂ میرزا مظہر، جانِ جاناں۔ اصلش از شاہ جہان آباد ست۔ بسیار نازک مزاج و میرزا منش بود، صاحبِ دیوان ست، از بس کہ اشتہار دارد محتاجِ تعریف نیست۔ میر تقی در تذکرۂ خود نوشتہ کہ مشہور چنیں ست کہ میرزا مظہر تمام دیوان گفتہ دادہ است، خود موزوں نیست۔ مرا یقیں نہ بود، لیکن میرزا رفیع، سودا و میر سوز، سلّمہما اللہ گواہی دادند کہ روزے ما یاں در خانۂ انعام اللہ رفتہ، برائے امتحاں غزلے طرح نمودیم، ہر چند مبالغہ کردیم، یک مصرع موزوں نہ کرد، ذائقۂ سخن فہمی ہم نہ داشت۔ واللہ اعلم۔ باشد، ما را ازیں چہ کار۔ متاعِ نیک ہر دکاں کہ باشد، اشعارش بسیار نمکیں و مؤثر اند۔ سخنِ او خالی از دردمندی نیست۔ می گویند کہ پدرش بے گناہ او را کشت، و پارچہ پارچہ کردہ، در دریا انداخت۔ سببش چنیں معلوم شد کہ پدرش تعلّقِ خاطر با دخترِ خود داشت، نعوذ باللہ، و او ازیں چیزہا ممانعت می کرد۔ برائے اخفائے ایں حرکت او را شہید کرد۔ اکثر چنیں شہادت می دہند۔ خدا بہتر می داند۔ ایں چند اشعار انتخاب نمودہ، قلمی می نماید۔ از وست:

م ہی ترے داغ سے پُر سینۂ سوزاں میرا
آبِ رنگ سے آگ رکھتا ہی گلستاں میرا

نم روا اگر دیجیے اس کو بھی تو کچھ عیب نہیں
آئینے سے بھی گیا کیا دلِ حیراں میرا

کبھو یہ تھا کہ ہم پر وہ بتِ مغرور رو دیتا
برا جب دیکھتا حالِ دلِ رنجور رو دیتا

نم اگر مر کر نہ میں اُس شوخ کی خاطر نشاں کرتا
خدا جانے وفا میری کے حق میں کیا گماں کرتا

م رہا میں بے خبر افسوس لذّت سے اسیری کی
جو میں یہ جانتا کُنجِ قفس میں آشیاں کرتا

اُس کو اب خشم و رضا میرا برابر ہو گیا
حیف مضموں روٹھنے کا بھی مکرّر ہو گیا

سم کیا بدن ہو گا کہ جس کے کھولتے جامے کا بند
برگِ گل کی طرح ہر ناخن معطّر ہو گیا

عجب اتّفاق ست کہ ایں شعر توارد شد با شعر انند رام، مخلص کہ ہم عصر او بود۔
معلوم نیست کہ ایں معنیٰ در اصل از کیست:

'ناخن تمام گشت معطّر چو برگِ گل
بندِ قبائے کیست کہ وا می کنیم ما'

اِس قدر غرق لہو میں یہ دلِ زار نہ تھا
جب حنا سے ترے پاؤں کو سروکار نہ تھا

ن دل میں زاہد کے جو جنّت کی ہوا کی ہی ہوس
کوچۂ یار میں کیا سایۂ دیوار نہ تھا

اُس گل سے کچھ حجاب ہمیں درمیاں نہ تھا
جس دن کہ یہ بہار نہ تھی گلستاں نہ تھا

دام و قفس سے چھوٹ کے پہنچے جو باغ تک
دیکھا تو اُس زمیں میں چمن کا نشاں نہ تھا

اتنا جہاں میں کوئی کبھی بے وفا نہ تھا
ملتے ہی تیرے مجھ سے یہ دل آشنا نہ تھا

جو کچھ کہیں ہیں تجھ کو یقیں ہی سزا تری
بندہ جو تو بتاں کا ہوا کیا خدا نہ تھا

ہمارا شور سن مجنوں کو بھولی طرح نالے کی
کوئی شیریں کے منہ پر نے بجا سکتا ہی کیا قدرت

بتاں کی مجھ سے خاطر جمع ہی یاں تک کہ کہتے ہیں
کہاں اس دام سے یہ صید جا سکتا ہی کیا قدرت

ن عاشق اور معشوق عالم کے سند کرتے ہیں سب
تجھ سے خوں خواری کی طرز اور مجھ سے غم کھانے کی طرح

نم کیا مری مژگانِ تر کے ابر نے ڈالا ہی شور
آج بادل بے طرح اُمڈے ہیں یہ برسیں گے زور

نم خال گورے منہ کا لیتا ہی مرے دل کو چرا
اِس نگر میں چاندنی راتوں کو بھی پڑتے ہیں چور

ن اب جو اُڑ بیٹھیں قفس کے بام پر مقدور نہیں
حیف آگے ہم نہ بوجھے اپنے بال و پر کی قدر

دل ہیں کہ کر چلا تھا اپنے جلنے کی خبر
پھر نہ دی آ کر کسی نے اُس دوانے کی خبر

بلبلیں بہم چلی جاتی ہیں باغوں کی طرف
کچھ تو اُڑتی سی سنی ہی گل کے آنے کی خبر

سچ کہو اے بلبلو کس باغ سے آتی ہو تم
کچھ بھی ہی تم کو ہمارے آشیانے کی خبر

آج اِس لطف کی دیکھی ہی میں بیداد کہ بس
سر پہ آیا مرے اِس طور سے جلاد کہ بس

کچھ پر و بال میں طاقت نہ رہی تب چھوٹے
ہم ہوئے ایسے برے وقت میں آزاد کہ بس

تو نہ تھا حیف یقیں ورنہ دوانا ہوتا
آج اِس طرح کا دیکھا ہی پری زاد کہ بس

سحر کی ڈوری جو سنتے تھے سو یہ دیکھی یقیں
دل کھنچا جاتا ہی اُس زلف پریشاں کی طرف

ناصح سے غم نے مجھ کو کیا شرمسار حیف
سو بار پھٹ چکا یہ گریباں ہزار حیف

جاتی نہیں وہ بے مزگی ہجر کی یقیں
کچھ وصل کے نشے نے نہ کھویا خمار حیف

جلتے بلتوں سے نہ مل اِن تیلیا کپڑوں کے ساتھ
جی دھڑکتا ہی مبادا لگ اُٹھے دامن کو آگ

چمن میں مجھ سے دیوانے کے لے جانے کا حاصل
دکھا کر گل جنوں کو شور پر لانے کا کیا حاصل

جنھیں بابوں کی پھانسی دی سو وہ ہرگز نہیں جیتے
جو زلفوں میں پھنسا دل اُس کے غم کھانے کا حاصل

ن دوبارہ زندگی کرنا مصیبت اِس کو کہتے ہیں
پھر اُٹھنا بے دماغوں کا قیامت اِس کو کہتے ہیں

ہوئی جا یا رہ شیریں کوہ کن کے بعد خسرو کی
وہ گیا تھا زخم تیشے کا جراحت اس کو کہتے ہیں

یقیں مارا گیا جرم محبت پر زہے طالع
شہادت اس کو کہتے ہیں سعادت اس کو کہتے ہیں

کوئی دن چلنے پھرنے دیں عبث زنجیر کرتے ہیں
دوانا مجھ سا کب جیتا ہے کیوں تم دیر کرتے ہیں

اس طرح صیاد کب آزاد کرتا ہے تمھیں
بلبلو دھوم مچالو یہ گلستاں پھر کہاں

نم کرتا ہے کوئی یار رو اس وقت میں تدبیریں
مرتا ہے یہ دیوانہ اب کھول دو زنجیریں

ن نہ گزرا ہوگا کوئی مجھ سا رنگیں بانکے پن میں
گریباں آپڑا ہے پھٹ کے گل کی طرح دامن میں

یقیں سے جلتے بلتے کی خبر کیا پوچھ کر لوگے
پڑا ہوگا دوانا باؤلا سا کوئی گلخن میں

شکوہ جفا کا یار سے کرنا بھلا نہیں
بندوں کو اعتراض خدا پر روا نہیں

نم جب دیکھتا ہوں تنہا تجھ کو کسی چمن میں
کس کس طرح کی باتیں آتی ہیں میرے من میں

نم مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ دل کو
کیا عیش کر گیا ہے ظالم دوانے پن میں

ہم تو حاضر ہیں عشقِ یار کہاں
خار و خس جمع ہے شرار کہاں

باغباں در نہ بند کر آخر
ہم کہاں تو کہاں بہار کہاں

م اسیرانِ چمن کی نامرادی پر نظر کیجو
بہار آئے تو اے صیاد مت ہم کو خبر کیجو

م منہ اپنا نہ دیکھ آکر ہو جائے گا دیوانہ
آئینے کو کہتے ہیں اے شوخ پری خانہ

کچھ عمر نہیں باقی ساقی تو شتاب آجا
ڈرتا ہوں چھلک جائے لبریز ہے پیمانہ

ن خواب میں کس طرح دیکھوں تجھ کو بے خوابی کے ساتھ
جمع آسایش کہاں ہوتی ہے بے تابی کے ساتھ

ن مفت نہیں لیتے وفا کو شہر خوباں میں یقیں
کس قدر بے قدر ہے یہ جنس نایابی کے ساتھ

گئے سب بھول شکوے دیکھ روئے یار کیا کہیے
زباں حیرت سے اپنی ہو گئی بے کار کیا کہیے

یقیں کے واقعے کی سن خبر وہ بدگماں بولا
یہ دیوانہ کچھ اتنا تو نہ تھا بیمار کیا کہیے

ن زنجیر میں بالوں کی پھنس جانے کو کیا کہیے
کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیے

دل چھوڑ گیا مجھ کو دل بر سے توقع کیا
اپنے نے کیا یہ کچھ بیگانے کو کیا کہیے

اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے / نرا بُرا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے

اِس اشک و آہ سے سودا بگڑ نہ جائے کہیں / یہ دل کچھ آب رسیدہ ہے کچھ جلا بھی ہے

یہ آرزو ہے کہ اُس بے وفا سے یوں پوچھوں / کہ میرے بے مزہ رکھنے میں کچھ مزہ بھی ہے

خبر کیا پوچھے مرغ چمن سے آشیانے کی / اسیروں کو توقّع کب ہے پھر گلشن میں جانے کی

گئے پکڑے شروع گل میں اور پروازِ اُڑا دل میں / نہ دی فرصت زمانے نے ہمیں دھومیں مچانے کی

یہ لذّت جس نے اپنے یار سے پائی ہو سو جانے / نشے میں گالیاں کھانے کی اور پیالے پلانے کی

مفت کب آزاد کرتی ہے گرفتاری مجھے / جی ہی آخر لے کے چھوڑے گی یہ بیماری مجھے

میں جو بِن غم خوار ہرگز رہ نہ سکتا تھا کبھی / اِن دنوں کرنی پڑی ہے دل کی غم خواری مجھے

رفیقانِ موافق ساتھ زنداں بھی گلستاں ہے / ہوا ہے دام ہم کو آشیاں آپس کی الفت سے

عبث پالی تھی سینے بیچ آہِ بے اثر ہم نے / یہ کیوں اِس خاک میں بویا تھا نخلِ بے ثمر ہم نے

نہ روئے ہجر میں پر وصل کے دن بہ چلے آنسو / اِسی دن کے لیے رکھّے تھے گویا یہ گہر ہم نے

گئی یہ کہہ کے آنے سے خزاں کے پیشتر بلبل / پھر اِن آنکھوں سے کیوں کر دیکھ سکیے گا چمن خالی

خوش آئی ہے مجھے یہ بات ٹک مجنونِ عریاں سے / سیا کیجے کہاں تک چاک ہم گزرے گریباں سے

جو سر پاؤں پہ دھر دیجے تو راضی ہوں بتاں ہم سے / ولیکن ہائے ہو سکتی ہے یہ جرأت کہاں ہم سے

جو چھپ کر دیکھتے گل کو تو کب صیّاد واقف تھا / ہمارے آہ و نالہ نے چھڑایا آشیاں ہم سے

یار اگر منظور ہے دنیا و عقبیٰ سے گزر / منزلِ مقصود ہے دونوں جہانوں سے پرے

جب ہوا معشوق عاشق دل ربائی کیا کرے / بندگی ہے جس نے خو کی ہو خدائی کیا کرے

وصل کی گرمی سے مجھ کو ضعف آتا ہے یقیں / دیکھیے مجھ ساتھ خوباں کی جدائی کیا کرے

معاوضے میں وفا کے جو یہ جفا ہوئے / کبھو کسی سے کوئی کیوں کے آشنا ہوئے

یہ سب تو کرتے ہیں دعوائے عشقِ یار کبھو / جو آزمانے پہ آئے تو کیا مزہ ہوئے

ٹک اک انصاف کر اتنی بھی کرتا ہے جفا کوئی / کرے گا بعد میرے کس توقّع پر وفا کوئی

گزرتا وصل سے گر ہجر میں دیکھے رضا اُس کی
محبّت میں یقیں لیتا ہی نامِ مدّعا کوئی

حرم کو چھوڑ دل بے طرح بت خانے پہ چلتا ہی
توقّع یار رہنے کی نہیں اِس کو خدا رکھّے

خدا ب مجھے ترے داغوں سے لالہ زار کرے
یہ خارِ خشک مگر آگ سے بہار کرے

قیامت آپ پر اُس قد سے لا چکے ہم تو
کہاں تلک کوئی محشر کا انتظار کرے

متاخّرین

(۳۰۴) **یاس**: از خوبانِ جہاں و از موزونانِ زماں، خانِ عالی شاں، حسن علی خاں، ولدِ زین العابدین خاں، نبیرۂ نوّاب اسلام خاں، بن عقیدت خاں، ابنِ نوّاب امیر خاں، کلاں، نعمت الٰہی۔ جوانے ست بسیار خلیق، و باغربا شفیق، قدر دان و قدر شناس، المتخلص بہ یاس۔ اکثر مشورۂ سخن با میاں حسرت دارد۔ ہنوز نومشق ست، اگر طبیعتش بہ این فن راغب شود، خوب خواہد گفت۔ دریں ولا مائلِ خواندنِ عربی ست۔ خوشا بہ حالش کہ عمرِ عزیزِ خود را بدیں نحو صرف نماید۔ از متوسّلانِ قریبۂ نوّاب عالیہ است۔ ایں چند اشعار بہ طریقِ یادگار بہ قلم می آید۔ از وست۔ دام اقبالہٗ:

عشق نے تیرے تجھے خلق میں تشہیر کیا
میری الفت نے ترے دل میں تاثیر کیا

جی تلک دے کے خفا یہ تو نہ ہوتا ہرگز
تو نے کیا جانیے کیوں یاس کو دل گیر کیا

تو آپ ہی سن رہے گا ہجر میں جو کچھ گزرا
خدا وہ روز نہ لائے تری جدائی کا

کسی کو ہجر میں رونا کسی کو وصل میں عیش
میں کیا کہوں ہے تماشا عجب خدائی کا

بتوں کو سجدہ کیا جا کے دیر میں آخر
بہت ہی یاس کو دعویٰ تھا پارسائی کا

شیریں نے پائی کب یہ حلاوت سخن کے بیچ
جو بات لطف دیتی ہے اُس کے سخن کے بیچ

ہوتا ہے جا غریب کوئی اور شہر میں
آوارہ میں تو پھرتا ہوں اپنے وطن کے بیچ

وصل ہو تجھ سے بتا ای یارِ جانی کس طرح
اور نہ ہوئے وصل تو ہو زندگانی کس طرح

نام لیتے اُڑ گئے پیغام بر تیرے حواس
جا کہے گا اُس سے پیغامِ زبانی کس طرح

مجھ کو یقین ہو گیا تیرا وہ دل رہا نہیں
اتنا نہ ناز کر صنم بندے کا کیا خدا نہیں

اوروں کے حال پر کرم مجھ پہ بجز جفا نہیں
یوہیں رضا گر آپ کی بندے کا کیا خدا نہیں

میں نے کہا کہ میرے ماہ ٹک تو اِدھر تو کر نگاہ
کہنے لگا تو کون ہی تجھ سے میں آشنا نہیں

منظور قتل ہی تو تجھے کیا درنگ ہی
یہ میں، یہ تو، یہ تیغ، یہ تیر و تفنگ ہی

وہ دن گئے کہ جان و دل آپس میں تھے خوشی
اب یہ خفا ہی اُس سے یہ اُس سے بہ تنگ ہی

بولی ٹھٹولی غیر سے ہم کو سنا سنا
ظالم بھلا ستانے کا یہ کوئی ڈھنگ ہی

لطف و کرم سے پاس بلانا تو اک طرف
احوال پوچھنے سے مرے اُس کو ننگ ہی

دیکھیں فلک وہ دور دکھائے گا یا نہیں
اِس دل میں وصلِ یار کی کیا کیا اُمنگ ہی

چھوٹے وہ درد و غم سے جو جی سے گزر گئے
تیری شبِ فراق میں ہم کیوں نہ مر گئے

گو جی گیا پہ دیکھ لیا تجھ کو اک نگاہ
منظور تھا جو اپنے تئیں کام کر گئے

ہرگز نہ کام نکلا کچھ دیر اور حرم سے
آخر ہمارا مقصد حاصل ہوا تو ہم سے

گلِ نرگس میں بھیجوں ہوں یعنی
چشم تیرے ہی انتظار میں ہی

عاشق جو ترے گھر سے جانا نہ نکل جائے

. . . .

اِس دل سے مجھے کیا کیا ای یاس توقع تھی
جاتا ہی رہا جیسے بیگانہ نکل جائے

خاتمہ

الحمد للہ والمنة کہ این تذکرہ من تالیفِ فقیرِ حقیر، پروردۂ آغوشِ رنج و محن، میر حسن در تاریخِ یک ہزار و یک صد و نود و یک ہجری بہ اتمام رسید۔ پوشیدہ نہ ماند کہ احاطہ نمودنِ کلامِ جمیع شعرا از قبیلِ دریا بہ کوزہ کردن ست، چرا کہ ہیچ جائے نیست کہ درو صاحب سخنے نہ خواہد بود۔ پس، این بے استعداد را چہ یارا کہ از ملک بہ ملک یا از شہر بہ شہر احوالِ ہر کسے را تفتیش نماید، و اشعارِ ہر صاحب سخن را درج کند، مگر احوالِ بعضے اشخاص کہ شنیدہ شد، یا در تذکرہ ہائے متقدمین دیدہ شد، یا خود ملاقات نمودہ شد، پارۂ دریں جا ثبت نمود۔ اگر مذکورِ کسے بہ سببِ ناواقفیت نیامدہ باشد، معذور باید داشت۔ بعد ازیں ہر سخن سنجے کہ خواہد بود، احوالِ معاصرینِ خود ماسوائے این تذکرہ خواہد نوشت۔ چناں چہ ہمیں طور نوشتہ آمدہ اند، و خواہند نوشت۔ بہ قولِ عمر خیام، رباعی:

ہر نقشِ قدم بہ افسرے می گوید
ہر کہنہ خرابہ بادرے می گوید
دنیاست فسانہ پارۂ ما گفتیم
واں پارہ کہ ماندہ دیگرے می گوید

بجلی کے کرشمے

یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خاں صاحب (نواب معشوق یار جنگ بہادر) نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعے کے بعد لکھی ہے۔ برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہے اور سہل زبان میں لکھی گئی ہے۔ طبع ثانی حجم ۱۲۷ صفحے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (بلا جلد) مجلد عہ

رسالۂ علم نباتات

اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے، علمی اصطلاحات سے معرّا، طلبائے نباتیات جس مسئلے کو انگریزی میں نہ سمجھ سکیں وہ اس رسالہ میں مطالعہ کریں۔ طبع ثانی۔ حجم ۱۰۰ صفحے۔ قیمت مجلّد ایک روپیہ چار آنے، بلا جلد ایک روپیہ۔

طبقات الارض

اس فن کی پہلی کتاب ہے۔ تین سو صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قلم بند کیے ہیں۔ کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور ان کے مرادفات کی فہرست بھی منسلک ہے۔ قیمت بلا جلد ایک روپیہ آٹھ آنے، مجلّد دو رپے۔

ہماری نفسیات

E. A. Mander کی کتاب Psychology for Every Man and Woman کا ترجمہ ہے۔ اس میں نفسیات کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ زبان نہایت سلیس اور شستہ ہے۔ قیمت مجلّد ایک روپیہ چار آنے، بلا جلد ایک روپیہ۔

اقبال

انجمن کے رسالہ اُردو کا اکتوبر ۱۹۳۸ء نمبر ڈاکٹر سر اقبال مرحوم کے حالات و کلام پر تبصرے کے لیے وقف کردیا گیا تھا۔ اُردو کا یہ اقبال نمبر اپنے مضامین کی نوعیت اور مضمون نگار حضرات کی قابلیت و واقفیت کی بدولت اقبال کی زندگی، شاعری اور فلسفہ پر ایک مکمل کتاب ہے۔ تقطیع $\frac{22 \times 18}{8}$ حجم ۳۷۶ صفحے، قیمت مجلّد دو رپے آٹھ آنے، بلا جلد دو رپے۔

اضافیت

یہ کتاب ڈاکٹر محمد رضی الدین صدّیقی صاحب پروفیسر ریاضیات جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد دکن کی تصنیف ہی۔ اس میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے آئن شٹائن کے نظریۂ اضافیت کو عام فہم زبان میں بیان کیا ہی۔ اس نظریہ کے متعلق یہ کہا جاتا ہی کہ اس کے سمجھنے والے دنیا میں صرف درجن بھر ہیں۔ اس کی تشریح ایسی زبان میں کی ہی کہ معمولی ریاضی جاننے والا آسانی سے سمجھ سکتا ہی۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ تصنیف اُردو ادب میں بیش بہا اضافہ ہی۔ قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے ، بلا جلد بارہ آنے۔

معمارِ اعظم

یہ یورپ کے بلند پایہ ڈراما نگار آبسن کے نہایت ممتاز ڈرامے "ماسٹر بلڈر" کا ترجمہ ہی جس میں مصنّف نے نفسیاتی نکات کے بیان کرنے میں بڑا کمال دکھایا ہی اور بقول پروفیسر فرانس بُل "جہاں تک بُنیادی امور، اس کے مقصد اور بنی نوعِ انسان کے متعلق اس کے تصوّر کا تعلق ہی یہ ڈراما وقت اور مقام کی قیود سے آزاد ہی اور دنیا کے دوُر دراز حصّے میں جہاں انسان بستے ہیں یہ سب کی سمجھ میں آسکتا ہی"، عزیز احمد صاحب بی۔ اے آنرز (لندن) نے ایسی خوبی سے ترجمہ کیا ہی کہ اصل کا لُطف آجاتا ہی۔ قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے ، بلا جلد بارہ آنے۔

رُوسی ادب

رُوسی ادب دُنیا کی ادبیات میں ایک نہایت ممتاز درجہ رکھتا ہی جس طرح ایک زمانے میں فرانس کا ادب سارے یورپ پر چھا گیا تھا اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ رُوسی ادب نے نہ صرف یورپ بلکہ تمام ایشیائی ممالک میں ایک ادبی انقلاب بپا کردیا۔ رُوسی ادب کی تاریخ کا مطالعہ انسانی نفس اور انسانی جدوجہد کا مطالعہ ہی۔ پروفیسر محمد مجیب نے جو رُوسی زبان سے بھی واقف ہیں ، یہ کتاب بڑی محنت اور تحقیق سے بہت صاف اور شُستہ زبان میں لکھی ہی۔ ہر ہندوستانی کو اس کا مطالعہ لازم ہی۔

قیمت حصّۂ اوّل مجلّد دو رُپے آٹھ آنے ، بلا جلد دو رُپے۔

حصّۂ دوم مجلّد دو رُپے آٹھ آنے ، بلا جلد دو رُپے۔

انجمن ترقّیِ اُردو (ہند) دہلی